Mesi

ہندوستان کا مستقبل

از

ڈاکٹر راجیندر پرشاد

(سابق صدر، انڈین نیشنل کانگریس)

حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

(کتبہ سید احمد علی ۱۹۴۶ء)

خواجہ فراست حسین کے آگرہ اخبار پریس میں
طبع کراکر شائع کی۔

تعداد طباعت ۲۰۰۰

بار اوّل یکم جون ۱۹۴۶ء

قیمت تین روپیہ آٹھ آنے (عہ۳)

مظہرالحق

اُس مردِ مومن، پکّے قوم پرست اور سچّے محبِ وطن
کی مقدس یاد کے نام
جس نے خدمت وایثار کو عیش اور راحت پر، غُربت کو ثروت
پر، جیل کو محل پر اور "صداقت آشرم" کو "سکندر منزل" پر
ترجیح دی۔

راجیندر پرشاد

دیباچہ

جب سے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ہندستان کی تقسیم (ہندو اور مسلم منطقوں میں) کے حق میں تجویز منظور کی، اُس وقت سے اس مسئلے کو اہمیت حاصل ہوگئی ہی۔ اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہی اور موضوع پر مواد کا اچھا ذخیرہ مجتمع ہی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اب بھی ایک اور کتاب کی گنجائش ہی جو اس مسئلے پر تمام پہلوؤں سے بحث کرے۔ "پاکستان" میں میں نے کوشش کی ہی کہ اس کے متعلق وہ تمام معلومات اور مواد جمع کر دوں جو پڑھنے والے کے لئے اپنی ذاتی رائے قائم کرنے میں ممد ثابت ہو سکے۔ اس مواد کی بنیاد پر میں نے اپنی رائے بھی قائم کی ہی، مگر مجھے یقین ہی کہ میں نے اس مواد کو اپنی ذاتی رائے سے بالکل علیحدہ رکھا ہی اور پڑھنے والے کو بالکل آزادی ہی کہ وہ میرے نتائج کو نظر انداز کردے اور ممکن ہو تو خود نتائج اخذ کرے۔

کتاب چھ حصوں میں منقسم ہی۔ حصہ اول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو اقوام ہونے کے نظریے پر بحث کی گئی ہی۔ اس نظریے کو نہ صرف یہ کہ نمایندہ اور ممتاز مسلمانوں

کی حمایت حاصل نہیں ہے، بلکہ تاریخ اور روزانہ کی زندگی کے حقائق بھی اس کی تائید نہیں کرتے۔ اس حصے میں اس کے علاوہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، جب بھی، دوسرے ممالک کے تجربے اور اس موضوع پر بین الاقوامی شہرت کے حاصل اور مستند مصنفین کے نظریات کی روشنی میں، ہندستان کے ہندو مسلم مسئلے کا حل اگر تلاش کیا جاسکتا ہے تو ایک متحد الاقوام ریاست کی تشکیل میں جس میں ایک مضبوط سیاسی اتحاد مختلف صوبائی گروہوں کی تمدنی آزادی کی ضمانت کرتا ہو۔ نہ کہ مختلف اقوام کی متعدد ریاستوں کے قیام میں جس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوگا کہ قومی اقلیتوں کا مسئلہ جوں کا توں پڑا رہ جائے گا بلکہ حل ہونے والے مسائل سے زیادہ دوسری بہت سی مشکلات جو ان ریاستوں کے مالی، معاشی، صنعتی اور سیاسی اور دفاعی اور حربی مسائل سے متعلق ہوں گی پیدا ہوجائیں گی۔

دوسرے حصے میں اس بات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کس طرح اٹھا اور اس موجودہ نوبت تک پہنچا اور کس طرح فرقہ پرستی کے مثلث کے قاعدے کے طویل ہونے سے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف کا زاویہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

تیسرے حصے میں تقسیم کی اُن متعدد اسکیموں کا خلاصہ دیا گیا ہے جو اس باب میں ترتیب دی گئی ہیں۔

چوتھے حصے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن کے ابہام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ دشواری بیان کی گئی ہے جو اس ریزولیوشن پر اس کی اہمیت کے اعتبار سے غور کرتے وقت پیش آتی ہے۔ ریزولیوشن کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے الفاظ کی روشنی

میں اس کا مفہوم بیان کرنے کے بعد پاکستان کی سرحدوں کا تعین کیا گیا ہے۔
پانچواں حصہ مسلم ریاستوں کے ذرائع آمدنی سے بحث کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ تقسیم کی اسکیم کس قدر ناقابلِ عمل ہے۔
چھٹا حصہ اُن تجاویز پر مشتمل ہے جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔
حصہ اوّل، سوم، چہارم، پنجم اور ششم بانکی پور جیل میں لکھے گئے تھے اور اُن اوقات جب میری صحت نسبتاً بہتر تھی۔ یہ حصے ظاہر ہے ایک ایسے کام کے آثار کے حامل ہو گئے جو چند رکاوٹوں کی حالت میں کیا گیا ہو۔ رہائی کے بعد مجھے اس قدر وقت تو ملا کہ حصہ دوم مکمل ہو گیا مگر جو حصہ پہلے لکھا جا چکا تھا، اُسے دہرانے کی فرصت نہ مل سکی۔ اسیری کی حالت میں کتابوں کے حصول کی دشواری ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سر راجیوارنجن پرشاد سنہا کی عنایات سے بہت کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے سنہا لائبریری سے بغیر روک ٹوک کتابیں مستعار لینے کی اجازت دے دی تھی اور سر راجیوارنجن پرشاد سنہا، بہار لیجسلیٹو کونسل کے پریذیڈنٹ نے بہار لیجسلیچر کے کتب خانے سے چند کتابیں مستعار عنایت فرمائیں۔ بمبئی کے شری شانتی کمار مرارجی نے چند کتابیں اور کچھ اعداد و شمار عنایت فرمائے۔ میں ان سب حضرات کا ممنونِ کرم ہوں۔
میں بمبئی کے شری کے۔ ٹی شاہ، اور برلا کالج پلانی کے پروفیسر بال کرشن کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے چند نہایت قیمتی مشوروں سے نوازا اور برلا کالج کا کہ اس نے اپنے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت دی۔ جو حصے جیل میں لکھے

گئے تھے، ان کی ٹائپ شدہ کاپی بھی جیل ہی میں ہوئی تھی۔ میں جمشید پور کے ٹاٹا ورکرز یونین کے سکریٹری شری ایم۔ جاہم کا شکر گذار ہوں کہ موصوف نے مسودے کو ٹائپ کیا اور ایس۔ ایچ۔ رضی، ایم۔ ڈی۔ مدان، اور ایم۔ کے۔ گھوش صاحبان کا بھی جنھوں نے ٹائپ شدہ نقل کو اصل سے ملایا۔ میں حکومتِ بہار کا احسانمند ہوں کہ اس نے شری جاہم کو ٹائپ کرنے کی اجازت دی۔ ٹاٹا ریسرچ لیبارٹری جمشید پور کے شری ایم۔ کے۔ گھوش نے ازراہِ عنایت اعداد کو جانچا اور گراف اور اشکال تیار کئے میں اُن کا بہت احسان مند ہوں۔ شری متھرا پرشاد اور شری چکردھر شرما کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حصّہ دوم کی تیاری میں ہر طرح سے میری مدد کی اور کتاب کی طباعت کا اہتمام کیا۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے ڈاکٹر سعید صاحب بریلوی کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے حالی پبلشنگ ہاؤس کی درخواست پر باوجود اپنی مصروفیت اور علالت کے بڑی محنت سے اُردو ترجمہ کیا۔

کتاب میں میں نے جہاں جہاں بیانات نقل کئے ہیں یا کسی چیز کا حوالہ دیا ہی، اس کے لئے وہیں اپنی ممنونیت کا اظہار کر دیا ہی۔

صداقت آشرم
دِگا گھاٹ۔ پٹنہ
۱۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء

راجیندر پرشاد

فہرست مضامین

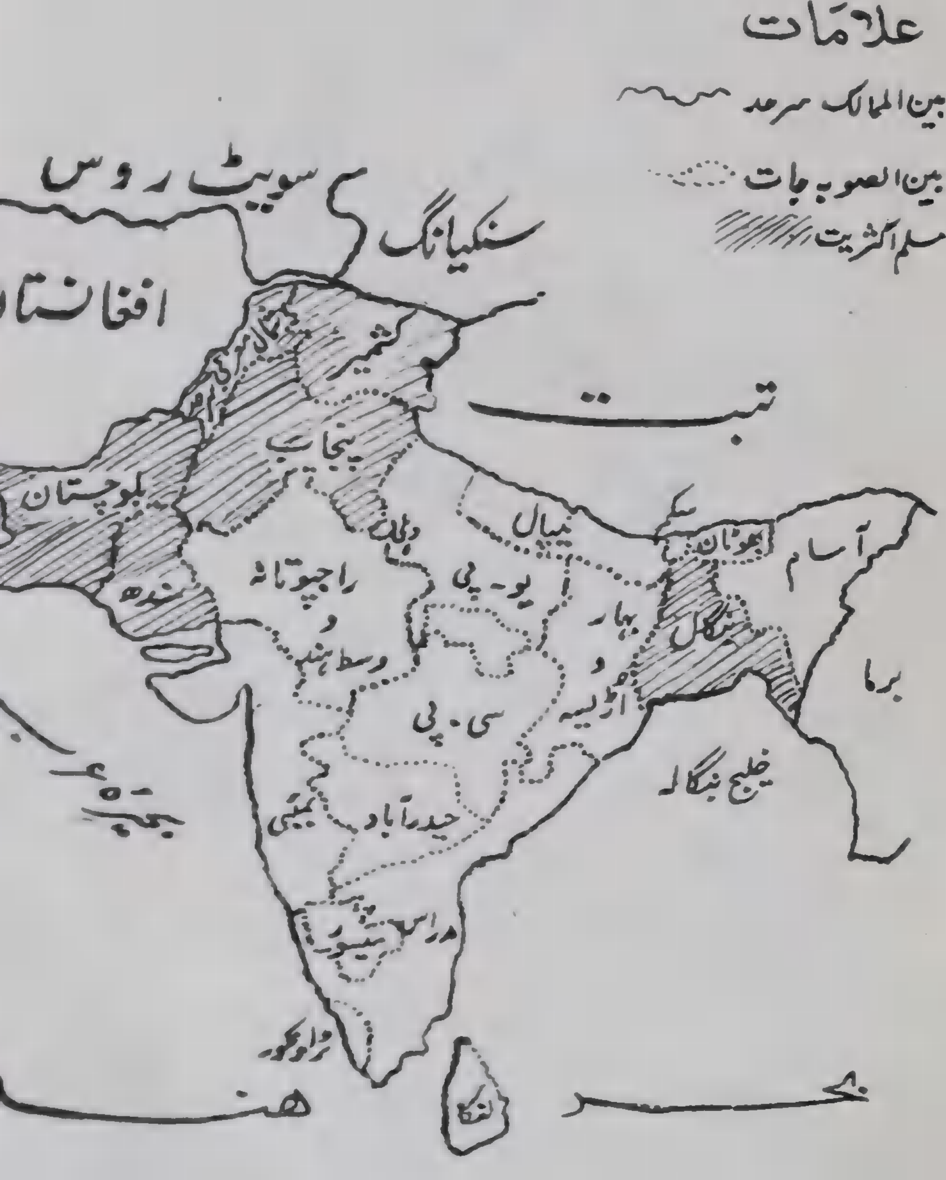
حصہ اوّل

دو جُداگانہ قوموں کی تجویز

حِصّہ دوم

فرقہ وارانہ مثلث

ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے



حصّہ اوّل

دو جُداگانہ قوموں کی تجویز

باب (۱)

پاکستان کی بُنیاد، دو جُدا گانہ قومیں

ہندستان کو مسلم اور غیر مسلم دو جدا گانہ علاقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز جس میں سے ہر علاقے کو ایک خود مختار حکمراں ریاست بنا دیا جائے۔ اس نظریئے پر مبنی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو جُدا جُدا قومیں ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں کہ جہاں ہندستان کو اس طرح تقسیم کر دینے کی تجویز پاس ہوئی تھی اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ لفظ قوم "کی تشریح و تعریف خواہ کسی طریقہ پر بھی کی جائے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انھیں اپنا علیحدہ وطن، اپنا علیحدہ علاقہ، اور اپنی جدا گانہ ریاست ملنی چاہیئے۔ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو مذہب کی حقیقی ماہیت کے سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں۔[1]

---

[1] ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح (Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah) صفحہ ۱۵۵ -

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بالکل صحیح معنوں میں "دو مذہب نہیں ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے تمدن ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہیں اور یہ امید کہ وہ کبھی مل کر ایک قوم بن جائیں گے ایک خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اور ہندستان کی ایک قوم کی یہی غلط فہمی حد سے زیادہ متجاوز ہو چکی ہے اور ہماری نت نئی مصیبتوں کا باعث بن گئی ہے۔ اگر ہم جلد اپنے ان خیالات و توہمات کی اصلاح نہ کریں گے تو ہندستان کی بربادی رونما ہونا لازمی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ جدا، سماجی رسم اور رواج جدا، اور زبان و ادب جداگانہ ہے۔ نہ وہ آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور نہ باہم مل کر کھاتے پیتے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی الگ الگ دو تہذیبیں ہیں کہ جن کی بنیاد متضاد خیالات اور معتقدات پر رہی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو تاریخ کے دو مختلف ذرائع سے محرکات بہم پہنچتے ہیں۔ ان کے تاریخی کارنامے مختلف ہیں، ان کے نام آور ان جنگ مختلف ہیں، اور ان کے کارنامے مختلف ہیں۔ ایسی مثالیں بھی بہ کثرت ہیں کہ ایک فرقہ کا عزیز نام آور دوسرے فرقے کے نام آور کا دشمن ہے اور اسی طرح پر ان کی فتوحات اور ان کی شکستیں بھی باہم اوپر تلے ہوتی رہی ہیں۔ ایسی دو قوموں کو ایک واحد حکومت کے جوئے میں جوت دینا جن میں سے ایک بہ لحاظ تعداد اقلیت میں اور دوسری اکثریت میں بالضرور روز افزوں بے اطمینانی اور بے چینی کا موجب اور بالآخر ہر ایسے نظام کی تباہی کا باعث ہوگا کہ جو ایسی ریاست کی حکومت کے لئے بنایا جائے۔"[۱]

"اے (A) پنجابی" صاحب نے بھی کہ جنھوں نے کان فیڈریسی آف انڈیا (Confederacy of India) نامی ایک کتاب لکھی ہے اپنے دعوے کی بنیاد

---

[۱] ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح *Recent Speeches and Writing of Mr. Jinnah* صفحہ ۱۵۲۔

اسی نظریہ پر رکھی ہے۔" اپنے پیشتر کے مباحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل مختلف دو جماعتیں ہیں۔ ان کی تہذیبیں بیّن طور پر جُدا جُدا ہیں اور اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ایک تہذیب نے دوسری تہذیب پر کچھ اثر ڈالا ہو لیکن ان کے لئے یہ کبھی ممکن نہیں کہ ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ ان کی عادتیں اور رواج، تمدنی رسوم، اخلاقی وظائف، مذہبی، سیاسی اور تہذیبی تخیلات، روایات، زبانیں، ادب فنونِ لطیفہ، اور ان کا نصب العین زندگی بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ مخاصمانہ ہیں۔ دونوں قوموں کی زندگیوں کی یہ بے میل ضروریات ایسے عناصر نہیں ہیں کہ جن سے دو قومیں مل کر ایک بن سکیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف بے اعتباری اور غلط فہمی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ دونوں فرقوں کے درمیان جو بنیادی فرق ہیں وہ اپنے اپنے ماضی کی یاد، زمانۂ حال کی رقابتیں، اور ایک دوسرے کو جو گزند گذشتہ ایک ہزار سال میں پہنچائے ہیں دونوں قوموں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا کر دیتے ہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان دونوں کے درمیان اگر کوئی چیز مشترکہ ہے تو وہ ایک اجنبی حکومت کا جُوا ہے جو دونوں کی گردنوں پر رکھا ہوا ہے۔ جونہی وہ رشتہ کہ جو دونوں کو ایک ایسی حکومت کے جوئے تلے جوڑے ہوئے ہے ٹوٹے گی تو فوراً ہی وہ الگ الگ ہو جائیں گے اور ان کے باہمی اختلافات جو کہ آج اتنی شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہو رہے ہیں اچھی طرح بھڑک اٹھیں گے۔"[لہ]

علی گڈھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور محمد افضال حسین قادری صاحبان نے بھی جنھوں نے ایک رسالہ تقسیم ہند کی تجاویز کے متعلق شائع کیا ہے، " اے (A) پنجابی صاحب

لہ "اے پنجابی" کی کتاب کنفیڈریسی آف انڈیا *Confederacy of India*

صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ -

سے کچھ کم اس چیز پر زور نہیں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس (یعنی حکومت ہند کے ۱۹۳۵ء کے قانون) کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ اس ناقابل انکار حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندستان کے مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ایک قوم ہیں، اور زندگی کے نصب العین اور آرزوؤں میں موخرالذکر سے حقیقی اختلاف رکھتے ہیں اور کسی طرح بھی کسی دوسری قوم میں خواہ وہ ہندو ہو یا غیر ہندو مدغم اور رجذب نہیں ہو سکتے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہم ہندستانی مسلمانوں کو پوری کوشش کے ساتھ لگاتار اس بات پر اصرار کرنا چاہیئے کہ منجملہ اور باتوں کے ہندستان کے مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں ان کا اپنا ایک الگ قومی وجود ہے جو کہ ہندوؤں اور دیگر غیر ہندو جماعتوں سے بالکل مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوؤں سے اس سے بھی زیادہ مختلف ہیں جتنا کہ سوڈیٹن، جرمن، زیکو سلاواکیہ والوں سے مختلف تھے۔"[۱]

الحمزہ صاحب نے بھی ایک کتاب "پاکستان —— اے نیشن" اس غرض سے لکھی ہے کہ اولاً تو یہ ظاہر کریں کہ ہندستان ایک ملک نہیں بلکہ اس میں متعدد ممالک ہیں جن میں ہر ایک ملک کے انسانوں کا ماحول دوسرے ملک سے بالکل مختلف ہے اور دوسرے یہ کہ نسل اور تہذیب میں ہندستان کے باشندے باہم اس قدر مختلف ہیں کہ انھیں (لفظ قوم کے زمانۂ حال کے سیاسی معنوں میں) ایک قوم نہیں خیال کیا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ انھیں کئی مختلف قوموں سے منسوب کیا جائے۔ ان اختلافات کو بیان کرنے میں وہ خوشی سے بے خود ہو کر لانے لگتے ہیں کہ "ہندو مذہب کا تعلق موسم برشگال سے ہے درحالیکہ اسلام بیاباں کی پیدائش ہے۔"[۲] پھر لکھتے ہیں "غالباً شمال مغربی گوشے کی احدیت کسی اور ایک چیز سے اس قدر ادراتے عجیب

---

[۱] الحمزہ کی کتاب ("پاکستان - اے نیشن" .Pakistan A Nation) صفحہ ،
[۲] الحمزہ کی کتاب (" " " " ") صفحہ ۲۵

طریقے سے نہیں ظاہر ہوتی جتنی کہ ہندستان پر اونٹ کی تقسیم سے[1]۔ اونٹ کے ساتھ ہمارے روابط مختلف زاویہ ہائے خیال یعنی جغرافیائی، تاریخی، اور فلسفیانہ وغیرہ میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی روشنی میں ارتقائے تہذیب کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا جا سکتا ہے۔ اونٹ کو دنیا کی تاریخ میں اس انقلاب کی علامت خاص سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جو جنوب مغربی ایشیا سے دفعۃً نسلی حوصلہ مندی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اپنی رو میں تمام معلومہ دنیا کو بہالے گیا۔ ہم کئی صدیوں بعد کے زمانے میں عربوں کی درخشاں عظمت کے پرچموں کو دوری کی وجہ سے دھندلی شان کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، اور درمیان کی ان تمام صدیوں میں فاتحین کے قافلے اونٹوں کی پیٹھ پر سوار نظر آتے ہیں جن کے پس منظر میں بادسموم کے جولانگاہ ریگستان ہیں۔ عربوں کے عروج کا زمانہ گذر گیا لیکن اونٹ اب بھی ایک ایسی دنیا میں جو اپنی بیابانی وسعت کے لئے اور اپنے باشندوں کے مذہب اور تہذیب کی یکسانیت کے لحاظ کر اپنی نظیر آپ ہے انسانوں کا ساتھی اور رفیق ہے۔ اونٹ کا وطن آج بھی خنجروں اور طنبوروں اور مسجدوں اور موذنوں اور برجوں اور میناروں کا ملک ہے[2]۔" افسوس یہ ہے کہ صاحب کتاب کو اپنی اس دلیل کی ناموزونی نظر نہیں آتی جس کی بنیاد اونٹ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں پر ہے کہ وہ اس بنا پر شمال مغربی حصۂ ہند کو بقیہ ہندستان سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں درحالیکہ وہ اونٹوں کی موجودگی کی وجہ سے عرب کے ساتھ اس سے کچھ زیادہ مشابہت نہیں رکھتا جتنی کہ اسے راجپوتانے سے ہے، جس میں نہ خنجر اور طنبورے ہیں نہ مسجدیں اور موذن اور نہ برج اور مینارے۔ ظاہر ہے کہ اگر علیحدگی کے لئے اس دلیل کو کافی مان لیا جائے تو پھر اس مشرقی حصۂ ہند (بنگال) کی علیحدگی کے لئے کیا دلیل پیش کی جائے گی کہ

---

[1] الحمزہ کی کتاب ("پاکستان - اے نیشن") صفحہ - PAKISTAN A NATIONL

[2] الحمزہ صفحہ ۲۷

جس میں گرم ممالک کے سے پھل پھول بھی ہیں۔ سبز و شاداب کھیتیاں بھی ہیں اور طویل اور خوفناک برسائیں بھی۔ اور پھر کسی مسلمان کا وجود دوسری گرم جگہوں پر جیسے ملایا کا جزیرہ نما ہی کس طرح جائز ہو سکتا ہی۔

طبعی جغرافیائی اختلافات کی بنا پر شمال مغربی پاکستان کی علیحدگی کی جو دلیل پیش کی گئی ہی اس کی کمزوری مسٹر ایف۔ کے۔ خان درانی کی نظروں سے نہ بچ سکی چنانچہ اپنی کتاب "دی مِیننگ آف پاکستان" میں انھوں نے اعتراف کیا ہی کہ "تمام مسلمان خواہ وہ پاکستان میں رہتے ہوں یا ہندستان میں ایک قوم ہیں اور ہم ساکنانِ پاکستان اپنے ہم مذہبوں کو ہمیشہ اپنا خون سمجھیں گے[1]۔"

الحمزہ صاحب کی دلیل کا ذکر کر کے مسٹر درانی لکھتے ہیں کہ "کتاب "پاکستان اے نیشن" کے مصنف نے اپنی تمام دلیل کی بنیاد ان جغرافیائی خصوصیات پر رکھی ہی جو شمال مغرب کے صوبوں یعنی پنجاب، کشمیر شمال مغربی سرحد سندھ اور بلوچستان کو بقیہ ہندستان سے ممتاز کرتی ہیں۔ بعض صوبوں میں دوسرے صوبوں کی بہ نسبت بارش زیادہ ہوتی ہے بعض صوبوں کی خاص غذا گیہوں ہی بعض کی چاول۔ نباتات کی ان زمینوں میں افراط ہی جہاں بارش زیادہ ہی اور جہاں بارش کم ہوتی ہے نباتات کی کمی ہی۔ صوبوں کے پھل پھول بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شمال مغربی علاقوں کی خشک زمین اونٹ کا قدرتی وطن ہے اور جنوبی علاقہ کی مرطوب زمین نیز آسام اور بنگال کی نم زمینیں بھاری بھر کم ہاتھی کے مولد اور مسکن ہیں۔ شمال مغرب کی بے آب و گیاہ زمین سے ایسی نسلیں پیدا ہوتی ہیں جو کئی لحاظ سے ان زیادہ نرم اور زیادہ سانولے رنگ کے انسانوں سے مختلف ہیں جو ہندستان کے دوسرے مقامات پر پائی جاتے ہیں۔ ایک ہندستان جیسے طویل و عریض

---

[1] درانی صفحہ ۸ (The Meaning of Pakistan p. viii)

ملک میں جہاں بھانت بھانت کے انسان آباد ہیں جو طول البلد اور عرض البلد کے کئی درجوں تک پھیلا ہوا ہے اور جن میں سمندر اور پہاڑ اور جنگل کے گوناگوں اثرات پڑتے ہیں انسانوں میں اور پیداوار میں اس قسم کے باہمی اختلافات لازمی اور بالکل قدرتی ہیں۔ اور مسلمانانِ ہند کی سیاسیات سے انھیں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنی اس دلیل کے مطابق چلیں تو ہم شمال مغربی مسلمانوں کو ہندستان کی اس بڑی مسلم آبادی سے بے تعلق ہونا پڑے گا جو پاکستان کے علاوہ دوسرے مقامات پر آباد ہے، جس کی وضع اور لباس ہم سے جداگانہ ہے اور جس کی خوراک بھی بالکل وہ نہیں ہے جو ہماری ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ اجنبیوں کا سا برتاؤ کرنا پڑے گا کہ جن کے ساتھ ہمارا زندگی اور اغراض زندگی کے متعلق کوئی اشتراک نہیں ہو سکتا اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسے کوئی پاکستانی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی نہیں مان سکتا بلکہ یہ تو ایسا مسئلہ ہوگا کہ جسے پنجاب کا ہر مسلمان ناقابلِ التفات سمجھ کر مسترد کر دے گا۔"[1]

پاکستان کے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے بعض دوسرے اہلِ قلم نے جن میں ڈاکٹر بی آر امبیدکر صاحب نمایاں اور ممتاز ہیں اپنی کتاب تھاٹس آن پاکستان" (Thoughts on Pakistan) میں مختلف تواریخ کی کتابوں کے اقتباسات جمع کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ مسلم حملہ آوروں اور مسلم بادشاہوں نے ہندستان میں کس طرح ہندوؤں کے مندروں کی توہین کی ہے اور انھیں برباد کیا ہے اور ان میں جو بُت رکھے ہوئے تھے انھیں کس طرح توڑا ہے اور مندروں کو مسجدوں کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے یا یہ کہ ان میں سے عمارتی سامان مثلاً ستون وغیرہ اس لئے نکال لئے گئے ہیں کہ دوسرے مقامات پر ان سے مسجدیں تعمیر کی جائیں۔ نیز یہ کہ انھوں نے کس طرح ہندوؤں کے سامنے قرآن اور تلوار کے دو راستے پیش کئے تھے کہ جسے

---

[1] درانی صفحہ ۱ - ۲۔

وہ جا ہیں اختیار کریں اور یہ کہ کس طرح ہزاروں ہندوؤں کو قبول اسلام سے انکار کرنے پر جسمانی ایذائیں پہنچائی گئیں اور قتل کیا گیا ہے۔ تلاش و جستجو کی اس محنت شاقہ کے بعد نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ ہندوان تمام مظالم کو نہ بھولے ہیں اور نہ بھول سکتے ہیں اور ان کے دماغوں پر یہ نقوش داغ دیئے گئے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آج کل جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر مثلاً مسجدوں کے سامنے باجا بجانے پر یا گائے کی قربانی پر ہندو مسلم فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سب بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قدیم دشمنی ہنوز جاری ہے اور دونوں فرقوں کی انگریزوں کی محکومی اور انگریزوں کی قومی حکومت بھی فریقین کے دلوں میں مصالحانہ خیالات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔

اب اس عجیب دلیل کا مطلب سمجھنے سے عقل قاصر ہے کہ ہندستان کی قطع و برید کر کے اور اس کے ایک حصے کو مسلمانوں کی حکومت میں دینا جو کہ ان سب لوگوں کا مقصد ہے کہ جو ہندستان کو ہندو علاقے اور مسلم علاقے میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔

کیا اس دلیل کے پیش کرنے سے یہ مطلب ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے مقدس مقامات کی اس قسم کی بے حرمتی اور وحشیانہ تباہ کاری کی اجازت دی ہے بے حرمتی غیر مسلموں کے جذبات کے لحاظ سے اور وحشیانہ تباہ کاری فنون لطیفہ کے نقطہ نظر سے۔ اگر اسلام نے ان چیزوں کی اجازت دی ہے اور انھیں جائز خیال کیا ہے تو کیا آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب اسلام نے وہ اجازت واپس لے لی! اور اب وہ ان نازیبا حرکات کو جائز نہیں خیال کرتا۔ آخر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اسلام کے احکام میں یہ تبدیلی ہو گئی ہے؟ اور اگر یہ تمام وحشیانہ افعال ان مخصوص لوگوں کے تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور جنھوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے

پورا کرنے کے لئے مذہب کو آڑ بنایا تھا ایسے مقاصد کہ جنھیں رسول عربی کے پیغام سے کوئی واسطہ نہ تھا تو اب کیا توقع اور کونسی امید ہو سکتی ہے کہ آئندہ اسی قسم کے لوگ اپنے حوصلوں اور اپنی آرزوؤں کو لے کر نہ اٹھیں گے اور جو قوت انھیں حاصل ہو جائے گی اسے اسی طریق پر استعمال نہ کریں گے۔ کیا ڈاکٹر امبیدکر کی تجویز کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ وہ ہندستان کے دور افتادہ گوشوں میں مسلمانوں کا راج اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان بدنصیب غیر مسلموں پر جو ان گوشوں میں رہ جائیں پھر وہی مظالم توڑے جائیں؟ اگر واقعی ان کا یہی مقصد ہے تو کوئی ایک غیر مسلم بھی اس تجویز میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اگر اسلام کی یہ سب تعلیمات نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت اسلام کی صلح پسندی اور رواداری کے بنیادی اصولوں کے بالکل منافی ہیں تو پھر کیا یہ کوئی خوشگوار کام ہے کہ پرانی تاریخ کے گڑے مردوں کو اکھیڑا جائے اور مسلموں اور غیر مسلموں کے سامنے یہ غلاظت بکھیری جائے؟ کیا ہم یہ حکایات اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ ماضی کی تلخ اور ناخوشگوار یاد تازہ نہ ہو جس کا بھلا دینا ہی سب کے لئے اچھا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس سبب سے اچھا ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے کہ جنھوں نے اپنے مذہب کو اسلام کے نام پر ایسے کام کر کے ذلیل کیا درحالیکہ اسلام نے انھیں ہرگز ایسی اجازت نہیں دی تھی اور درحالیکہ انھوں نے یہ سب کچھ محض اپنی شان اور عظمت بڑھانے کے لئے کیا نہ کہ تبلیغ اسلام کے لئے جو کہ اس وقت بھی تبلیغ کے زیادہ پاک اور زیادہ شریفانہ طریقوں پر منحصر تھی یہ اور آج بھی ایسے ہی طریقوں پر منحصر ہے، اور غیر مسلموں کے لئے اس سبب سے اچھا ہے کہ ایک ایسے مذہب کا جو اس قسم کے مظالم روا رکھتا ہے کا جوش جوان کے سینوں پر سوار رہتا ہے وہ سینوں سے ہٹ جائے اور باہمی دوستی اور صلح کا دور جاری و ساری رہے۔

اگر ان تمام باتوں میں سے جو کہ اس قسم کے اقتباسات سے اخذ کرنا مقصود ہیں

کچھ تھوڑی سی بھی مسلمان اور غیر مسلم تسلیم کر لیں کہ اسلامی حکومت کا جزو ہیں تو پھر مسلمانوں کی یہ کوشش ہوگی کہ مظالم کرنے اور ان کے جاری رکھنے کے لئے انہی طریقوں سے استحقاق حاصل کریں جن طریقوں سے ان لوگوں نے کہ جنھوں نے زمانۂ ماضی میں ظلم کئے استحقاق حاصل کئے تھے۔ وہی تاریخی ذرائع جن سے اس قسم کی داستانیں اور اقتباسات حاصل کئے گئے ہیں یہ بھی شہادت دیں گے کہ اس زمانے کے مسلمانوں کو کبھی اس قسم کے حقوق یا اختیارات اپنے غیر مسلم ہم عصروں کی رضامندی سے حاصل نہیں ہوئے۔ اگر صدہا سال گذرنے سے اور ان تمام صدیوں میں جو کچھ دنیا کے اندر ہوا ہے اس نے مسلمانوں میں ہندوؤں سے سلوک کے متعلق اور ہندوؤں میں مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی ہے تو اب یہ امید کیوں کی جاتی ہے کہ غیر مسلم اس ایک خاص معاملے میں بدل جائیں گے اور اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ ایسی ایذا رسانیوں اور مظالم کا ارتکاب کیا جائے جن پر تمام مہذب دنیا اور خود ہندوستان کے مسلمان بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ یا تو یہ بات صحیح ہے کہ اس قسم کے افعال اسلامی شریعت کا جزو ہیں یا پھر یہ صحیح ہے کہ وہ اس کا جزو نہیں ہیں۔ اگر وہ اسلامی شریعت کا جزو ہیں تب تو کوئی بھی غیر مسلم اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ "ایک خیالی نمونے کی اسلامی ریاست جس کا آخری نصب العین تمام دنیا کے اندر خالص اسلامی اصولوں پر انقلاب برپا کرنا ہو[۵]" بنانے کے لئے ادنیٰ سا بھی موقع مہیا کرے۔ ایک ایسی اسلامی ریاست جو مذکورۂ بالا مفروضات کے مطابق ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو جائے گی کہ اپنی اس تاریخ کو دہرائے جو ان اقتباسات میں بیان کی گئی ہے۔ اگر یہ مظالم اسلامی شریعت کا جزو نہیں ہیں تو ان کی یاد تازہ رکھنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کے ذکر سے صرف

---

[۵] "ایک پنجابی" کی کتاب صفحہ ۲۶۹ اور ۲۷۰۔

یہی ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے غصہ کی آگ اور بھی بھڑکے، اور خواہ کوئی تقسیم ہند کا موافق ہو یا مخالف کسی کا بھی یہ تو مقصد ہو نہیں سکتا کہ اس آگ کو بھڑکایا جائے۔ اگر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہندو اور مسلمان زمانہ ماضی کے اس سلوک کی وجہ سے مل جل کر رہنے پر رضامند نہیں ہو سکتے اور اس لئے انہیں الگ الگ ہو جانا چاہیئے تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا اثر اس مقصد کے خلاف زیادہ پڑ سکتا ہے۔ صرف اسی ایک عذر پر ہندو اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ اپنے کروڑوں ہم مذہبوں کو اسلامی علاقہ میں چھوڑ دیں کہ ان کے ساتھ پھر وہی سلوک ہو۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قسم کے اقتباسات عملی طور پر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں کوئی اہمیت یا وقعت نہیں رکھتے۔

اب اگر ان اقتباسات کے مفید یا مضر ہونے سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس قسم کے فقروں کو کسی خشک کتاب میں سے جو کہ پرانے زمانے کی یا نئے زمانے کی لکھی ہوئی ہو چن چن کو نکال لینا کوئی محنت یا ہنرمندی کا کمال نہیں۔ تاریخ کی کتابیں ابھی چند روز پیشتر تک عام طور پر بادشاہوں اور فاتحوں کے حالات سے بھری ہوئی تھیں۔ کہیں ان کے درباروں کی شان کے تذکرے ہوتے تھے اور کہیں محل سرائے کی سازشیں مذکور ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کے مؤلف عام انسانوں کی طرف بہت ہی کم متوجہ ہوتے تھے جو بے چارہ اپنی سادہ اور یکساں زندگی خاموشی اور سکون کے ساتھ بسر کرتا رہتا تھا اور یا تو کھیت پر اپنا جوتی کا پسینہ ایڑی تک بہا کر ہل اور پھاوڑے کی مدد سے اپنی روزی کماتا تھا یا اپنے گھر کے اندر اپنے چرخے اور اپنے کرگھے یا بسولے اور چھینی سے اور ہتوڑے سے یا سوئی تاگے سے اور اسی قسم کے دوسرے صدہا اوزاروں سے جو گھریلو صنعتوں میں کام آتے ہیں کام کرکے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ قوموں کی زندگی کی تاریخ میں عابدوں اور زاہدوں کو عقلمندوں اور حکیموں کو عالموں اور مصلحوں کو شاعروں کو اور فلسفیوں کو مصوروں کو اور راگیوں کو وہ اہمیت

نہیں دی گئی ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ ان تاریخوں کے لکھنے والے اس غلط قیاس اور غلط گمان سے بہت کچھ اثر پذیر تھے کہ ایک مسلمان بادشاہ یا فاتح کی مذہبی سرگرمی بس اسی بات سے ثابت ہو سکتی ہے کہ جو برتاؤ اس نے کافروں کے ساتھ کیا اور وہ بادشاہوں اور فاتحوں کی طرف سے یہ اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ کیونکہ اکثر حالات میں وہ اس کے درباری ہی ہوتے تھے کہ اس قسم کے ذرا ذرا سے واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں تاکہ آنے والے حکمرانوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال کا کام دیں اور دوسری طرف مفتوح لوگوں کے دلوں پر خوف طاری کر دیں۔ اس کی کچھ ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ اس قسم کے واقعات کو مبالغہ آمیز یا جھوٹے ثابت کر کے مسترد کیا جائے۔ بس یہ کافی ہے کہ اس بات کو نہ بھولیں کہ تاریخ میں لکھنے کے لئے مورخ کے سامنے صرف یہی واقعات نہ تھے، اور اگر اسی قدر تفصیل کے ساتھ وہ دوسرے واقعات بھی بیان کرتا کہ جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ کس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہو کر صدیوں تک باہم مل جل کر رہے ہیں، کس طرح دونوں مذہبوں کے دلیوں اور سادھوؤں نے ایک دوسرے کے رسم و رواج اور عادات و خصائل پر اثر ڈالا اور انہیں صحیح سانچوں میں ڈھالا ہے، کس طرح وہ رسمیں جو بہت سے مسلمان گھرانوں میں شادی بیاہ یا بچوں کی پیدائش کے موقع پر ضیا فتوں وغیرہ کے متعلق ادا کی جاتی ہیں بالکل ایسی ہی ہیں کہ جیسی ہندو گھرانوں میں برتی جاتی ہیں، کس طرح یہ رسمیں مختلف صوبوں کے رہنے والے مسلمانوں میں اور اسی طرح مختلف صوبوں کے رہنے والے ہندوؤں میں خود مسلمانوں اور ہندوؤں سے مختلف ہیں، کس طرح مسلمان صوفیا اور فقرا کو یہ فخر کہ انھوں نے ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنا ہم مذہب بنا لیا۔ بادشاہوں اور فاتحوں کی شمشیر زنی اور آتشباری سے بہت زیادہ پہنچتا ہے، ان چیزوں کا ذکر کرنے میں تاریخ کی کتاب کی جتنی جگہ

صرف ہوگی وہ اس سے بہت زیادہ ہوگی جتنی کہ مسلمان بادشاہوں اور فاتحوں کے مظالم کی داستانیں لکھنے میں صرف ہوئی ہے۔ اگر اس قسم کے حالات اور واقعات بیان کرنے کے لئے تاریخ لکھی جائے تو اس کے صفحات کی نسبت تاریخ کی ان کتابوں کے صفحوں کے ساتھ کہ جن سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں اور جن سے نصاب تعلیم کی تاریخ کی کتابیں تیار کی جاتی ہیں وہی ہوگی جو ملک کے عوام کی مردم شماری کو مٹھی بھر بادشاہوں اور ان کے درباریوں، ان کے فوجی افسروں، ان کے حاکموں، ان کی حرم سرایوں اور محلات سے تھی۔ اس قسم کی تاریخ کے صفحات کی وہی نسبت ہے جو اس تمام زمانے کو جو پُرامن زندگی اور خیر خواہی اور سخاوت اور ہمدردی اور باہمی رواداری میں لبسر ہوا۔ اس مختصر سے زمانے کے ساتھ ہے جو باہمی جھگڑوں، فسادات لوٹ مار، قتل۔ آتش زنی اور لوٹ مار کی وارداتوں میں گذرا ہے جو ایک فرقے کے لوگوں نے دوسرے فرقے کے خلاف کیں۔ آج بھی اخبارات میں جتنی جگہ اس قسم کی وارداتوں کو ملتی ہے۔ اس مناسبت سے بدرجہا زائد ہے جو ان وارداتوں کو باہمی یگانگت اور دوستانہ تعلقات کے ساتھ ہے، لیکن اگر پانچ سو سال کے بعد کوئی مورخ ان اخبارات کی تحریروں کی بنا پر اپنی تاریخ مرتب کرے گا۔ اور ان تحریروں کو اپنی کتاب کی زینت بنائے گا تو اس کے لئے ان اخباروں کی سند سے یہ ثابت کرنا بہت ہی آسان ہوگا کہ پُرامن انگریزی سلطنت کے زمانے میں بھی ہندستان کو ایک دن امن اور چین کا میسر نہ آتا تھا۔ اس لئے حسب ضرورت نسبتاً کم مواد کے ملنے کی وجہ سے یہ آسان نہیں ہے کہ کوئی مکمل اور سیر حاصل کتاب جس میں ان سب سماجی اور تہذیبی تحریکات کا دوران کے جو گہرے اور دیرپا اثرات زندگی پر مرتب ہوئے ان کا اور متعلقہ قوموں کے بنانے پر جو غیر محسوس اور غیر مرئی اثرات ان کے پڑے ان کا ذکر ہو، لکھنا مشکل ہے۔

باوجود اس کے کہ اس میں بھانت بھانت کے انسان آباد ہیں۔ رنگ رنگ کی آب وہوا ہے اور طرح طرح کے جغرافیائی حالات ہیں ہندستان صرف واحد جغرافیائی احدیت ہے۔[۱]

قوم کیا چیز ہے؟ قوم کس عنصر سے بنتی ہے؟ یہ سوال پوچھا بھی جاچکا ہے اور اس کا جواب بھی علیحدہ قومیت کے حامیوں کی طرف سے دیا گیا ہے اور عالم و فاضل مصنفوں کی کتابوں سے اس جواب کے لئے سند بھی لی گئی ہے، مسٹر درانی جنھوں نے اس مسئلہ کی چھان بین بہت کافی کی ہے وہ جن نتائج پر پہنچے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

(۱) اگرچہ ہندستان جغرافیائی لحاظ سے ایک واحد ملک ہے لیکن اس کے باشندے ایک نہیں ہیں اور ریاستوں اور قوموں کی تعمیر میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ باشندے ہیں نہ کہ جغرافیہ۔ انسان کی زندہ روح کو غلام نہیں بنایا جاسکتا بقول رینن کے دریاؤں کے بہاؤ کے راستوں اور پہاڑی سلسلوں کے رُخ کی وجہ سے۔ رینن کا مقولہ ہے کہ "زمین تو فرش مہیا کرتی ہے، درجنگ کے اور کام کرنے کے میدان مگر انسان روح مہیا کرتا ہے، اس مقدس چیز کی تعمیر کے لئے جس کا نام قوم ہے انسان ہی سب کچھ ہے، اس کام کے لئے کوئی مادّی نوعیت کی چیز کافی نہیں ہوتی۔

(۲) فی الحقیقت نسل بھی جغرافیہ کی طرح قوم کی تعمیر کے لئے کوئی ایسا جزو نہیں کہ جس کی موجودگی سے قوم بن جائے اور جس کے بغیر قوم نہ بن سکے۔

---

[۱] ایف کے خان درانی کی کتاب "دی مینگ آف پاکستان" (The Meaning of Pakistan) صفحہ ۲۔

باب (۲)

قومیت اور ریاست

چونکہ خود مختار اور علیحدہ مسلم ریاستیں شمال مغرب میں اور مشرقی ہندستان میں بنانے کا مطالبہ اس نظریئے پر مبنی ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ یعنی ہندوؤں سے اور تمام دوسرے لوگوں سے جو اس جغرافیائی وجود میں بستے ہیں کہ جسے ہم ہندستان کہتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ لفظ قوم کا مفہوم پورے طور پر سمجھ لیا جائے۔ یہ حقیقت کہ جغرافیائی لحاظ سے سارا ہندستان ایک ہی ملک ہے ناقابل انکار ہے کیونکہ جغرافیہ ایسی چیز نہیں جسے انسان بدل سکتا ہو۔ مسٹر الیف، کے خان درانی فرماتے ہیں کہ "اس کے برعکس میں ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا ملک پہاڑ اور سمندر کے ذریعہ سے اس طرح نشان زدہ نہیں ہے کہ جس طرح ہندستان ایک الگ مکمل ملک ہے۔ سلیمان کوہ سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک اور کوہ ہمالیہ سے لے کر سمندر تک

(۳) ہندو لیڈر کوئی بیس سال سے اس خیال کی اشاعت کر رہے ہیں کہ مذہب کو سیاسیات کے ساتھ نہ ملانا چاہیئے اور یہ کہ ایک متحدہ قومیت کی تعمیر صرف سیاسی بنیاد پر ہونی چاہیئے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ کیا قوم کی تعمیر صرف سیاسی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ سیاسی فلاسفروں کا یہ خیال ہے کہ صرف سیاسی بندھن اس بات کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ قوم کی تعمیر عمل میں آسکے۔"[۵۱]

انھوں نے لارڈ برائس (LORD BRYCE) اور پروفیسر سیڈوک (PROF. SIDGWICK) کے مقولے اپنے دعوے کے تحت میں پیش کئے ہیں۔ سڈوک نے لکھا ہے کہ "کوئی سیاسی جماعت جس میں اس رشتے کے علاوہ کہ سب لوگ ایک ہی حکومت کے زیر حکم ہیں کسی اور رشتۂ اتحاد کا احساس موجود نہ ہو اس کی حالت غیر اطمینان بخش اور ناپائدار ہو گی۔ اس قسم کی غیر مربوط جماعت میں افراد کے درمیان وہ باہم متحد کر دینے والا عنصر مفقود ہوتا ہے جو ان پیہم صدمات کے روکنے کے لئے ضروری ہے جو وقتاً فوقتاً بیرونی حملوں اور اندرونی اطمینان ناپذیری کی بدولت پہنچا کرتے ہیں۔ اس سبب سے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ ضروری بھی ہے اور مفید بھی کہ ریاست کے افراد باہم ایک اور رشتہ سے بھی مربوط ہوں جسے اجمالی طور پر قوم یا قومیت کہا جاتا ہے۔"[۵۲]

آگے چل کر اسی سڈوک نے لکھا ہے کہ زمانۂ حال کے ریاست کے تصور کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جن ارکان یا افراد سے وہ ریاست بنی ہے ان کے

---

۵۱ "دی مینگ آف پاکستان" The Meaning of Pakistan
صفحہ ۴، ۶۔

۵۲۔ درانی صفحہ ۷۔

دلوں میں اس احساس کے علاوہ کہ وہ ایک ہی حکومت کے زیر حکم ہیں کوئی دوسرا احساس ایسا بھی موجود ہو کہ وہ سب ایک ہیں اور ایک ہی جسم کے اجزا ہیں تاکہ اگر ان کی حکومت کو جنگ یا انقلاب کے نتیجے سے شکست بھی نصیب ہو جائے تو وہ اس وقت بھی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رہیں۔ جن جماعتوں میں اس قسم کا احساس موجود ہو ان کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک قوم بن گئے ہیں خواہ ان میں اور کچھ بھی خامی ہو۔ لارڈ برائس[1] نے قومیت کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "وہ انسانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جو بعض جذبات کے زیر اثر آپس میں ایک دوسرے سے متحد اور مربوط ہو گئے ہیں۔" اور آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ "ان جذبات میں سے یگانگت نسل اور یگانگت مذہب کے جذبات مخصوص ہیں لیکن ان کے علاوہ یک جماعتی کا وہ احساس بھی ہے جو ایک زبان بولنے سے، ایک مشترک ادب کی موجودگی سے، زمانۂ ماضی کی متحدہ فتوحات اور مشترکہ مصیبتوں کی یاد سے مشترکہ رسوم و رواج سے، اور مشترکہ نصب العین اور مشترکہ آرزوؤں سے پیدا ہوتا ہے۔
بعض اوقات یہ تمام یگانگت کے رشتے موجود ہوتے ہیں اور جماعت کے افراد کو باہم منسلک رکھتے ہیں اور کبھی ان میں سے ایک یا دو موجود نہیں بھی ہوتے۔ یہ رشتے جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی یگانگت کا احساس قوی تر ہوتا ہے۔ ہر حالت میں صرف یہی چیز دیکھنے کی نہیں ہوتی کہ کتنے بہت سے رشتے افراد جماعت کے درمیان قائم ہیں بلکہ یہ بھی کہ الگ الگ ہر ایک رشتہ کتنا مضبوط ہے۔[2] چند اور مصنفین کے اقتباسات دینے کے بعد مسٹر درانی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قومیت فی الحقیقت صرف ایک احساس اور بالکل نفسیاتی چیز ہے۔"[3] اور اپنے اس خیال میں انہیں ڈاکٹر امبیدکر کے اس قول سے

---

[1] تصنیف درانی صفحہ ۹
[2] " " صفحہ ۱۱
[3] تصنیف درانی صفحہ ۸ ۔

مدد ملی ہو کہ یہ ایک اس قسم کے شعور کا احساس ہو کہ جو ایک طرف تو ان سب لوگوں کو جن کے دل میں یہ موجود ہو ایسی مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا رکھتا ہو کہ اس کے سامنے تمام انفرادی جھگڑے اور عام جماعتی اونچ نیچ مفقود ہو جاتی ہو اور دوسری طرف وہ ان سب آدمیوں سے کٹ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ جو ان کی نوع کے نہ ہوں[۴]؟

ان تمام باتوں سے جو آخری نتیجہ مسٹر درانی نے نکالا ہو یہ ہو کہ (۴) ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جماعتی شعور یا ہم نوعی کا احساس مطلقاً موجود نہیں ہو۔ وہ مل کر ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھانے کے لئے نہیں بیٹھ سکتے یا وہ آپس میں بیاہ شادی نہیں کر سکتے۔ ایک فریق کی کھانے کی چیزوں سے دوسرا تنفر کرتا ہو۔ ہندو صرف مسلمان کو چھو جانے ہی سے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ دونوں فرقوں کے مابین ایسے سماجی تعلقات بھی نہیں ہیں جن کی وجہ سے ایک متحدہ قومیت کا احساس پیدا ہو سکے حقیقت یہ ہو کہ نفسیاتی طور پر یہ محالات سے ہو کہ دونوں گروہ کبھی مل کر ایک متحدہ کل یعنی قوم بنا لیں[۵]؛

یہ امر قابل غور ہو کہ قومیت کا یہ تخیل ایک نسبتاً نیا اور زمانہ حال کا تخیل ہو جو گذشتہ دو یا زیادہ سے زیادہ تین صدیوں کا تخیل ہو۔ اگرچہ جن عناصر کا ذکر لارڈ برائس اور پروفیسر سٹرک نے کیا ہو۔ کم و بیش ان تمام جماعتوں میں موجود ہیں کہ جن کے متعلق خیال کیا جا سکتا ہو کہ انھوں نے قوم کی تشکیل کی ہو۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہو کہ ان میں سے الگ الگ ایک ایک چیز کو لے کر دیکھا جائے کہ کسی خاص گروہ انسانی میں وہ موجود ہو یا نہیں اور اگر ہو تو کس قدر ہو اور پھر اس امتحان کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ اس گروہ میں قوم بننے کی صلاحیت ہو یا نہیں۔ یہ مختلف عناصر ایک جگہ جمع ہو کر من حیث المجموع ایک دوسرے پر اثر انداز اور اثر پذیر ہوتے ہیں اور تاریخ میں ان کا

انداز ظہور کہ جب انھوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا اور اثر قبول کیا ہے وہ اصل چیزیں
ہیں کہ جن کی بنا پر کسی گروہ کو قوم کہنے کا فیصلہ منحصر ہے۔ اسٹالن نے کہا ہے کہ سب سے
پہلے تو قوم ایک جماعت ہوتی ہے ایک ایسی جماعت جس کا اپنا علیحدہ اور ممتاز وجود ہو
اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی بنیاد ایک خاص نسل یا ایک خاص قبیلہ پر
ہو۔ قوم ایک ہنگامی یا وقتی روزہ زندگی والی انسانی مجمع بھی نہیں ہوتی بلکہ آدمیوں کی ایک
مستقل اور پائدار جماعت ہوتی ہے۔ قوم کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ افراد قوم کی زبان ایک ہو
اور اسی طرح یہ بھی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ سب کا ملک ایک ہو۔ ایک اور نشان
امتیازی یہ ہے کہ ایک مشترکہ اقتصادی زندگی ہو جس میں اقتصادی پیچیدگی اور اتصال موجود
ہو۔ ان چیزوں کے علاوہ قوم کا ایک اپنا مخصوص روحانی رنگ بھی ہوتا ہے یعنی اس کا
نفسیاتی ساز جسے دوسرے لفظوں میں قومی کردار کہا جاتا ہے اور جس کا مظاہرہ ایک
ممتاز تہذیب کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ اسٹالن کے خیال کے مطابق قوم ایک ایسی جماعت
ہے جو تاریخی ارتقاء کے منازل طے کر کے وجود میں آئی ہو اور ایسے انسانوں کا
پائدار اور مستقل مجموعہ ہو جو ایک زبان بولتے ہوں، ایک ملک میں رہتے ہوں اقتصادی
زندگی میں ایک دوسرے کے شریک ہوں اور جن کی نفسیاتی ساخت و پرداخت
ایک سی ہو جو مشترکہ تہذیب کی صورت میں ظاہر ہو۔"[۵]

اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ایک ریاست اور
ایک قوم کے درمیان حد امتیاز قائم کر دیں۔ یہ دونوں لفظ ہمیشہ ہم معنی نہیں ہوتے
اور زمانہ ماضی میں بھی ایسی مثالیں ہو چکی ہیں اور اب ہمارے اپنے زمانے بھی موجود

---

۵ جے اسٹالن کی کتاب "مارکسزم اینڈ دی کوسچن آف نیشنیلیٹیز (Marxism and the Question of Nationalities) صفحہ ۶۔

ہیں کہ جن میں ریاست صرف ایک ہی لیکن اس میں متعدد مختلف قومیں شامل ہیں۔ کناڈا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اگرچہ وہ دو مختلف قومی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک مشترکہ ریاست بنالی ہی۔ انگریزوں نے اور جنوبی افریقہ کے بوئریں نے ایک خوں ریز جنگ کے بعد معاہدہ کرکے ایک ریاست بنالی ہے۔ امریکا کی ریاست ہائے متحدہ میں بہت سی مختلف قوموں کے آدمیوں نے وہاں آباد ہوکر ریاست تعمیر کرلی ہی۔ روس کی سوویٹ جمہوریت میں بہت سی مختلف قومیں شامل ہیں جنھیں نظم ونسق کی خودمختاری حاصل ہی۔ اور دستور میں اس بات کی ضمانت ہی کہ انھیں جمہوریہ سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہی اگر وہ علیحدہ ہونا چاہیں۔ نظم ونسق کی خودمختاری کا دائرہ اب اتنا وسیع ہوگیا ہی کہ وہ اپنی اپنی مسلح فوجیں رکھ سکتے ہیں اور انھیں یہ بھی حق حاصل ہی کہ بطور خود خارجی ممالک سے اپنے تعلقات قائم کرسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ معاہدے کرسکتے ہیں اور اپنے نمائندے ان سلطنتوں میں بھیج سکتے ہیں۔ سوئڈن کے لوگ اس کی بہت ہی اعلیٰ مثال ہیں جن کا تعلق تین مختلف یعنی فرانسیسی، جرمنی، اور اطالوی قوموں سے ہی جن سے ان کا ملک گھرا ہوا ہی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی ایک ریاست بنا رکھی ہے۔ سی۔ اے میکارٹنے (C.A. MACARTNEY) لکھتا ہی کہ "یہ کہنا زیادہ صحیح ہی کہ لفظ قومیت کا اطلاق دونوں جذبات میں سے کسی ایک پر ہوسکتا ہے جو کہ اپنے ماخذ اور مطلب کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہیں اگرچہ عملی طور پر اکثر ان میں کا ایک دوسرے کی قائم مقامی کرلیتا ہے۔ بدقسمتی سے انگلستان میں تاریخی واقعات کی ظہور پذیری نے کچھ ایسا اثر کیا ہی کہ دونوں جذبات بالکل ایک ہوگئے

ل سی۔ اے میکارٹنے (C.A. MACARTNEY) کی کتاب نیشنل اسٹیٹس اینڈ نیشنل مائینارٹیز (National States & National Minorities

ہیں۔ اور انگریزی زبان جس سے اس کے بولنے والوں کا پھوہڑپن ظاہر ہوتا ہے دونوں کے لئے صرف ایک لفظ پر اکتفا کرتی ہے۔ پھر بھی وہ قومیت کہ جس سے مفہوم ایک خاص قوم سے تعلق رکھتا ہو بنیادی طور پر اس قومیت سے جداگانہ اور ممتاز ہے جس کا مطلب ایک ہی ریاست یا حکومت میں رہنا ہو۔ یہ دونوں قسم کی قومیتیں جداگانہ اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ان کا رجحان جداگانہ مقصدوں کی طرف ہو۔

"اول الذکر جسے آسانی کی خاطر ہم شخصی قومیت کا احساس کہہ سکتے ہیں وہ ایسی خصوصیات پر مبنی ہوتی ہے کہ جو ذاتی اور شخصی ہوتی ہیں اور بسا اوقات وہ ورثے میں ملتی ہیں اور عام طور پر دوسروں کو نظر آسکتی ہیں خواہ وہ کسی ملک میں بھی جاکر آباد ہوجائے اور چاہے اس مقام پر اس کے ہم وطنوں کی اکثریت ان خصوصیات کی حامل ہو یا نہ ہو اور جس ملک میں وہ قیام پذیر ہو اس کی سیاسی حکومت کا بھی ان خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا خواہ وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو کہ جو ان خصوصیات میں شریک ہیں۔ ایسے لوگوں کی جماعت کا نام کہ جن میں یہ ایک سی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں قوم ہے[۵]۔ وہ خصوصیات کہ جن پر یہ احساس مبنی ہے بہت مختلف ہیں۔ لیکن اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تین خصوصیات یعنی نسل زبان اور مذہب ان سب پر حاوی ہو سکتی ہیں۔ یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ ان خصوصیات کا کوئی تعلق سیاسی خصوصیات سے نہیں ہوتا۔ ایک جرمن خواہ وہ آسٹریا کا باشندہ ہو یا زیکوسلاوکیہ کا۔ یا برازیل کا یا ہو نو لولو کا اس کا ڈوال ڈوال تک اسی قدر جرمن ہے کہ جس قدر

---

۵ میکارٹنے (Macartney) صفحہ ۶

برلن کے رہنے والے کا۔

ریاست کی بنیاد اور اس کا اصل مقصد اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ ریاست ایک آلہ ہی جس کے ذریعے سے لوگوں کی ایک جماعت کے مشترک معاملات کا انتظام کیا جاتا ہی اور (بالعموم) ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے انگلستان میں ان لوگوں کو بھی کہ جو مل کر ریاست یا حکومت کی تشکیل کرتے ہیں اسی لفظ قوم سے تعبیر کیا جاتا ہی کہ جو اس سے بالکل مختلف جماعت کا نام ہی کہ جس کا ذکر اوپر آیا۔ جس حد تک کہ ان کے وہ تمام معاملات جو باہم مشترک ہیں اور جن کا انصرام ریاست کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے وہ حد نہ صرف مختلف زمانوں میں بلکہ مختلف ملکوں میں بھی مختلف رہی ہی۔ بعض حالات اور مقامات میں وہ تحفظ کے درجے سے آگے نہیں بڑھتی۔ درحالیکہ دوسرے مقامات پر وہ زندگی کے بیشتر مظاہروں پر حاوی ہی اگر وہ خالصتاً شخصی تعلقات نہ ہوں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مذہبی صفات جن سے شخصی قومیت کا تخیل بنا ہی وہ آخری چیزیں ہیں کہ جن کی طرف اکثر و بیشتر ریاستوں نے کوئی توجہ کی ہو، اور آج بھی ان کے متعلق یہی خیال عام ہی کہ یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ جن پر ریاست کا اقتدار ہو۔ ------ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ریاست جن فرائض کو انجام دیتی ہی ان میں سے اکثر و بیشتر شخصی قومیت سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اپنے مشترک گھر یعنی ملک کی حفاظت، قیام امن، انسداد جرائم اور سزا دہی، سلسلہ رسل و رسائل کا قیام، عوام کی دولت و املاک کی حفاظت، محاصل کا مساوی طور پر لگانا اور وصولی کرنا سب ایسے کام ہیں کہ جن کا تعلق ریاست کے ہر باشندے سے یکساں ہی خواہ وہ عیسیٰ کا پیرو ہو یا محمد کا اور خواہ وہ انگریزی زبان بولتا ہو یا ویلش یا یدیش ہر شخص کا فرض ہے کہ ان سماجی اور سیاسی کارروائیوں کے چلانے میں مدد دے کہ جو سب کے سب ایک ریاست کے حقیقی فرائض ہیں اور

جن سے ہر باشندہ ریاست یکساں مستفید ہوتا ہے۔"[۵]

اس طرح یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگرچہ شخصی قومیت بھی ایک ریاست کے بنانے میں ایک ضروری جزو کا کام دیتی ہے لیکن وہ ہمیشہ واحد جزو، بلکہ سب سے ضروری جزو بھی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اگرچہ اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خالصۃً یہ اسی بندھن ایک قوم نہیں بنا سکتے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسی بندھن بھی ایک اہم جزو ہیں۔ اگر کسی جماعت پر باہر سے کوئی دباؤ پڑ رہا ہے تو جوین کیمپلے کے قول کے مطابق یہ "بیرونی دباؤ" غالباً اس جماعت کو ایک قوم بنا دینے کے لئے سب سے بڑا تنہا جزو ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

قومی ریاستوں کے مسئلہ پر پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بہت کچھ غور و خوض کیا جا رہا ہے اور اس کے متعلق ادبیات میں ایک کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ کا مطالعہ ۱۹۳۴ء میں سی، اے، میکارٹنے کی مستند کتاب کے جس سے میں نے پچھلے باب میں طویل اقتباسات نقل کئے ہیں شائع ہونے کے بعد شروع ہوا۔ اس تمام مطالعہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ محققین نے ان نتائج کی تصدیق کی ہے جو میکارٹنے نے اخذ کئے ہیں یعنی یہ کہ شخصی قومیت اور سیاسی قومیت کے مابین فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے اور یہ کہ ریاست لفظ قومیت کا ہم معنی نہ ہونا چاہئے۔ اور یہ کہ قومی ریاستیں بنانے کی کوششیں ناکام رہی ہیں اور نئے نئے جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں اور یہ کہ قومی ریاستوں کے تجربات اور ان کے زیر حکم جو قومی اقلیتیں ہیں ان کے ساتھ ان کا سلوک تلخ کی حد تک ناخوشگوار ہوئے ہیں۔ یہ تجربات قطعاً ہمت افزا نہیں ہیں اور یہ کہ خود انجمن اقوام کی ضمانت بھی ایسی صورتوں میں کہ جہاں قومی ریاستوں کو

---

[۵] میکارٹنے MACARTNEY ، صفحہ ۱۱ و ۱۲۔

اقلیتوں کے متعلق معاہدات تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا تھا، بے سود اور بے اثر ثابت ہوئی۔ اور یہ کہ اقلیتوں کے مسئلہ کا حل قومی ریاستیں بنانا نہیں ہے کیونکہ ان کی تعمیر اس سبب سے ناممکن ہے کہ ایسی کوئی سیاست بنا لینا محال ہے کہ جس میں صرف ایک ہی قوم ہو اور دخل غیر سے بالکل پاک ہو، اور یہ کہ اس مسئلے کا حل "چند قوموں کی متحدہ ریاست" کی صورت میں تلاش کرنا چاہیئے جس میں ہر اقلیت کو اس بات کی پوری آزادی ہو کہ اپنی مخصوص شخصی قومیت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیے

فریڈمین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قومیت اور زمانۂ حال کی ریاست ایسی دو طاقتیں ہیں جو نہ تو ایک چیز ہیں نہ باہم ضروری طور پر متوازی ہیں۔[۱] فریڈمین نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ "اس مختصر سے تبصرہ میں جو بات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ ایک بالادست حکومت کا تخیل، گو وہ قومی خود اختیاری کی بنیاد پر قائم ہو خود اپنے کو جھٹلانے کا مادہ اپنے اندر مضمر رکھتا ہے، اور یہ کہ ایک قابل اطمینان حل کا دستیاب ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ نصب العین ایک بالادست قومی ریاست ہے۔[۲] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے سب لوگ اس امر خاص میں متفق الرائے ہیں۔ میکارٹنے مسئلے کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد سویٹ روس اور برطانیہ عظمیٰ کے تجربوں کی بنیاد پر "چند قومی ریاست" کی سفارش کرتا ہے۔[۳] وہ پروفیسر کار کی کتاب "دی فیوچر آف نیشنس" (قوموں کا مستقبل) کے صفحہ ۵۲ سے یہ حوالہ اپنی پسندیدگی کے ساتھ نقل کرتا ہے کہ "آئندہ یہ رسم

---

[۱] ڈبلیو فریڈمین (W. FRIEDMANN) کی کتاب دی کرائسس آف دی نیشنل اسٹیٹ" (The Crisis of National State) صفحہ ۹

[۲] ایضاً صفحہ ۲۰

بند ہو جانی چاہیئے کہ ایک کم و بیش ہم نسل اور ہم زبان جماعت جو آپس میں مشترکہ قومی روایات اور مشترک قومی تہذیب کے رشتہ میں بندھی ہوئی ہو تو اس کا یہ حق سمجھا جائے کہ وہ ایک خود مختار سیاسی ریاست بنائے اور اسے چلائے[1]" اور اسی طرح ڈی ایچ، کول کی کتاب "یورپ اشیا اینڈ دی فیوچر" سے یہ حوالہ دیا ہے کہ "لیکن اس بیسوی صدی میں آئندہ قومیتیں وہ بنیاد نہیں ہو سکیں جن پر ریاستیں قائم ہوں[2]"

فریڈمین نے آگے چل کر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ قومیت کی بنیاد پر قائم شدہ ریاست اگر وہ اتفاق سے چھوٹی سی ریاست ہے تو اس کا قیام اور استحکام دنیا کے اس علم و ہنر کی اور اس مشینری کی ترقی کے دور میں ناممکن ہے۔ ایسی ریاست کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی حفاظت بیرونی حملوں سے کر سکے اگرچہ وہ اس قابل بھی ہو کر اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء کم و بیش پورے طور پر اپنی حد و د ریاست ہی میں پیدا کرلے۔ موجودہ زمانے میں ایک ملک کی حفاظت کے لئے اس سے بہت زیادہ چیزوں کی ضرورت ہے۔ حفاظت کے معنے اس زمانے میں یہ ہیں کہ آدمیوں کی ٹڈی دل فوجیں اور چیزوں کے بہت ہی بڑے ذخائر دسترس کے اندر موجود ہوں، اور انہی وسائل کی کمی اور بیشی نے بڑی طاقتوں اور چھوٹی چھوٹی یک قومی ریاستوں کے درمیان ایسی زبردست نابرابری پیدا کر دی ہے[3]۔ فریڈمین نے اپنی تحقیقات کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ "تحقیقات نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے کہ

---

[1] فریڈمین (FRIEDMANN) صفحہ ۱۳۲

[2] " " " ۹

[3] " " " ۱۴۰

سیاسی، اقتصادی اور سماجی قوتوں کا رُخ آج کل یک قومی ریاستوں کی سمت کو نہیں بلکہ ان سے الگ کو ہے .... قومیت اور ریاست کا اتصال باہمی اس وقت شکست کی حد پر پہنچ جاتا ہے جب کہ قومیت اور زمانۂ حال کی ریاست دونوں اپنی حد سے آگے پاؤں نکالنے لگتی ہیں .... قومی بنیاد پر حکومت خود اختیاری کے معمے کا ایک دوسرا حل "چند قومی ریاست" ہے جس میں کہ ایک طاقت ور سیاسی اتحاد تہذیبی معاملات میں مختلف قومی جماعتوں کی خود مختاری کا ضامن ہو لیکن ان سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ سیاسی، فوجی اور اقتصادی بالادستی کی تمنا کو مشترکہ فائدے کے لئے قربان کر دیں[۱]۔"

رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ریلیفرس" کے زیر اہتمام مسٹر اے کابن کے "یک قومی خود اختیاری" کے مسئلہ کی تحقیقات کا نتیجہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا ہے۔ مسٹر کابن بھی تحقیقات کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس پر میکارٹنے اور فریڈمین پہنچے ہیں جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہوگا۔ جو ان کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

قوم ایک سیاسی احدیت یا ریاست کے معنوں میں ایک ایسا نظام ہے کہ جو مفید ہو جسے سیاسی ہنرمندی کے ساتھ سیاسی بلکہ اقتصادی مقاصد بھی حاصل کرنے کے لئے بنایا جائے۔ سیاسیات کی ایک فائدہ پہنچانے کی اقلیم ہوتی ہے اور اس کی کامیابی کا پیمانہ وہ درجہ ہے کہ جس درجے تک ایک اچھی زندگی کا مواد یعنی قانون کی پابندی، امن دوستی، اور اقتصادی خوش حالی فراہم کی جا سکے۔ قوم جس کا تخیل تہذیبی بنیاد پر ہو اس کے برعکس معمولاً بجائے خود ایک اچھی چیز ایک بنیادی حقیقت اور انسانی زندگی کا ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے مفر نہیں ہو سکتا

---

[۱] فریڈمین (FRIEDMANN) صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴

اس کا تعلق انسان کے روحانی اعمال کی دنیا سے ہے۔ اس کے کارنامے فنون لطیفہ ادب فلسفہ اور مذہب کے میدانوں میں ظاہر ہوتے ہیں .... ان دونوں ترقیوں کے جو سرے تجویز کئے گئے ہیں ان کا باہمی تفاوت بنیادی ہے اگرچہ بدقسمتی سے ان دونوں کا نام ایک ہی یعنی قوم رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ بات کہ یہ فرق محض نظریوں تک محدود نہیں بہ آسانی معلوم کی جا سکتی ہے"[۵] مصنف نے اس کے بعد کناڈا کے انگریزوں اور فرانیسیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جنھوں نے اپنی اپنی شخصی قومیت کو ترک کئے بغیر ایک مشترک قومیت بنائی ہے۔ اور امریکا کی بہت سی مختلف ہسپانوی ریاستوں کا ذکر کیا ہے کہ جن کا تہذیبی پس منظر ایک تھا اور وہ الگ الگ متعدد سیاسی ریاستوں میں منقسم ہو گئی ہیں۔"
تہذیبی اور سیاسی قومیتوں کو ایک دوسرے کے اندر بند کرنے کی جو کوششیں ناکام رہی ہیں ان کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور جہاں جہاں بھی موجودہ زمانے میں دونوں قسم کی قومیتوں کو ایک سانچے کے اندر ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا انجام بالعموم تباہی اور بربادی کی صورت میں نکلا ہے"[۶]
آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے کہ قومیت کو اگر ریاست بنانے کا معیار قرار دیا جائے تو یہ معیار بہت ہی آسانی سے بدل جانے والا معیار ہوگا کیونکہ قومیت ہمیشہ مختلف زمانوں، مختلف ملکوں، بلکہ مختلف افراد میں بھی بدلتی رہتی ہے۔ قومیت کی بنا پر بنائی ہوئی ریاست کے مفہوم میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ تمام آبادی متحد النسل ہو۔ اور یہ چیز صریحی طور پر جھوٹ ہے۔ کیونکہ دنیا کو کسی طرح بھی ایسے خطوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا جہاں الگ الگ ایک

۵۔ اے کابن کی کتاب نیشنل سیلف ڈیٹرمی نیشن (National Self - determination) صفحہ ۶۰۔

۶۔ اے کابن (A. COBBAN) صفحہ ۶۰۔

ہی نسل کے آدمی رہتے ہوں۔ مصنف نے آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ پرانی دنیا میں جہاں تہذیبی قوموں اور ریاستوں کو جو پیشتر سے آپس میں گڈمڈ ہیں الگ الگ نہیں چھانٹا جا سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ اس اعتقاد کو بالائے طاق رکھ دیا جائے کہ قومی ریاست ہی ایک مکمل سیاسی جماعت کا نمونہ ہے۔ "چند قومی ریاست کو سیاسی قانون کے اندر پھر داخل کرنا چاہیئے کہ جہاں سے ایکٹن کے قول کے مطابق اسے کبھی نکالا ہی نہ جانا چاہیئے تھا............

......ماضی قریب کی تاریخ حتیٰ کہ خود گذشتہ صدی کی تاریخ بھی اس بات کا سبق نہیں دیتی کہ سیاسی ریاست اور قوم کسی اور معنی میں بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ فی الحقیقت دوران تحقیقات میں ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان دونوں چیزوں کا جمع کرنا محالات سے ہے............ جس قومی ریاست کی بنا تہذیب پر ہو اس کو ایک جائز سیاسی نظام کی بنیاد بنانے کی کوششیں عملاً ناقابل حمایت ثابت ہوئی ہے اور نظریوں میں تو وہ کبھی بھی قابل حمایت نہ تھی۔[1]

قوم اور ریاست دو مختلف چیزوں میں جو غلط مبحث ہو گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قومی خود اختیاری کو ایک ایسے اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس کے حقائق الگ تہذیب رکھنے والی جماعت کو بلا پس و پیش یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے علیحدہ خود مختار ریاست کا مطالبہ کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کا کوئی اصول نہیں ہو سکتا اور یہ کہ قومی خود اختیاری بھی ٹھیک اسی طرح محدود ہے جس طرح سماج میں ایک فرد کو مختلف قابل لحاظ امور کے ماتحت آزادی دینا ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ کابن یہ سوال کرتا ہے کہ "کیا تاریخی جغرافیائی، اقتصادی اور سیاسی وجوہ ایسی نہیں ہو سکتیں جو قومی خود اختیاری کو دنیا کی بہت سی چھوٹی چھوٹی

---

[1] کابن صفحہ ۶۲-۶۳۔

قوموں کے معاملے میں خارج از بحث بنا دیتی ہیں؟ اگر کسی قوم کے افراد کی اکثریت بھی سیاسی آزادی کی طالب ہو تب بھی ایسے اسباب ہو سکتے ہیں جو انھیں اس سے روکیں، اور ان اسباب کو خواہ وہ کتنے ہی زیادہ آدمیوں کی خواہش کیوں نہ ہو بدلا نہیں جا سکتا۔ برک کا مقولہ ہے کہ اگر ہم بچوں کی طرح چاند کو حاصل کرنے کے لئے رو رہے ہیں تو پھر ہمیں بچوں کی طرح روتے ہی رہنا چاہیئے۔[۵]" میں اس پر اتنا اضافہ کر دوں کہ یہ تمام اسباب ہندستان کی تقسیم کے منافی ہیں بالخصوص اس لئے کہ ایسی کوئی حد فاصل کھینچنا ممکن نہیں ہو جو منقسمہ حصہ کو اس طرح علیحٰدہ کر دے کہ تقسیم شدہ مسلم ریاست کے اندر ہندوؤں کی اتنی بڑی اقلیت باقی نہ رہ جائے کہ جتنی تمام ہندستان میں مسلمانوں کی ہے۔ ہندستان کے اقتصادی اور فوجی حالات کا بھی یہی اقتضا ہو کہ وہ ایک بڑی سیاسی ریاست کے طور پر برقرار رہے، اور یہ حالات اجازت نہیں دیتے کہ اس کے ٹکڑے کر کے آزاد قومی ریاستیں بنائی جائیں۔ جسم سے کوئی حصہ جدا کرنا ایک تخریبی عمل ہے اور اولین کوشش کے طور پر نہیں، بلکہ آخری کوشش کے طور پر جائز ٹھہر سکتا ہو جبکہ اور تمام تدابیر ناکام ہو چکی ہوں۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایسی حالت ہندستان میں رونما ہو چکی ہو۔ حالانکہ مسلم لیگ کے علاوہ کسی دوسری جماعت نے کسی ایسی انتہائی دشواری کے پیدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے ——————— تب بھی کسی ایک مخصوص علاقے کو الگ کر دینے سے مشکل کے حل ہونے کا امکان نہیں ہو کیونکہ کم سے کم دو تین کروڑ مسلمان پھر بھی ہندو علاقہ ہائے ہند میں رہ جائیں گے اور اپنے پانچ کروڑ کے قریب یا دو کروڑ کے قریب غیر مسلم مسلمانوں کی ریاستوں میں چھوٹ جائیں گے۔ ہندوؤں کی تعداد اس بات پر منحصر ہے کہ آیا وہ علاقے جن میں ہندوؤں کی

---

[۵] اے کابن صفحہ ۴۷

شریت ہر مسلم ریاستوں میں شامل کئے جاتے ہیں یا نہیں جیسا کہ کسی دوسرے مقام پر
کر کیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں ایک ایسا حل تلاش کرنا چاہیئے کہ جو موجودہ زمانے کے تخیل
ے مطابقت رکھتا ہو، جو صدیوں کی تاریخ کو بیچ میں سے کاٹ کر نہ ڈال دیتا ہو، جو جغرافیہ
صورت نہ بگاڑتا ہو، جو ملک کی حفاظت کو اگر ناممکن نہیں تو دنیا کی اس زمانے کی حالت
د دیکھتے ہوئے انتہا سے زیادہ مشکل نہ بناتا ہو، جس کی بدولت الگ ہو جانے والی
ستوں کے کندھوں پر اتنا بوجھ نہ پڑتا ہو کہ خود اٹھایا نہ جا سکے، جو اپنے نتیجہ کے طور پر
م آدمیوں کی زندگی کو نئی ریاستوں کے اندر ایک لامحدود زمانے کے لئے دکھ اور مصیبت
زندگی نہ بنا دے، جو اطالیہ کی طرح اپنے اپنے ہم مذہبوں سے آباد علاقوں پر قبضہ
نے کی کوشش ہندو اور مسلمان ریاستوں میں نہ پیدا کر دے، اور جو غصہ اور جوش
حالت میں نہ سوچا گیا ہو اور دائمی تکرار اور جنگ کا دروازہ نہ کھول دے۔

باب (۳)

مُسلمان: ایک علیحدہ قوم

علیحدگی کو ضروری اور حق بجانب ثابت کرنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ یہ دکھا دیا جائے کہ ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قوم نہیں ہیں۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ خود مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کو علیحدہ ریاست بنانے کی ضرورت ہے۔ مسٹر درانی نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "قدیم زمانے سے ہندو ایک قوم نہیں تھے۔ وہ محض ایک جماعت تھے، بس ایک انسانی گلہ۔

"ہندستان کے مسلمان بھی کچھ ان سے بہتر نہ تھے۔ اسلام فی الحقیقت ایک ریاست بن گیا تھا مگر اپنے بانی کے زمانے میں۔ اس کے پاس ایک بالکل واضح سیاسی فلسفہ ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اسلام خود ایک سیاسی فلسفہ ہے .... میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ اسلامی ریاست ایک من جانب اللہ حکومت ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست ایک جمہوری حکومت ہوتی ہے جس کے قیام و استحکام کے لئے ہر مسلمان ذمہ دار ہے۔ "لا اسلام الا بجماعۃ" بغیر ایک منظم جماعت یا سماج کے اسلام نہیں ہوتا یہ حضرت فاروق اعظم کا مقولہ ہے۔ یہ بدقسمتی تھی کہ اسلامی ریاست زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ بنوامیہ اور بنوعباس نے اس کو مٹا ڈالا اور ریاست کو ملک بنا دیا یعنی خودمختار شخصی موروثی بادشاہت .... انہی دو شخصی سلطنتوں کے عہد حکومت میں مسلمانوں کی جماعت کے اندر دو ایسے عنصر داخل ہوئے کہ جنھوں نے اس کی سیاسی زندگی کو خراب اور برباد کر ڈالا اور وہ عناصر علم الہٰی اور تصوف تھے .... ان دونوں چیزوں نے مل کر مسلمانوں کے ضمیر کو گمراہ کر دیا اور اسلام کو ایک اخلاقی سیاسی فلسفہ سے ایک قسم کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا۔ کچھ ایسی چیز جسے سیاسی صدائیں لگانے والے خدا اور بندہ کا نجی تعلق کہتے ہیں ......

.... جس زمانے میں کہ مسلمانوں نے ہندستان فتح کیا ہے تو اس وقت سیاسیات اور مذہب کا باہمی تعلق تمام دنیا میں منقطع ہو چکا تھا۔ جن لوگوں نے ہندستان کو فتح کیا تھا وہ کسی اسلامی ریاست کی قومی فوج نہ تھے بلکہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی تنخواہ دار فوج تھے۔ انہوں نے ہندستان میں جو ریاست قائم کی وہ بھی قومی اسلامی ریاست نہ تھی۔ بلکہ انہوں نے قبضہ کیا، قبضہ کو قائم رکھا اور ملک سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور یہ سب کچھ ایک مطلق العنان بادشاہ اور اس کے درباریوں کے لئے کیا گیا۔ ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت صرف اس معنی میں اسلامی تھی کہ وہ شخص جس کے سر پر تاج تھا اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔

ہندستان کے اندر اپنی حکومت کے پورے دور میں مسلمانوں کے اندر کبھی قومیت کا احساس نہ پیدا ہوا .... اس طرح یہاں دو جماعتیں تھیں ہندو اور مسلمان جو کہ دوش بدوش رہتی تھیں اور دونوں یکساں طور پر ایک شاہنشاہانہ مطلق العنانی کی غلامی کرتی تھیں، اور دونوں کی دونوں ہر قسم کے قومیت کے احساس اور قومی حوصلہ مندی سے بالکل عاری تھیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی خیالات، معتقدات اور رسم و رواج کی نامطابقت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے....... پھر بھی ان سب باتوں کے باوجود دونوں کے مذہب میں کچھ ایسی بات ضرور ہے جس نے ان دونوں جماعتوں کو کئی صدیوں تک خوش گوار تعلقات کے ساتھ اکٹھا رہنے پر مائل کر دیا، اور وہ بات ایسی ہے کہ اگر انگریزوں کی حکومت کے ماتحت دونوں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ سب کچھ کسی طرح بھلایا جا سکے، اور ایک مرتبہ پھر وہی مذہبی ذہنیت پیدا کی جا سکے۔ جو ایک صدی پہلے ان کے باپ دادا کی تھی، تو یہ دونوں جماعتیں پھر اسی خوش دلی کے ساتھ اچھے پڑوسیوں اور ایک ہی ریاست کے شہریوں کی طرح مل جل کر رہ سکتی ہیں۔ یہ "کچھ ایسی چیز" درحقیقت رواداری کی وہ روح ہے جو دونوں مذہبوں میں دل نشین کر دی گئی ہے .... اگر دونوں جماعتوں کے یہ باہمی تعلقات منقطع ہوئے بغیر جاری رہتے تو کافی وقت گزرنے پر ایک متحدہ قوم جس کے دل اور روح میں سب ایک ہوتیں ہندستان کی سرزمین پر پیدا ہو جاتی۔

کاش وہ دن پھر واپس آ سکتے![1]

اس طرح باوجود اتنے مذہبی تعلقات اور ہمدردانہ میل جول کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل الگ رہے۔ دونوں دھارے مل کر ایک دریا نہ بن سکے وہ دو قومیتیں تھیں اس قدر ایک دوسرے سے مختلف کہ اگر کبھی ان کے دلوں میں وہ جذبہ جسے سیاسی فلاسفر قومی شعور سے تعبیر کرتے ہیں بیدار ہو کر انھیں خواب سے چونک بھی دیتا تو دونوں میں ردِ عمل مختلف قسم کا نمایاں ہوتا۔ وہ الگ الگ دو قومیں بن جانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے۔ کیونکہ قومیت صرف اسی کا نام ہے کہ جداگانہ قومیت کا احساس قوی تر ہو جائے۔[2] اب یہ چیز ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں پر طاری ہے دونوں جماعتوں میں خودی کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ دو الگ الگ قومیں بن گئی ہیں اور جب تک کہ وہ اپنے تمام تعلقات اس نئی روشنی کی مطابقت سے از سرِ نو درست نہ کریں گی اس وقت تک دونوں میں امن و صلح کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔"[3]

اس کے بعد مسٹر درانی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ خرابی کس طرح رونما ہوئی اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "مختصر یہ ہے کہ یہ انگریزوں کی فرق و امتیاز کی حکمت عملی کی بدولت وجود میں آیا ہے کہ انھوں نے ایک جماعت کو نقصان پہنچا کر اور دبا کر دوسری جماعت کو نوازا۔"

"ہندوؤں اور مسلمانوں کا احساس قومیت بہت آہستہ آہستہ بڑھا ہے اور

---

[1] ایف کے درانی کی کتاب "دی مینگ آف پاکستان" (The Meaning of Pakistan) صفحہ ۳۴ - ۴۴۔

[2] ایف کے درانی کی کتاب " ۴۷

[3] " " " " " ۴۸

کوئی خاص تاریخ نہیں بتائی جا سکتی کہ جب سے وہ یقینی طور پر قومی ہو گیا ہو۔ سب سے پہلے وہ اقتصادی رقابت کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ رقابت خصوصیت کے ساتھ سرکاری نوکریوں کے متعلق تھی جو بعد کو سیاسی رقابت میں تبدیل ہوئی اور بالآخر اس نے قومی عداوت کی شکل اختیار کر لی۔[۵]"

ان بہت سی چیزوں کے تذکرہ کے ضمن میں کہ جو مسلمانوں کو دبانے اور تباہ کرنے میں مددگار ہوئیں وہ حسب ذیل چیزوں کا ذکر کرتے ہیں:-

(۱) بنگال میں صنعت و حرفت اور تجارت کی تباہی۔

(۲) دوامی انتظام کا قانون جس کی بدولت چھوٹے چھوٹے مال گذاری کے ہندو محصل تو زمیندار بن گئے اور بڑے بڑے مسلمان مال گذاری کے افسر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیئے گئے اور ان کی جگہ یورپین افسروں کو مل گئی۔

(۳) مسلمانوں کے ان اوقاف کی ضبطی کہ جن پر مسلمانوں کی تعلیم منحصر تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

(۴) اپنے تعلیمی نظام کی بربادی کے بعد مسلمان اس قابل نہ رہے تھے کہ سرکاری ملازمتوں میں اپنی جگہ قائم رکھتے اور اس کی وجہ سے ہندوؤں کا تمام سرکاری دفاتر میں ترجیح پانے کا تنہا اجارہ دار بن جانا۔ جو اجارہ داری آج تک ذلیل چالاکیوں اور ادنیٰ قسم کی سازشوں کے ذریعے برقرار رکھی گئی ہے۔ ملازمتوں کے اندر یہ فرقہ وارانہ عدم مساوات ہندوستان کی سیاسیات کا اہم ترین جزو بن گئی ہے اور فرقہ وارانہ تعلقات کو ناخوشگوار بنانے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ساتھ ہی ساتھ بنگال اور شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک جارحانہ ذہنیت

---

[۵] ایف کے درانی کی کتاب دی مینگ آف پاکستان" (The Meaning of Pakistan) صفحہ ۴۸

(۴) ہندوؤں کی اپنی گذشتہ تاریخ سے دل چسپی جس نے ایک بہت ہی اہم عنصر ایسا مہیا کر دیا کہ جس کی غیر موجودگی نے انھیں اب تک ایک قوم بن جانے سے باز رکھا تھا۔ اگرچہ یہ عنصر اس نظام تعلیم کی بدولت پیدا ہوا جو انگریزوں نے اس ملک میں رائج کیا تھا اور جس میں تاریخ کی ایسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں کہ جو یا تو انگریز سیول افسروں نے لکھی تھیں یا عیسائی مشنریوں نے اور جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بٹھائی جائے اور زہر بھر دیا جائے۔

(۶) ودگاؤ کشی کے خلاف تحریک کہ جو اس مذہبی مجنون مرہٹہ بال گنگادھر تلک نے چلائی تھی جو ایک نئی سیواجی کی تہذیب کا بانی تھا اور کانگریس کی اگلی صف کے لیڈروں میں سے تھا۔[۱]"

یہ وہ مختلف اسباب تھے جن کی بنا پر سر سید احمد خاں نے اپنی پالیسی اختیار کی اور جنھوں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو یہ مشورہ دیں کہ کانگریس سے علیحدہ رہیں اور اس مشورہ دینے میں اس اثر کو بھی بہت بڑا دخل ہے جو بنگال کے ہندو اخبارات نے ان کے دل پر ڈالا تھا جن میں کہ رنگ آمیزی کر کے مسلمانوں کو باغی ثابت کیا جاتا تھا۔ اور حکومت سے یہ درخواست کی جاتی تھی کہ اس بنا پر مسلمانوں کو حکومت کی نوکریوں سے دور رکھا جائے۔[۲]"

اس طرح ۱۸۵۷ء سے بعد کے زمانے میں کبھی ہندو اور مسلمانوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ وہ ایک قوم ہیں اور سر سید احمد خاں نے حکومت کو اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو بھی متنبہ کر دیا کہ حکومت میں نمایندہ جماعتوں کا ہونا صرف ان ملکوں کے لئے موزوں ہوتا ہے جن کی آبادی متحد النسل ہو لیکن ہندستان میں جس کی آبادی بہت سے غیر جنس عناصر پر مشتمل ہے۔ پارلیمانی ادارے صرف اسی صورت میں رائج کئے جا سکتے

---

[۱] درانی صفحہ ۶۸

[۲] درانی صفحہ ۷۴

[۳] " " ۷۰

اور ایک سیاسی رقابت دونوں فرقوں کے درمیان نشو ونما پاتی جارہی ہے جس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے۔

(۱) بندے ماترم کے گیت میں جو جذبہ پنہاں ہے۔

(۲) ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد دونوں فرقوں میں جو بیگانگی اس طرح پیدا ہوگئی کہ غدر کی ابتدا تو ہندوؤں نے کی اور مسلمان ان کے ساتھ شریک ہوگئے اور جب وہ ہنگامہ دبا دیا گیا تو ہندوؤں نے اپنے ان ساتھیوں سے کہ جو شانہ بشانہ اور دوش بدوش ان کے ساتھ ساتھ لڑے تھے غداری کی اور مخبر اور جاسوس بن گئے اور حکومت کا تمام قہر و غضب تنہا مسلمانوں کے حصہ میں آیا اور ہزارہا مسلمان اس قتل عام میں کہ جو غدر کے دب جانے کے بعد وقوع میں آیا تباہ و برباد ہوگئے۔ ان کی جائدادیں ضبطی میں آگئیں اور ان کے یتیم بچے عیسائی پادریوں کے حوالے کر دئے گئے۔

(۳) بنارس کے ممتاز ہندوؤں کی ۱۸۶۷ء کی یہ تحریک کہ اردو جو ملک کی مشترکہ زبان بن چکی تھی مٹادی جائے اور اس کی جگہ برج بھاشا رواج پائے اور عربی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پون صدی تک لگاتار ہندوؤں کی یہ کوشش رہی کہ اردو نہ سیکھیں اور اس کی بجائے ہندی کو رواج دیں۔ یہاں تک کہ مسٹر گاندھی کہ جو ہندو ذہنیت کو دوسروں کی بہ نسبت ان معاملات میں زیادہ سچائی کے ساتھ ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ کسی شرم کے بغیر کہہ بیٹھے کہ "تمام ایسے الفاظ ہندستانی زبان میں سے نکال دینے چاہئیں جو ہندوؤں کو اس بات کی یاد دلاتے ہیں کہ کبھی اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کہ وہ اس ملک میں موجود ہیں[1]۔"

---

[1] درانی صفحہ ۶۷

ہیں کہ سخت سماجی اور سیاسی خطرات انگیز کیے جائیں۔[1] "لیکن جب ۱۹۰۷ء میں یہ معلوم ہوا کہ عوام کی مجالس شوریٰ بن ہی رہی ہیں تو مسلمانوں کے ایک وفد نے مسلم فرقے کے لیے جداگانہ نمایندگی کا مطالبہ کیا اور وہ انھیں مل گئی۔

"یہ خیال کرنا تو فضول ہے کہ اگر حلقہ ہائے انتخاب جداگانہ نہ ہوتے تو ایک متحدہ اور یک جنس قوم پیدا ہو جاتی۔ اس کی بجائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں پر ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو جاتا۔[2]"

"اگرچہ ہندوؤں میں سیاسی بیداری سے قبل ہی نئی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے لیکن ۱۹۰۶ء تک ہندوؤں نے گاندھی جی کے فرقہ داری سے برتر قومیت کے تخیل کو قبول نہیں کیا تھا اور ہر شخص اس وقت تک کھلے طور سے ہندو تھا یا مسلمان اور فرقہ وارانہ کا لفظ اس وقت تک گالی نہیں خیال کیا جاتا تھا، اور ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے حریف سے اخلاق رواداری اور ہمدردانہ خیالات کے ساتھ مل جل سکتے تھے۔ اس خیال کا اظہار ہندو سبھا میں بھی کہ جو پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں قائم ہوئی اور بعد ازاں آل انڈیا تنظیم ہو گئی کیا گیا تھا اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بھی جس کا قیام ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا۔

سر سید احمد خاں کی زیر ہدایت مسلمانوں کی پالیسی جو انگریزوں کے مظالم کے خوف سے بنی تھی وہ وفاداری اور ذلیل خوشامد کی پالیسی تھی۔ یہ پالیسی وراثتاً ان لوگوں کو بھی جو علی گڑھ اسکول کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں اگرچہ وہ حالات جن کی وجہ سے یہ پالیسی بنی تھی دور ہو چکے تھے[3] مسلمانوں کی وفاداری کو (۱) طرابلس

---

[1] درانی صفحہ ۷۰ [2] درانی صفحہ ۷۹

[3] " " ۸۳

سنہ ۱۹۱۱ء میں اطالوی حملے اور حکومت برطانیہ کے اس میں شریک ہونے سے (ب) سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ سے (ج) سنہ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں میں ریاست ہائے بلقان کے ترکی پر حملہ آور ہونے سے کہ جس حملہ کو برطانیہ کی پوری اخلاقی تائید حاصل تھی (د) کانپور میں مسلمانوں کے قتل عام سے جبکہ انھوں نے ایک مجوزہ سڑک کو نکالنے کی مخالفت کی تھی، بار بار دھکے لگے، اور ان دھکوں کے اثر سے مسلم لیگ کے زاویہ نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی جبکہ ایک ذمہ دار خود اختیاری حکومت کے حصول کو اپنا نصب العین بنایا اور اس طرح اپنا عقیدہ بھی کانگریس سے مطابق کردیا۔ یہ دونوں جماعتیں اپنے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد کرتی رہیں یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے وہ مشہور میثاق لکھنؤ مرتب کیا جو حکومت ہند کے سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون میں شامل کرلیا گیا۔ مسلم فرقے کے ساتھ اس میثاق یا معاہدہ نے اگرچہ کوئی انصاف نہیں کیا تھا لیکن اس کی دفعات اس لئے بہت دوررس اثر رکھتی ہیں کہ میثاق لکھنؤ میں کانگریس نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں۔ اور جس طرح کانگریس ہندوؤں کی نمایندہ ہے اسی طرح مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت کی نمایندگی کرتی ہے۔ اس درجے سے کانگریس اب پیچھے ہٹ گئی ہے، اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ پورے ہندستان کی نمایندہ جماعت ہے۔"[۵]

"گذشتہ جنگِ عظیم قومیت کے احساس کی غیر معمولی زیادتی کا نتیجہ تھی اور اس نے اس جذبہ کو اور بھی کچھ خونخوار بنادیا اور ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ اس نے ان قوموں کے خون میں بھی یہی جذبہ داخل کردیا کہ جو اس زہر سے اس وقت تک محفوظ تھیں۔ اس نے ہندستان کے آدمیوں میں غیروں کی غلامی سے آزاد ہوجانے کی ایک

---

[۵] درانی صفحہ ۸۴ - ۸۵

پر زور خواہش پیدا کی اور آزادی کی یہ لگن ہی تھی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک کے لئے ممکن بنا دیا۔[1] لیکن مسٹر گاندھی اور ان کے رفقائے کار کی قومیت کے دل چسپ منظر سے ایسے محو ہوئے کہ گویا بالکل کھوئے ہی گئے۔ کانگریس کے پنڈتوں نے اعلان کر دیا کہ مذہب کو سیاسیات میں دخل نہ ہونا چاہیئے اور کانگریس نے ایک متحدہ ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی کہ جس کی بنیاد جغرافیائی حالات اور سیاسی اور اقتصادی کیفیات پر ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کانگریس نے یہ فرض کر لیا کہ ایسی ایک قوم بنی بنائی موجود ہے۔ یہ پہلے سے فرض کر لینا قطعاً غلط نکلا۔ بنیادیں ٹیڑھی تھیں اور قومیت کی وہ شاندار عمارت جو کانگریس نے ان بنیادوں پر کھڑی کرنے کی کوشش کی تھی تین برس سے کم ہی میں زمین بوس ہو گئی۔ .... مہاتما جی جیل میں بھیجدیئے گئے اور ہندو مسلم اتحاد کا تماشا ختم ہو گیا۔ سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ جیل خانے سے باہر آئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی شرم و حیا کے بغیر علی الاعلان تبلیغ شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی از سرِ نو تنظیم ہوئی .... سنہ ۱۹۰۷ء اور سنہ ۱۹۱۵ء میں جو پالیسی طے پائی تھی کہ دوسرے فرقوں کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندوؤں کے مفاد کی حفاظت کرنا وہ اب ترک کر دی گئی اور ایک نیا نصب العین تیار ہوا کہ ہندوستان ہندوؤں کی مقدس سرزمین ہے، اور ہندو بطور خود ایک قوم ہیں اور اس قوم میں مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؛ اور ہندوؤں کا سیاسی مطمح نظر ہندو راج ہے۔[2]

سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک ہندو تحریر جس کا نام "میرے وچار" تھا اور جو لالہ ہردیال

---

[1] درانی صفحہ ۹۰ [2] درانی صفحہ ۹۱-۹۲

آنجہانی نے لکھی تھی اور جسے وہ اپنی پیاسی انجیل کہتے تھے۔ ہندستان میں پہنچی اور اسے ہندو اخبارات نے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک اشاعت دی۔ اس کے بعد مسٹر درانی نے اس تحریر سے چند اقتباسات مسٹر اندرپرکاش کے حوالے سے کہ جنھوں نے انہیں اپنی کتاب "وہیر دی ڈِفر" (**Where we differ**) میں لکھا ہے اور ڈاکٹر امبیڈکر کے حوالے سے کہ جنھوں نے انھیں اپنی کتاب "تھاٹس آن پاکستان" (**Thoughts on Pokistan**) میں لکھا ہے، دیئے ہیں۔ میں اصل تحریر کے الفاظ میں ان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ریاست صرف ہندوؤں کی ہونی چاہیئے اور مسلمان اس میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ریاست ایک مسلمانوں کی ریاست نہیں ہو سکتی اور نہ ایسی ریاست ہو سکتی ہو کہ جس کا انتظام ہندو اور مسلمان مل کر کریں۔ .... سوراج حاصل کرنے کے لئے ہمیں مسلمانوں کی مدد کی ضرورت نہیں ہو۔ نہ ہماری یہ خواہش ہو کہ ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے .... ہندستان کی اور پنجاب کی ہندو قوم کا مستقبل ان چار ستونوں پر منحصر ہے :-

(۱) ہندو سنگھٹن۔

(۲) ہندو راج۔

(۳) مسلمانوں کی شدھی۔

(۴) افغانستان اور علاقہ سرحد کی فتح اور شدھی۔[ل]

یہ وہ نصب العین ہیں جو سنہ ۱۹۲۴ء سے اس وقت تک ہندو مہا سبھا کی پالیسی ہی

[ل] مسٹر ای ڈی ساورکر کی سنہ ۳۷ء کے ہندو مہا سبھا کے احمد آباد والے اجلاس کی تقریر جو کہ مسٹر درانی نے اپنی کتاب "دی مینگ آف پاکستان" میں نقل کی۔ صفحہ ۱۰۲۔

حاوی رہا ہے اور اس کے ثبوت میں مسٹر درانی نے مسٹر ساورکر کے بیانات سے لمبے چوڑے اقتباسات دیئے ہیں مثلاً "اب ہندستان کو متحدالجنس اور واحد قوم نہیں خیال کیا جا سکتا بلکہ اس کے برعکس اس میں دو خاص قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں"۔ یہاں پر مسٹر درانی لکھتے ہیں کہ "مسٹر ساورکر کا دعویٰ تاریخ کے واقعات کے اور سیاسی نظریئے کے بالکل مطابق ہے اور اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ بحث و تکرار کا موقع اس وقت آتا ہے کہ جب وہ خود اپنے ہی دعوے سے انحراف کرنے لگتے ہیں۔ ایک سیاسیات کا ماہر تو یہی کہے گا کہ جبکہ دو قوموں میں جداگانہ قوم ہونے کا احساس پیدا ہو گیا ہے جیسا کہ اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں میں ہے تو اب وقت آگیا ہے کہ اندرونی جھگڑے اور خانہ جنگیاں مٹانے کے لئے وہ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور الگ الگ اپنی اپنی قومی حکومتیں بنائیں۔ یہی آل انڈیا مسلم لیگ کا بھی جھگڑا ہے۔ مگر مسٹر ساورکر ایک مرتبہ جغرافیائی اجتہاد سے قومیت کی تعمیر کے خیال کو باریک بینی کے ساتھ مسترد کر دینے کے بعد پھر اسی جغرافیائی سبب کا سہارا ڈھونڈنے لگتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تمام ہندستان ہندو قوم کی میراث ہے اور اسے ہندوؤں کا مقدس ملک بنا دیتے ہیں اس لئے وہ ایک ایسی حکومت کو اپنا نصب العین بناتے ہیں کہ جس میں تمام ہندستان میں ہندوؤں کا راج ہو اور مسلمان ان کے زیر حکم اور ماتحت ہوں۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حکمران قوم تو ہندو ہوں اور مسلمانوں کو ماتحت قوم کا درجہ ملے۔[۵]

انڈین نیشنل کانگریس کی حالت بھی کچھ اس سے بہتر نہیں ہے۔ کانگریس کا وجود ہندوؤں کی سیاسی بیداری کی تحریک کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آیا تھا۔ حقیقت

---

[۵] درانی صفحہ ۱۰۵

یہ ہے کہ اسی سے ہندو قوم کی بنیاد پڑی۔ یہ سچ ہے کہ اس کی تاریخ کے ابتدائی دور میں کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن سوائے ایک مختصر سی مدت کے اس کی یہ خصوصیت کہ وہ ایک ہندو جماعتی تنظیم ہے کبھی دور نہ ہوئی اور اس کا یہ پیدائشی نشان آج تک اس کے چہرے پر نمایاں ہے۔[۵۱] اس بات کو کانگریس نے اس وقت جبکہ اس نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے میثاق پر دستخط کئے تھے کھلے طور پر تسلیم کیا تھا۔ وہ مختصر زمانہ کہ جب کانگریس ایک متحدہ جماعت تھی وہ تھا کہ جب عدم تعاون کی تحریک مسٹر گاندھی اور علی برادران کی قیادت میں چلائی گئی تھی لیکن یہ تحریک سخت ناکام رہی اور مسلمانوں کو اس سے بہت ہی نقصان پہنچا۔ اس زمانے میں بھی ہندو مسلم اتحاد کے پردے میں کہیں کہیں سوراخ نظر آتے تھے۔ مسٹر گاندھی کی نظر ہندوؤں کی ذہنیت پر بہت گہری ہے۔ انہیں کبھی ہمت نہ ہوئی کہ کسی ایسے معاملے میں بھی جب کہ انھیں معلوم ہو کہ ہندو غلطی پر ہیں عام ہندوؤں کی رائے کا مضحکہ اڑائیں وہ اس سے بہت زیادہ عقلمند ہیں کہ ان کے دل میں ہندوؤں کے ایسے توہمات کی جیسی کہ گئو پوجا ہے کوئی وقعت ہو۔ مگر ہندو عوام کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ کہا ہے کہ اگر سوراج ذبح کئے جانے سے گاؤں کو نہ بچا سکا تو وہ سوراج اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔[۵۲]

۱۹۲۳ء میں جب کہ ہندو مہا سبھا کی پھر سے تنظیم ہوئی تو ہندو راج کے قیام کے لئے جو کہ اس کا مطمح نظر تھا سہ گانہ پروگرام بنایا گیا۔ اگرچہ مسلمان اقلیت میں ہیں پھر بھی وہ اپنی جنگی شجاعت کی وجہ سے ہمیشہ فوقیت کے حامل رہے ہیں اور ہندو اپنی

---

[۵۱] درانی صفحہ ۱۰۹ [۵۲] درانی صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۱ -

کثیر تعداد کے باوجود ان کے سامنے بالکل بھیڑیں بنے رہے ہیں۔[۱] ہندو مہا سبھا نے جب ۱۹۲۳ء میں اپنا نصب العین مقرر کیا تو ہندوؤں کے اندر جارحانہ روح پھونکنے اور ہندوؤں کے دل سے اس خوف کو دور کرنے کے لئے جو مسلمان کا نام سنتے ہی ان پر طاری ہو جاتا تھا ایک نرالی تجویز سوچی۔ اس نے ملک کے طول و عرض میں باقاعدہ منظم فسادات کا ایک سلسلہ شروع کرا دیا گویا اس طرح خون کی ہولی کھیلنے کے میدان میں مسلمانوں کے مقابلہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چھوٹے پیمانے پر شہروں کی گلیوں میں معرکہائے جنگ کے نمونوں کے سوانگ دکھائے گئے .... جس وقت تک کہ ہندوؤں کے دل پر مسلمانوں کا خوف طاری تھا تو فسادات نہ ہو سکتے تھے۔ فسادات اس تعلیم کے سبق تھے جس کے ذریعہ سے ہندوؤں کو جنگ جو بنایا جا رہا تھا۔[۲] پنڈت مالویہ خاص طور پر اس تنظیم کے کے لئے ذمہ دار تھے جیسا کہ ان کے ان دوروں سے ظاہر ہوتا ہے جن کے حالات اس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ پنڈت مالویہ کے کسی شہر میں دورہ کرنے کے چند ہی ہفتوں کے بعد اس شہر میں خونریز فسادات برپا ہوتے تھے۔[۳] جب مسٹر گاندھی ۱۹۲۴ء میں جیل سے باہر آئے تو ملک پر پنڈت مالویہ کی ٹولی کی سیاسیات کا غلبہ تھا اور ان کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ صورتِ حالات کا مقابلہ کرتے .... مہاتما جی نے آگ کو بجھانے کی کوئی کوشش نہ کی اور متواتر پانچ سال تک مالویہ جی کی بدعقلی کو ہندوؤں کی سیاسی زندگی کی رہنمائی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔[۴] (۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک) ہندوؤں کی یہ خواہش تھی کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کریں اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کام میں مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہوں۔ لہٰذا جیسی کہ ہندوؤں کی عادت

---

۱ درانی صفحہ ۱۱۳ — ۲ درانی صفحہ ۱۱۴

۳ درانی صفحہ ۱۱۵-۱۱۶۔ — ۴ " " ۱۱۶

ہے انھوں نے پوشیدہ طریقے پر جلسہ کرکے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے خلاف جو خوف
دلانے والی مہم جاری ہے اسے روک دیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ فسادات ایک دم سے
بند ہو گئے۔[1] مسٹر گاندھی دم بخود بیٹھے رہے اور انہوں نے اس خونین ڈرامے کو ر
کے لئے جو تمام ہندستان میں پنڈت مالویہ، لالہ لاجپت رائے اور دوسرے مہاسبھ
کھیل رہے تھے اپنی ایک انگلی تک نہ اٹھائی۔ اور جب وہ ۱۹۳۰ء کے اختتام
قریب اپنے گوشۂ بے تعلقی سے نکلے تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک لی
نہ بنے جیسے کہ وہ پہلے تھے بلکہ صرف ہندو فرقے کے لیڈر بن کر نکلے۔ جب ا
مہاتماجی نے ہندو قومیت اور ہندو راج کے متعلق مالویہ جی کا اصول قبول کر
اب خود پنڈت مالویہ نے تماشا گاہ چھوڑ دی اور قومی زندگی سے بے تعلق ہو
نجی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس دن سے برابر مسٹر گاندھی تنہا ہندو فرقے کے لیڈ
رہے ہیں جس کا انہوں نے کئی مرتبہ اعتراف کیا ہے اور کانگریس بھی اپنی پالیسی
لحاظ سے اور تقریباً مکمل طور پر اپنی رکنیت کے لحاظ سے خالصاً ہندوؤں کی قو
جماعت ہو گئی ہے۔[2] مہاسبھا اور کانگریس کے درمیان کام کرنے والوں کا تبا
عمل میں آتا رہتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک تجو
مسترد کر دی جس کے مطابق کانگریس کے ممبروں کے لئے مہاسبھا کا ممبر بن جانا نا
ہو جاتا اور اسی طرح مہاسبھا کے ممبر کانگریس کے اندر نہ گھس سکتے، لیکن مسلم لی
کے متعلق یہ ممانعت پورے طور پر نافذ ہے۔[3] ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک مسٹر گا
کا چولا بدلنے کا زمانہ تھا اور اس مدت کے بعد وہ ہر لحاظ سے پورے ہندو لیڈ
بن کر نکلے۔[4] اور اس کے بعد سول نافرمانی کی جو تحریک انہوں نے شروع کی تو اس

---

[1] درانی صفحہ ۱۱۷ [2] درانی صفحہ ۱۱۸ [3] درانی صفحہ ۱۲۰ [4] درانی صفحہ ۱۲۳-۱۲۴

مسلمان پورے طور پر علیحدہ رہے۔ قبل اس کے کہ مسٹر گاندھی گول میز کانفرنس کے لئے ۱۹۳۱ء میں جائیں ایک کوشش کی گئی تھی کہ ہندو مسلمانوں میں باہم کچھ سمجھوتا ہو جائے لیکن مسٹر گاندھی نے عین وقت پر غلہ مار دیا اور کہہ دیا کہ مسلمانوں کو پہلے وہ مطالبے پیش کرنے چاہئیں جن پر ان سب کا اتفاق ہو کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ مٹھی بھر نام نہاد قوم پرور مسلمان جنھیں وہ اپنی جیب میں لئے پھرتے تھے دوسروں کے ساتھ اتفاق نہ کر سکیں گے۔[1]

۱۹۳۵ء کے دستور کے بعد مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کی تجویز پاس کی تاکہ اس نئے دستور کو چلایا جا سکے اور مسٹر جناح نے اس وجہ سے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کا مسلک اور نصب العین ایک ہے یہ امید باندھی کہ کانگریس انتخابات میں لیگ کی مخالفت نہ کرے گی.......... لیکن کانگریس خم ٹھونک کر سامنے آگئی لیگ کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کئے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے جواب دیا کہ ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگریس اور ایک برطانوی حکومت۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کو انتخاب میں بہت زبردست کامیابی نصیب ہوئی لیکن وہ فقط ہندو حلقہ ہائے انتخاب تک محدود تھی۔ چار سو بیاسی مسلمان نشستوں میں سے کانگریس نے صرف اٹھاون نشستوں پر مقابلہ کی جرات کی تھی جن میں سے بھی تینیس پر وہ ناکام رہی۔ اس کامیابی کی وجہ سے ان کے دماغ بگڑ گئے اور توازن ہی جاتا رہا اور انھوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے یا کم از کم اتنا ہو کہ وہ بطور ایک سیاسی جماعت کے کام کرنا بند کر دے۔ مسلمان عوام تک پہنچنے کی تحریک شروع کی گئی اور مسلمانوں سے یہ درخواست کی گئی کہ مسلمان اپنا فرقہ وارانہ نشان چھوڑ کر کانگریس میں فرداً فرداً داخل ہو جائیں۔

---

[1] درانی صفحہ ۱۲۶

یہ درخواست صرف مسلمانوں سے کی گئی تھی اور ہندوؤں کو اجازت تھی کہ وہ بیک وقت کانگریس اور ہندو مہا سبھا دونوں کے ممبر ہو سکتے ہیں۔[1] کانگریس نے ان صوبوں میں کہ جن میں اسے اکثریت حاصل ہے حکومت بنانے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ اس بات کی ضمانت نہ دی جائے کہ صوبوں کے گورنر ان صوبوں میں اپنے ان اختیارات خصوصی کو کام میں نہ لائیں گے جو انہیں نئے دستور کے مطابق اقلیتوں کی حفاظت اور دوسری مخصوص اغراض کے لئے دئے گئے تھے۔[2] جنگ کے بادل سر پر ہونے کی وجہ سے حکومت نے امن قائم رکھنے کی غرض سے کانگریس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مطلوبہ ضمانت دے دی اور مسلمانوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ دغا کی۔ کانگریس نے حکومت کی کرسی پر بیٹھتے ہی پہلے یہ اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کو وزارت کے کابینہ میں شامل کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ اسی بنا پر اڑیسہ کے کابینۂ وزارت میں کوئی مسلمان نہ لیا گیا اور ایسا موقع بھی جلد ہی تلاش کر لیا گیا کہ صوبۂ متوسط کو بھی اس کے مسلمان وزیر کی موجودگی سے پاک کر دیا جائے۔ دوسرا اعلان کانگریس نے یہ کیا کہ وہ مسلمان وزراء کو اپنے کابینہ میں اس شرط پر لے گی کہ وہ اگر کسی دوسری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو وہاں سے استعفا دیں اور کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کریں۔[3]

"لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کانگریسی حکومت مسلمانوں کے حق میں سخت نامنصف اور ظالم تھی۔ ہندو اکثریت والے صوبوں کے ہندوؤں کو یہ احساس ہو گیا اور انھوں نے ایسا برتاؤ کرنا شروع کیا کہ گویا ہندو راج قائم ہو گیا ہے۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔کانگریسی وزیروں نے احکام نافذ کئے کہ تمام سرکاری عمارتوں اور

---

[1] درانی صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸ [2] درانی صفحہ ۱۲۹ - ۱۳۰ [3] درانی صفحہ ۱۳۱

اسکول پر کانگریسی جھنڈا لہرایا جائے .... انھوں نے یا تو حکم دیا یا اس بات کی اجازت دی کہ بندے ماترم کا ترانہ جو کہ ہندو راج کے حاصل کرنے کا۔ اور مسلمانوں سے نفرت کا نشان تمام سرکاری اجتماعوں کے موقعوں پر گایا جائے۔ یہاں تک بھی ہوا کہ بعض کانگریسی حکومت والے صوبوں کی اسمبلیاں اپنی کارروائی بندے ماترم کے ترانے سے شروع کرتی تھیں۔[1]

مسلمانوں پر من حیث الجماعت خوف طاری کرنے کی مہم اور منظم فسادات جو پنڈت مالویہ نے ایسے زور شور سے جاری کئے تھے اور جو ۱۹۲۳ء تک جاری رہے اب پھر شروع کر دیے گئے جس کی تفصیل شریف رپورٹ کی دو جلدوں میں اور مسٹر فضل الحق اور خان صاحب عبد الرحمٰن خاں کی رپورٹ میں موجود ہے۔[2]

کانگریسی حکومتوں نے ہندو مجرموں کو سزا سے محفوظ رکھنے کے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ یہ تھے کہ

(۱) ماتحت افسروں کو اس بات کی ترغیب دلائی جاتی تھی کہ وہ فریقین میں اس صورت سے سمجھوتہ کرا دیں کہ مسلمان اپنا گاؤ کشی کا حق چھوڑ دے اور معافی مانگ لے اور

(۲) پولیس کو مقدموں کی تفتیش میں دیر لگانے کی اجازت دے دی جاتی تھی تاکہ شہادت نہ ملنے کی وجہ سے مجرم بالکل صاف بری ہو جائے۔ مجسٹریٹوں کے تبادلے عمل میں آ جاتے تھے اور مسلمانوں کے محلوں میں تعزیری پولیس بٹھا دی جاتی تھی۔

اس کے بعد مسٹر درانی نے ہائی کورٹ کے ایک فیصلے سے لمبا چوڑا اقتباس نقل

---

[1] درانی صفحہ ۱۲۹-۱۳۰، [2] درانی صفحہ ۱۳۱

کیا ہے جس میں کہ چندر سپوا کے مقدمہ میں ملزم کو بری کر دیا گیا تھا اور کچھ مسلمانوں کو پھانسی کی اور بعض کو حبس دوام کی سزا ایک ہندو کو قتل کر دینے کے لئے ہوئی تھی۔ اس مقدمے کی سماعت کرنے والا سیشن جج اتفاق سے ایک انگریز تھا۔ مسٹر درانی نے اس پر اس طرح اظہارِ رائے کیا ہے کہ "اگر صوبہ متوسط کے وزیرِ اعظم کو شرم کا کوئی احساس تھا تو وہ یا تو خودکشی کر لیتا یا کم سے کم ہمیشہ کے لئے پبلک زندگی سے علیحدہ ہو جاتا۔ مسٹر یوسف شریف کو تو اس لئے برخاست کر دیا گیا کہ انہوں نے ایک ایسے قیدی کو چھوڑ دیا جس نے اپنی سزا کا زمانہ تقریباً پورا کر لیا تھا۔ مگر کانگریس نے پنڈت شکلا (وزیرِ اعظم) سے کچھ نہ کہا جنہوں نے شہریوں کی زندگی کے خلاف ایسی قابلِ نفرت سازش کی تھی۔۔۔۔۔۔۔ مسٹر گاندھی کانگریس کے ڈکٹیٹر اور پنڈت شکلا کے مربی رات دن سچائی، اور عدم تشدد اور اپنی باطنی آواز کا ذکر کرتے رہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ قادرِ مطلق خدا کبھی ایسے منافقوں سے باتیں نہیں کرتا ہے، اور مسٹر گاندھی کی اندرونی آواز کسی اور ہی کی آواز ہوتی ہوگی۔ بہرحال انصاف اور حکمرانی کی ایسی مثالوں کو دیکھتے ہوئے ہندستان کے مسلمان کبھی اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ ہندوؤں کی رعایا بن کر رہیں[۵]"

مسٹر درانی کانگریسی حکومت کی مظالم کی داستان جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض مقامات پر مسلمانوں کا اذان دینے یا اپنی خوراک کے لئے گائے ذبح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ان کی مسجدیں اور قبرستان دوسرے کاموں میں لائے گئے تھے جن کی واگذاشت کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن مسلمانوں کو غیر مسلم بنا دینے کی اور ان کے تہذیبی اور سماجی اتحاد کو تباہ و برباد کر دینے کی سب سے

---

[۵] درانی صفحہ ۱۳۴ - ۱۳۵

زیادہ عیارانہ اور مکمل تجویز........ تعلیم کی وردھا اسکیم تھی جو کہ مستقبل کی کانگریسی حکومت جبریہ طور پر تمام باشندگان ہند پر نافذ کرتی اور جس کا ایک نمونہ صوبہ متوسط میں ودیا مندر اسکیم کی صورت میں عمل میں آیا تھا۔[1] ان تمام مصیبتوں کے بعد کانگریسی حکومتوں کا استعفیٰ مسلمانوں کے حق میں ایک آیۂ رحمت کے طور پر وقوع میں آیا۔ اس کے بعد انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور مسٹر کرپس اپنی پیش کش لے کر آئے جس کی شرائط نیابۃً یقیں لیکن دودھ کے اندر ایک یہ مکھی پڑی ہوئی تھی کہ اس میں اس بات کے امکانات تھے کہ مسلم ہندستان الگ ہو جائے اور ایک آزاد خودمختار اسلامی ریاست قائم ہو سکے اور اس مکھی کو کانگریس نہ نگل سکی۔"

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ۸ اگست ۱۹۴۲ء کا "کھلی بغاوت" کا ریزولیوشن جاپان کے لئے ایک کھلی ہوئی دعوت تھی جس کی فوجیں سرحد کے اس پار اس بات کی منتظر کھڑی تھیں کہ کب موقع ملے اور سرحد کو پار کر کے ملک پر قبضہ کریں۔ اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اگست کا ریزولیوشن ہندستان کے ساتھ انتہائی غداری تھی اور یہ غداری خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ تھی جنھیں جاپان کے ساتھ ایسا کوئی انس نہیں ہے جیسا کہ ہندوؤں کو ان کے دعوے کے مطابق ہے۔[2] اپنے تمام عہدِ حکومت میں لارڈ لنلتھگو کی حکومت نے صرف ایک مرتبہ فوری اور موثر کارروائی کی اور مسٹر گاندھی کے ڈراما پر پہلے ہی ایکٹ میں ڈراپ سین پڑ گیا۔ ہندستان کے مسلمان پھر ایک مرتبہ ہندو راج کے رحم و کرم سے محفوظ ہو گئے۔"[3]

"اگرچہ اسلام صرف ایک اخلاقی اور سیاسی فلسفہ ہے ہندستانی مسلمان عام طور پر کمزور سیاسی مدبر رہے ہیں۔ لیکن جس دنیا میں کہ وہ رکھے گئے تھے وہ انھیں کب

---

[1] درانی صفحہ ۱۳۵-۱۳۶ [2] درانی صفحہ ۱۳۹-۱۴۰ [3] درانی صفحہ ۱۴۱

چھوڑتی تھی، اور ہندوؤں نے جو من حیث المجموع جنگ ان کے خلاف شروع کر دی تھی۔ اس نے انھیں اچھی طرح جھنجوڑ ڈالا۔ ۱۹۳۷ء میں ہم انھیں بیدار اور حیرت زدہ پاتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ہم اُن کے اندر اس احساس کی ابتدائی علامات دیکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ قومیت میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی سال کے اختتام کے قریب یہ آوازیں کانوں میں آنے لگتی ہیں کہ ہندستان میں دو قومیں ہیں اور مسلمان الگ بجائے خود ایک قوم ہیں۔[۱] اور اس لئے مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پاس کیا ہوا پاکستان کا ریزولیوشن صرف ان کے سیاسی معتقدات کا اظہار تھا جسے قبول کر لیا گیا۔[۲] اس طرح مسٹر درانی کی اتنی تحریر کے مطابق ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ ہندستان کے مسلمانوں نے ایک جداگانہ قوم ہونے کے احساس کو تسلیم کیا، اور اس وقت سے انہیں پاکستان کی دُھن لگ گئی اور اس چیز نے مسلمانوں کے تخیل میں آگ لگا دی ہے۔ انہیں پاکستان کے تخیل میں عجیب عجیب اور لامحدود امکانات نظر آرہے ہیں کہ جو کبھی خواب میں بھی نہ گذرے تھے۔ ان کے خیال میں پاکستان ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں نہ ظلم ہوگا نہ ناانصافی نہ ناجائز استفادہ، اور جو خود غرضانہ حرص اور لالچ اور مفلسی کے خوف سے بالکل پاک ہوگی جس میں باوجود اس کے اسلامی ریاست ہونے کے یا اسی سبب سے کہ وہ اسلامی ریاست ہوگی اس کے شہریوں میں مسلم و غیر مسلم کا امتیاز شہری حقوق اور اقتصادی فوائد کے معاملات میں نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اسے "حکومت الٰہی" یعنی خدا کی سلطنت کہتے ہیں جس کا ترجمہ بعض کم فہم لوگوں نے یہ کیا ہے کہ اس کا انتظام براہِ راست خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن ایک اسلامی ریاست ایسی ریاست نہیں ہوا کرتی کہ جس کا

---

[۱] درانی صفحہ ۱۵۳ - ۱۵۴۔ [۲] درانی صفحہ ۱۵۵۔

انتظام خدا کی طرف سے ہوتا ہو۔۔۔۔۔۔ اسلامی ریاست ایک ایسی جمہوری ریاست ہوتی ہے جس کے باشندے یہی محسوس کرتے ہیں اور اس کا اعلان کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ "حکومت ہمارا نام ہے"۔ [۵۱]

میں نے مسٹر درانی کی کتاب سے اتنے لمبے چوڑے اقتباسات اس لئے نہیں کئے ہیں کہ میں ان کے بیان کو یا ان نتائج کو جو انہوں نے اخذ کئے ہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں ان میں سے بہت سے بالکل ظاہری طور پر مضحکہ انگیز اور اشتعال انگیزی کی حد تک جھوٹے ہیں۔ میں نے تو اقتباسات اس لئے کئے ہیں کہ انہوں نے ایک باقاعدہ طریقے پر یہ بیان کیا ہے کہ دو قوموں کے نظریئے کی تشکیل کس طرح عمل میں آئی۔ نیز اس لئے کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ پہلے صاحب تھے جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ فرقے ہونے کی بجائے دو الگ الگ قومیں ہونے کے متعلق ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ اور یہ ظاہر کیا تھا کہ چونکہ وہ دو جدا جدا قومیں ہیں اس لئے کسی عہدنامے کے ذریعے سے ان کو ایک متحدہ قوم نہیں بنایا جا سکتا۔ اور یہ کہ ہندو مسلم مسئلے کا قدرتی اور موثر حل یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی سی ایک جماعت دوسری جماعت کو یا تو اپنے اندر جذب کر لے یا اسے ناپید کر دے یا کسی دوسرے طریقے پر اسے غیر ضرر رساں بنا دے۔۔۔۔۔۔ چونکہ میں خود مسلمان قوم کا ایک رکن ہوں اس لئے قدرتی طور پر میں نے اسی بات پر بحث و تکرار کی ہے کہ مسلمانوں کو پھر سے ہندستان کو اسلام کے لئے فتح کرنا چاہیئے اور اسی آرزو کو اپنا سیاسی نصب العین بنا لینا چاہیئے۔ میری رائے اب بھی وہی ہے کیونکہ میرا ایمان ہے کہ ہندستان کو قطعی طور پر سیاسی نجات صرف اسلام ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے"۔ [۵۲]

---

[۵۱] درانی صفحہ ۱۵۰۔ ۱۵۶ [۵۲] درانی صفحہ ۱۴۶

باب (۴)

یک قومی اور چند قومی

ہمیں اب جس چیز پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ۱۹۳۸ء سے ہندستان کے مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا شعور پیدا ہو گیا ہے تو آیا دو علیحدہ علیحدہ ہندو اور مسلمان ریاستوں کی تعمیر سے مسئلہ کا حل بھی نکل آئے گا اور ان دونوں قومی ریاستوں میں اقلیتوں کی حالت بہتر بھی ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں یہ مفید ہوگا کہ مغربی ممالک کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو جو کیفیات ماضی قریب میں وہاں گزری ہیں ان سے سبق حاصل کیا جائے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر وسطِ یورپ کی سلطنتوں کو توڑ کر کئی ایک نئی نئی ریاستیں بنا دی گئی تھیں کوشش یہ کی گئی تھی کہ تاحدِ امکان ایسی ریاستیں بنائی جائیں جن میں متحد الجنس آدمی آباد ہوں۔ اس کے نتیجے کے طور پر بہت سی قومیں جو جنگ سے پیشتر اقلیت میں تھیں۔ اب ان نئی ریاستوں میں کہ جن کے نام سے موسوم کر دی

گئیں اکثریت میں تبدیل ہو گئیں۔ اور قطع و برید سے پہلے جو قومیں اکثریت میں تھیں اب اس کاٹ چھانٹ کے بعد نئی ریاستوں میں اقلیت میں رہ گئیں۔ چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی کی وجہ سے دنیا کے امن میں فتور پڑے گا اس لئے اقلیتوں کے ساتھ اکثریت کے برتاؤ کو ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا گیا اور نئی ریاستوں میں اکثر سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان کی ریاستوں میں جو اقلیتیں آباد ہیں ان کے تحفظ کے متعلق عہدنامے لکھیں۔ ان عہدناموں کا نام "دی مائناریٹی ٹریٹی" (The Minority Treaty) ہے اور انجمن اقوام ان معاہدوں کی ضامن بنی۔

تقسیم ہند کا منشا یہ ہے کہ الگ الگ مسلمانوں اور ہندوؤں کی ریاستیں بن جائیں اسی طرح جیسے یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد بنائی گئی تھیں تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو اپنی اپنی ریاست میں اپنی تہذیبی، اپنی روحانی، اپنی اقتصادی اور اپنی سیاسی زندگیوں کو ترقی دینے کا اپنی عقل کے مطابق موقع ملے اور وہ اپنے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کر سکیں۔ یہ مقصد ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے اگر وہ کبھی حاصل ہو سکے۔ ہندو اور مسلمان آبادی اس ملک میں اس طرح واقع ہوئی ہے اور اس طرح ایک دوسرے میں ملی جلی ہے کہ ملک کے کسی حصے میں بھی ہندوؤں یا مسلمانوں کی متحد الجنس ریاست کا بنانا اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے کہ ہر ریاست کے اندر ایک اچھی خاصی بڑی اقلیت دوسری قوم کی بھی اس میں آجائے۔ ہندو اور مسلمان ریاستیں جو خاص طور پر اور کھلم کھلا مذہب کی بنیاد پر بنائی جائیں گی تو وہ لازمی طور پر ہندوؤں کی قومی، اور مسلمانوں کی قومی ریاستیں کہلائیں گی اور اس نہج پر تشکیل پا کر ان کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ اپنے آپ کو اس نفسیات اور اس فسفہ سے محفوظ رکھ سکیں جو اس قسم کی قومی ریاستوں پر حاوی ہوتے ہیں۔ میکارٹنے (Mac-artney) کا مقولہ ہے کہ "جب تک کہ اکثریت والی قومیں کہ جن کے ہاتھ

میں مختلف ریاستوں کی (ہندستان کے لحاظ سے یوں کہا جا سکتا ہی کہ ہندو ریاستوں میں ہندو اور مسلم ریاستوں میں مسلمان) حکومت کی باگ ہی اپنی اس نظریاتی لحاظ سے بے معنی اور عملی لحاظ سے ناممکن الحصول کوشش میں لگی رہیں گی کہ اپنی اپنی ریاستوں کو اپنے قومی نصب العین اور قومی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے آلۂ کار بنا لیا جائے اس وقت تک اقلیتوں کی حیثیت ان ریاستوں میں ایسی رہے گی کہ جسے بین الاقوامی تحفظات کا کوئی نظام بھی قابل برداشت نہیں بنا سکتا ہے[۱] ایک قومی ریاست اور قومی اقلیتیں ایسی چیزیں ہیں کہ باہم جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس مسئلہ کے سلجھانے کے دو طریقے ہیں:۔

ایک تو یہ ہی کہ اقلیت سے پیچھا چھڑا لیا جائے اور یہ یا تو اس طرح ہو سکتا ہی کہ

(۱) ریاست کے حدود ایسے مقرر کئے جائیں کہ اقلیتیں اس کے اندر آنے نہ پائیں۔

(ب) آبادی کا باہم تبادلہ عمل میں لایا جائے[۲]

دوسرا طریقہ یہ ہی کہ ریاست کی بنیاد ہی بدل دی جائے تاکہ وہ ایک بلا قومی یا چند قومی ریاست بن جائے۔

---

[۱] سی اے میکارٹنے (C. A. Macartney) کی کتاب نیشنل اسٹیٹس اینڈ نیشنل مائنارٹیز" (National States & National Minorities) صفحہ ۴۲۱۔

[۲] ڈاکٹر امبیدکر جنہوں نے کہ پاکستان بنائے جانے کی حمایت کی ہی کہتے ہیں کہ "فرقہ وارانہ مسئلہ کا بہترین حل یہ ہی کہ دو ایسے فرقوں کو جن میں سے ایک اکثریت میں ہو اور دوسرا اقلیت میں تنہا ایک قوم کے فولادی شکنجے میں جکڑ کر ایک دوسرے کے مقابلے میں نہ چھوڑا جائے" اور اگر نئے سرے سے جغرافیائی حد بندی کرنے پر بھی کہ جس میں (باقی صفحہ ۵۶ پر)

ہندو اور مسلمان پورے ہندستان میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں اور آپس میں اس قدر ایک دوسرے کے ساتھ ملک بھر کی آبادی میں سلے جُلے ہیں کہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہندستان کے کسی حصے کو ایک علیحدہ ریاست بنایا جائے اور اس کے اندر اقلیت والی قوم کی ایک قابلِ لحاظ تعداد نہ آ جائے۔ یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلمہ ہے اور اس لئے یہ تجویز صرف مسلمان ریاست ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ان دونوں ریاستوں کے متعلق ہے کہ جن میں ہندو اور مسلمانوں کی اکثریت ہو اور ہر ایک میں ایک ایک اقلیت دوسری قوم کی موجود رہو۔ اس طرح ملک کو اس طرح پر تقسیم کرنا کہ متحد الجنس قوم کا کوئی علاقہ بن سکے ناممکن ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۵) صوبے کے وہ حصے پاکستان سے نکال دیئے جائیں کہ جہاں غیر مسلم اکثریت ہو اور آبادی کا تبادلہ کرنے پر بھی مقصد نہ حاصل ہو سکے تو پھر پاکستان کی تجویز ان برائیوں کو دور نہیں کر سکتی جو فرقہ وارانہ مسئلہ کے دل کے اندر جڑی ہے۔ اور اس لئے وہ دونوں چیزیں یعنی سرحدوں کی تجدید اور آبادی کا باہمی تبادلہ حل کے طور پر تجویز کرتے ہیں اور ان دونوں کو وہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے قابل عمل سمجھتے ہیں۔ لیکن ہندستان کے متعلق ان کے پاس بھی ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک ہندوؤں کی متحد الجنس ریاست بنائی جا سکے ایسی کہ اس میں مسلمانوں کی اچھی خاصی بڑی اقلیت موجود نہ رہے۔ وہ یہ کہنے پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ مسئلہ کا بہت ساحصہ تو حل ہو جاتا ہے اور ہندوؤں کو بھی یہ مفید ہی معلوم ہوگا کہ دشواری اس حد تک کم ہو جاتی۔ (ڈاکٹر امبیدکر کی کتاب پاکستان آر دی پارٹیشن آف انڈیا (Pakistan or the Partition of India) باب ۶ دفعات ۲ و ۳ صفحات ۹۵ تا ۱۰۷)

جہاں تک سرحدوں کی تجدید کا سوال ہے میں نے خود بھی (ر باقی صفحہ ۷۵ پر)

کیا جنیت کا اتحاد آبادی کے تبادلے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے؟ سوائے ڈاکٹر ایس اے لطیف اور ڈاکٹر امبیدکر کے اور کسی نے اس قسم کی تجویز پیش نہیں کی ہے۔ مسٹر جناح نے لیگ کے لاہور والے اجلاس میں مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنے خطبۂ صدارت کے ضمن میں کہا تھا کہ "گر ہندستان کی جسمانی تقسیم ہو جانے پر آبادی کے تبادلے کے مسئلہ پر جہاں تک کہ وہ قابل عمل ہوگا غور کیا جائے گا"[۱] دوسرے ارباب فکر نے اسے ناممکن العمل خیال کیا ہے۔ کیونکہ

---

[۱] "اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح" (The Speeches and Writings of Mr. Jinnah) طبع ثالث صفحہ ۱۵۸۔

(بقیہ صفحہ ۵۶) اس پر غور کیا ہے کہ لیگ کے ریزولیوشن کا منصفانہ مطلب سمجھ کر حد بندی کس طرح ہونا چاہیئے، لیکن مسٹر جناح کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مہاتما گاندھی سے گفت وشنید کے موقع پر موجودہ حدوں کے برقرار رکھنے پر زور دیا تھا جہاں تک آبادی کے تبادلے کا تعلق ہے یہ کہنا کافی ہے کہ ڈاکٹر امبیدکر کی مجوزہ حدود مقرر کر کے بھی ان غیر مسلموں کی تعداد کہ جو شمال مغربی اور مشرقی مسلم ریاستوں سے تبادلہ کے لئے اخراج پائیں گے ایک صوبے سے اکسٹھ لاکھ سے کچھ زیادہ اور دوسرے سے ایک کروڑ چوبیس لاکھ ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر امبیدکر نے یہ کہاں سے معلوم کیا ہے کہ ترکی یونان اور بلغاریہ میں جب آبادی کا تبادلہ عمل میں آیا تھا تو طرفین سے دو دو کروڑ آدمی تبدیل کئے گئے تھے۔ ان تینوں ریاستوں کی پوری مردم شماری ہی کل کر میکارٹنے کے دئے ہوئے اعداد کے مطابق ساڑھے تیس لاکھ سے کچھ اوپر ہی میکارٹنے نے لکھا ہے کہ جو کمیشن بلغاریہ اور یونان میں باہم تبادلۂ آبادی پر مقرر ہوا تھا اس سے صرف ایک لاکھ چون ہزار چھ سو آدمیوں سے واسطہ پڑا تھا جنھوں نے تبدیل وطن کیا تھا اور اسی طرح ترکی اور یونان کے تبادلے میں صرف پانچ لاکھ بنتالیس ہزار پانچ سو اکیاون آدمیوں نے گھر چھوڑا تھا۔

تبدیلِ وطن کرنے والوں کی تعداد بہت کثیر ہوگی، نیز اخراجات کی زیادتی، تکالیف سفر، اور جبریہ کہ ہندو اور مسلمان جو بھی تبدیلی وطن کریں گے ان کی اپنی زمینوں کے ساتھ محبت سب امورمانع آنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں یورپ کی اقلیتوں کے تجربات قابلِ لحاظ ہیں۔

صلح کے عہدناموں کے مطابق آبادی کے جبریہ اور رضاکارانہ دونوں طرح کے تبادلوں کے تجربے کئے گئے تھے۔ میکارٹنے (Macartney) نے لکھا ہے کہ حقیقتاً خوشی سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد بہت ہی قلیل تھی، اور رضامندی کا باہمی تبادلہ جیسا کہ عہدنامے میں تجویز کیا گیا تھا۔ بجز چند مثالوں کے اور کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔[۵۱] اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ ہندستان میں ایسا نہ ہوگا۔ لیکن یونان اور ترکی کے مابین ایک جبریہ تبادلہ بھی عمل میں آیا تھا۔ میکارٹنے (Macartney) نے لکھا ہے کہ "اس قسم کا تجربہ جیسا کہ آبادی کے تبادلے کو اقلیت کے مسئلے کا حل بنانے کے متعلق حاصل ہوا ہے اس کے متعلق یہ اندازہ نہیں ہے کہ دوبارہ یا دوسرے مقامات پر اس کا اعادہ کرنے کی اس سے ہمت افزائی ہوئی ہے۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے بعد ترکی اور بلقانی ریاستوں میں غیر معمولی حالات رونما تھے اور بہتر حالات میں آبادی کے تبادلے سے جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طریقہ بنیادی طور پر جبر و قوت کا طریقہ ہے۔ اگر حالات پرسکون ہیں، اور اکثریت اور اقلیت کے درمیان تعلقات خوشگوار، تو پھر تبادلے کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے حالات میں لوگوں سے رضاکارانہ تبادلۂ وطن کی درخواست کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل سکتا۔ افراد کی مرضی کے خلاف جبریہ طور پر تبادلہ کرانا مسلمہ طور پر ایک ظالمانہ فعل ہے۔ اور تجربے نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خوشی کے ساتھ تبادلۂ وطن کبھی واقع نہیں ہوتا۔ بجز ان صورتوں

---

[۵۱] میکارٹنے (Macartney) صفحہ ۴۴۰-۴۴۱۔

کے جن کا نام خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ فی الحقیقت جبر ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ تو معلوم ہو چکا کہ تبادلے کا عمل مصیبتوں سے علیحدہ رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ تکلیفیں لوگوں کو اس وقت دی جائیں کہ جب ان کے جذبات مشتعل ہوں یا پرسکون حالت میں۔[۱]

ان سب باتوں کی بنا پر میکارٹنے (**Macartney**) اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "تمام ایسی کوششیں جو اقلیت کے مسئلے کو اس طور پر حل کرنے کے متعلق کی گئی ہیں کہ اقلیت سے پیچھا چھڑا لیا جائے انتہا سے زیادہ ہمت شکن ثابت ہوئی ہیں........ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملی جلی آبادی کی ریاستوں کو اپنی اقلیتوں کے پیہم اور مسلسل دباؤ کا خوگر بننا لازمی ہے........ ہمارے زمانے کی مشکلات لفظ قومی ریاست کے اس زمانے کے مفہوم کی پیدا کی ہوئی ہیں یعنی یہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ ریاست کے تمام باشندوں کا سیاسی نصب العین اور اکثریت والی قوم کا قومی اور تہذیبی نصب العین ہم معنی اور ایک ہی چیز ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ان دو چیزوں کے درمیان جو بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں خلطِ مبحث دور ہو جائے تو پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ کیوں ایک کوڑی بھر مختلف قومیتوں کے لوگ بھی ایک ہی ریاست کے اندر کامل اتفاق و اتحاد کے ساتھ نہ رہ سکیں، اور کیوں ان میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی قوم بھی ان اخلاقی پستیوں کا شکار ہو جو آج ہر اقلیت والی قوم کا حصہ بن گئی ہیں۔ آج بھی یورپ کے اندر ایسی بعض ریاستیں ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو قومی ریاست بنانے سے بچایا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ان میں اقلیتوں کی موجودگی کے باوجود اقلیتوں کا کوئی حقیقی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔[۲] یہاں پر اس نے سویٹ یونین کی مثال دی ہے۔ اس نے ایک نظر ہندستان کے

---

[۱] میکارٹنے (**Macartney**) صفحہ ۴۴۸ - ۴۴۹

[۲] " " ۴۵۰

مسئلے پر بھی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف ہندستان کے حکمران انگریزوں کا بلکہ خود ہندستان کی دیسی آبادی کا اس میں کوئی نقصان نہ ہوگا اگر وہ یورپ کی اقلیتوں کی تاریخ کا مطالعہ غائر نظر سے کریں۔ ہندستان کے موجودہ زمانے کے حالات میں دو بالکل الگ الگ جھگڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک جھگڑا تو دیسی باشندوں اور انگریزوں کے درمیان ہے اور دوسرا ہندوؤں کا جھگڑا مسلمانوں سے ہے (ان لا تعداد باتوں کا ذکر ہی فضول ہے جو چھوٹی چھوٹی قوموں سے متعلق ہیں) چونکہ ہندستان میں انگریز ہندستان کی کوئی دیسی قوم نہیں ہیں اور نہ اتنے کثیر التعداد ہی ہیں بلکہ ایک غیر ملکی حکومت کے نمایندے ہیں اس لئے پہلا جھگڑا اس جھگڑے سے بہت کچھ مشابہ ہے جو میگیار (Magyars) قوم نے ہیبسبرگ کے ایوان (House of Habsburg) کیخلاف برپا کیا تھا۔ اور ہندستان کے مسلمانوں نے جو حمایت برطانوی حکومت کی لی ہے وہ اس دوستی کی یاد دلاتی ہے جو ہیبسبرگ اور جرمنوں کے اور ہنگری کے کروٹوں (Croats of Hungary) کے درمیان متعدد مرتبہ قائم ہوتی رہی تھی۔ اور بالکل اس طرح جس طرح کہ میگیاروں اور ہنگری کی قوموں کا آپس کا جھگڑا اس وقت تک اپنی انتہائی ترقی تک نہ پہنچا تھا جس وقت کہ ہیبسبرگ نے ہنگری کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا اپنا حق نہ چھوڑ دیا، ہندستان میں انگریزوں کی موجودگی دیسی قوموں کے سچے تصادم کو التوا میں ڈالے ہوئے ہے۔ جب ہی کہ ہندستان کو زیادہ حقیقی خود مختار حکومت مل جائے گی تو تصادم ان چند اندرونی جھگڑوں سے زیادہ مشابہ ہو جائے گا جن کی وجہ سے مشرقی یورپ کی ریاستیں جدا جدا ہو گئیں۔۔۔۔۔۔ خدا سے دُعا کرنی چاہیے کہ وہ لوگ جو تاریخ کو پڑھیں ان کو اتنی عقل ہو کہ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔"[1] اس قسم کے ایک سبق کا ذکر میکارٹنے نے کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ جسے اگر

---

[1] میکارٹنے (Macartney) صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۱

ہم ہندستانی یاد کریں تو اچھا ہی۔ جبکہ میگیار قوم اور ہیبرگ کے درمیان علانیہ لڑائی شروع ہوگئی تو کروٹوں نے اور تقریباً اور بھی تمام اقلیتوں نے حکومت کا ساتھ دیا اور میگیار مغلوب ہو گئے۔ ہنگری پر ایک مرکزی اور جرمن بنانے والی دفتری حکومت کے ذریعہ دیانا سے ایسی حکومت ہونے لگی جس سے نہ میگیار مطمئن تھے نہ سلیوونک (Slavo-nics) اس صورت حال پر ایک ظریف الطبع میگیار نے اپنے ایک کروٹ دوست سے کہا کہ جو کچھ ہمیں (بغاوت کی) سزا کے طور پر ملا وہی تمہیں (حکومت پرستی کے) انعام کے طور پر ملا ہی۔[1]

اس لئے ہندستان کے مسئلے کا حل الگ الگ ہندو اور مسلمانوں کی ایسی ریاستیں بنانے کی بجائے کہ جن میں پھر بھی دوسرے فرقے کی ایک خاصی بڑی اقلیت موجود ہوگی کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہندستان کو یونہی ایک بلاقومی ریاست رہنے دیا جائے جیسا کہ وہ ہی اور گذشتہ زمانے میں رہ چکا ہی؟ لیگ کی اس خواہش کی عمر کہ مسلمانوں کی الگ ریاستیں ہونی چاہئیں ابھی چھ سال کی بھی نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ وہ اسی قدر صدیوں کی تاریخ کو بیچ میں سے کاٹے دے رہی ہے۔ اس لئے مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ الگ الگ قومی ریاستیں بنیں بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہندستان میں بلاقومی ریاست کو مضبوط بنایا جائے اور اس میں سے وہ علامات اور وہ نشانات دور کر دئیے جائیں جو اس کی بلاقومیت کی خصوصیت کو کم کرتے ہوں۔

میرے لئے یہ بہترین بات ہوگی کہ اس بحث کو لارڈ ایکٹن (Lord Acton) کی کتاب کے ایک اقتباس پر ختم کروں (جن کی کتاب سے دو قوموں کے نظریئے کے حامیوں نے بھی اقتباسات کئے ہیں) جس پر میکارٹنے اپنی کتاب کو ختم کرتا ہی۔[2]

اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ شہری سماج کا مقصد فرائض کی ادائیگی کی آزادی حاصل کرنا ہی

---

[1] میکارٹنے صفحہ ۱۱۸ [2] میکارٹنے صفحہ ۵۰۱۔

تو ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ریاستیں اپنے وجود کے لحاظ سے سب سے زیادہ مکمل ہیں جو اپنے اندر مختلف، الگ الگ قوموں کو ان پر ظلم کئے بغیر شامل رکھتی ہیں۔ ایسی ریاستیں کہ جن میں کئی قومیں شامل نہیں ہیں، نامکمل ہیں، اور وہ جن میں کہ اس قسم کی کوششیں ناپدید ہوگئی ہیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ ایک ایسی ریاست کہ جو مختلف قوموں کو مطمئن کرنے کے ناقابل ہو اپنے آپ کو قصوروار بنا لیتی ہے اور ایسی ریاست کہ جو ان کو بے اثر کرنے، اپنے اندر جذب کرنے یا ریاست سے خارج کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ اپنے زندہ رہنے کی طاقت کو گھٹا لیتی ہے، اور ایسی ریاست کہ جو اپنے اندر انہیں شامل ہی نہیں کرتی وہ حکومت خود اختیاری کے بنیادی عنصر سے محروم ہے۔"

باب (۵)

اسی تصویر کا دوسرا رُخ

گذشتہ صفحات میں ہم بہ کثرت ایسی باتیں پڑھ چکے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ ہیں اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ لیکن ایک دوسرا زاویہ یہ بھی ہے کہ جس سے اس تصویر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آیئے اس پر ایک نظر ادھر بھی ڈالیں۔ اس معجون مرکب کی ترکیب میں کہ جسے ہم "قوم" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں بے شمار انسانی کارگذاریاں انسانی خواہشات اور انسانی جذبات شامل ہوتے رہے ہیں۔ زبان، مذہب، فنون لطیفہ، قانون، حتیٰ کہ انسانی خوراک نشست و برخاست، دسترخوان کے آداب، لباس اور کھیل بھی جولین ہکسلے کے قول کے مطابق اپنا اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔[۱] اچھا پھر جب ہم اس جماعتی جذبے کا کہ جس کا نام "قومیت" ہے

---

[۱] جولین ہکسلے (Julian Huxley) کی کتاب "ریس اِن یورپ" Race in Europe. (صفحہ ۳۱)

تجزیہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد کسی ایسی چیز پر ہے جو جسمانی یگانگت کی بہ نسبت بہت زیادہ وسیع ہے لیکن جس کی تعریف آسانی سے نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی ملک میں مقررہ جغرافیائی حدود کے اندر آباد ہونا، آب و ہوا کی کیفیات جن کے ساتھ ایک مخصوص طرزِ زندگی شامل ہو، روایات کہ جو رفتہ رفتہ مشترک بن جاتی ہیں، سماجی ادارے اور تنظیمیں، مشترک مذہبی وظائف حتیٰ کہ مشترک تجارتیں اور پیشے، یہ سب ان بے شمار اجزا میں سے ہیں جو باہم مل کر کم و بیش قومی جذبے کی تعمیر کرتے ہیں۔ مشترکہ زبان ایک بہت ہی اہم جزو ہے اور اس کو "ایک خون" ہونے کے فرضی اعتقاد سے بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن ان تمام جذبات میں جو کہ قومی اتحاد کی پرورش کرتے ہیں۔ جسمانی، یا بلکہ تاریخی یگانگت کے رشتہ سے بھی زیادہ قوی وہ ردِ عمل ہے جو بیرونی مداخلت کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ تمام دوسرے اجزا کی بہ نسبت اس چیز نے ہمیشہ جماعت بنا لینے کے احساس کو زیادہ ترقی دی ہے بیرونی دباؤ ہی غالباً وہ سب سے بڑا عنصر ہے جو تن تنہا قومی تشکیل کے عمل میں ترقی کا باعث ہوتا ہے۔"

اب یہ مناسب ہوگا کہ ہم ان میں سے بعض اہم عناصر کو لے کر دیکھیں کہ انھوں نے ہندستان کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں پر کیا اثرات ڈالے ہیں۔

۱۔ مذہب

میں سب سے پہلے مذہب کو لیتا ہوں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندستان کے ہندو اور مسلمان مختلف مذاہب کے پیرو ہیں اور یہ کہ ان کی سماجی زندگیاں اپنے اپنے مذہب کے

۵ل جولین ہکسلے (Julian Huxley) صفحہ ۹ و ۱۵

اثر سے بنی ہیں۔ یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ ان کی بعض مذہبی رسمیں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور بظاہر ایسی ہیں کہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھا سکتیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ بہت سی حقیقی اور بنیادی باتوں میں ان کے باہمی اختلافات اس سے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ ایک ہی مذہب کے نام لیوا دو آدمیوں میں ہوا کرتے ہیں اور جو ان اختلافات کے باوجود ایک قوم کے نام سے نہایت خوشگوار تعلقات کے ساتھ امن چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی مسجد کی اندرونی سخت سادگی کہ اس میں چٹائی کے مصلوں اور وضو کے لوٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس کا ہندوؤں کے تکلفات سے کہ جن میں آراستہ بت اور پوجا کے سازوسامان کی افراط ہوتی ہے۔ میل نہ کھانا اس بے جوڑی سے کچھ زیادہ نہیں ہے جو ہمیں ایک پروٹیسٹنٹ (Protestant) یا پریسبائی ٹیرین (Presbyterian) عیسائی گرجا میں کہ جس میں عبادت کرنے والوں کے لئے نشستوں اور واعظ کے منبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ایک رومن کیتھولک (Roman Catholic) گرجا کی شاندار آراستگی اور بت اور تصاویر اور شمعوں میں نظر آتی ہے۔ خود مسلمانوں کے اندر ایک کٹر سنی محرم کی شان و شوکت اور سازوسامان کو جس میں شیعوں کے تعزیے اور تابوت اور سہرے اور علم اور پیک اور بہشتی شامل ہوتے ہیں تقریباً اسی خوف کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ گویا وہ ہندوؤں کے درگا کی مورتی کے جلوس کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود آج تک کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انگلستان کے پروٹیسٹنٹ (Protestant) اور کیتھولک (Catholics) ایک قوم نہیں ہیں یا یہ کہ سنی اور شیعہ دو جدا جدا قومیں ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ایسے فرقے موجود ہیں جو دوسرے فرقوں کے مندروں اور بتوں اور پوجا کی مختلف رسموں پر معترض ہوتے ہیں لیکن پھر بھی دونوں ہندو ہیں۔

بیرونی علامتوں اور نشانیوں، رسموں اور رواجوں، اور مذہبی عبادتوں اور

پوجا پاٹ کے طریقوں سے قطع نظر دونوں مذہبوں کے فلسفیوں سے دنیا آشنا ہے جو زندگی اور موت اور حیات بعد الممات کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئے ہیں اور جنھوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت خدا کی وحدانیت کے اعتقاد کا، روح کے غیر فنا پذیر ہونے کا، دنیا اور دنیا کی تمام مادی اشیاء کی دوروزہ زندگی کا، اور روحانی اشیاء کی ابدی قدر و قیمت کا اعلان کیا ہے۔ ہندوؤں کا ویدانت کا فلسفہ اور مسلمانوں کا تصوف، بلا لحاظ اس امر کے کہ انھوں نے ایک دوسرے سے تلقین حاصل کی ہے یا دونوں ایک ہی سرچشمہ سے فیض یاب ہوئے ہیں ابدی سچائی کی تلاش و جستجو میں ایک ہی نقطہ کی طرف کو جھکے ہیں۔ ایک ایسی شخصیت جیسی کہ ڈاکٹر بھگوان داس کی ہے جو کہ دونوں فلسفوں کے علم کے ماہر ہیں بہ آسانی دونوں مذہبوں کی مستند کتابوں سے متوازی بیانات چھانٹ کر پیش کر سکتی ہے۔ ان کی زبان سے یہ سنئے۔

"مسلمانوں کے طریق معرفت کا تیسرا غیر ملکی ماخذ ہندستانی تھا۔ اس سے پہلے کے بابوں میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندستان اور خلیج فارس کے درمیان قریبی تجارتی تعلقات تھے اور اشیائے تجارت کے ساتھ ساتھ بلاشبہ خیالات کا بھی تبادلہ ہوا کرتا ہے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جہاں مادی استعمال کی اشیاء مثلاً ہندستانی فولاد اور تلواریں۔ اور ہندستانی سونا اور جواہرات، نیز فنون لطیفہ کی دلچسپی کی چیزیں مثلاً رنگین محرابیں اور بڑے بڑے برج فارس اور عراق میں پہنچ گئیں وہاں لازمی طور پر فلسفیانہ خیالات بھی پہنچے ہوں گے۔ بہت سے ہندستانی بنو امیہ کے ابتدائے سلطنت میں مالیات کے محکمہ میں مختلف عہدوں پر مامور تھے۔ خلیفہ معاویہ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہندستانیوں کی ایک پوری بستی شام کے علاقے میں بالخصوص انتوش اور جہج کے مقامات پر بسائی تھی، اور انھیں کاشغر میں بھی آباد کرایا تھا خلافت کے شہروں میں سیاہ آنکھوں اور زیتونی رنگ والا ہندو مسلمانوں کے

شانہ بشانہ اور دوش بدوش رہتا تھا۔ سلطنت کے مشرقی علاقے یعنی خراسان، افغانستان، سیستان، اور بلوچستان اسلام قبول کرنے سے پیشتر بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ بلخ میں ایک بڑی خانقاہ (وہار) تھی جس کا منتظم برمک کہلاتا تھا۔ اسی کی اولاد بعد میں عباسی خلفاء کے عہد میں برمکی وزیروں کے نام سے مشہور ہوئی۔

"پھر یہ بھی ہے کہ عربوں نے ابتدائی زمانے ہی سے ہندستانی ادب اور علوم سے خود کو آشنا کرلیا تھا۔ انھوں نے سنہ ۲ھ میں بدھ مذہب کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مثال کے طور پر "کتاب البد" اور "بلادر و بداسف" "علم نجوم کے رسالے اور طب کی کتابیں جن کا نام سند ہند (سدھانت) اور "ششرو" (سسرت) اور سرک (چرک) تھا، قصے کہانی کی کتابیں مثلاً کلیلہ و دمنہ (پنچتنتر) اور کتاب سندباد، اخلاقی کتابیں شنق (چنکیا) اور بدیا (ہتوپدیسا) کی تصنیف کی ہوئی، اور ان کے علاوہ منطق اور فنونِ جنگ پر رسالوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔"

"انہیں اس بات کا بڑا شوق تھا کہ جن قوموں سے بھی انہیں واسطہ پڑے ان کے رسم و رواج عادات و اطوار، علوم و فنون اور مذہب سے واقفیت حاصل کرلیں۔ الکندی نے ایک کتاب ہندستانی مذاہب پر لکھی ہے، سلیمان اور مسعودی نے اپنے معلومات سفر جمع کئے جنھیں بعد کو اپنی تحریرات میں استعمال کیا۔ الندیم، الاشعری، البیرونی شہرستانی اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اپنی کتابوں میں ہندستان کے مذاہب اور فلسفیانہ طریقوں کے تذکروں کے لئے باب وقف کئے ہیں۔"

"بدھ کا تذکرہ مسلم ادب میں ایک ولی کے نمونے کے طور پر داخل ہوگیا۔ اور مسلمان تذکرہ نویسوں نے ابن ادہم کے قصوں کو بدھ کے تذکرے کے ساتھ

مماثل کر دیا۔ ہندستانی سادھو جو دمل کر سفر کرتے تھے اور دو راتوں سے زیادہ ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے مسلمان کا لیبن انھیں جانتے تھے جوان سے چار باتوں کا عہد لیتے تھے یعنی صفائی کا، پاکیزگی کا، سچائی کا، اور غریبی کا اور ان کے علاوہ تسبیح کے استعمال کا۔ پھر کیا تعجب ہی کہ نروان کا تخیل، ہشت گانہ راستے کا اصول، جوگ کی مشق، اور مافوق الانسانی طاقتیں اسلام میں فنا، طریقت یا سلوک، مراقبہ اور کرامات یا معجزہ کے ناموں سے اپنا لی گئیں[1]

لیکن جس شخص نے کہ اسلامی دنیا میں اپنے دلیرانہ اصولوں سے سب سے زیادہ ہلچل پیدا کر دی تھی وہ حسین بن منصور الحلاج تھا۔ اس نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا تھا۔ جن میں ہندستان بھی شامل تھا اور تین مرتبہ اس نے مکّہ کی زیارت کی۔ بالآخر اس کی حرکتیں اس قدر مکروہ ہو گئیں کہ ۹۲۲ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا[2] کبیر، دادو، نانک اور دیگر ہندستانی فقرا نے مسلمانوں کے تصوف کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں بعد کے زمانے میں منصور کے نظریئے ابن العربی اور عبدالکریم جیلی کے طریقوں میں داخل ہو گئے نیز ابن الفرید اور عبری سعید بن ابوالخیر کی نظموں میں، اور ان کا اثر دور دراز کے ممالک تک جن میں ہندستان بھی شامل ہی پہنچا۔

جیلی ہندو مذہب سے واقف تھا کیوں کہ دس خاص فرقوں میں سے اس نے براہم (برہمن) فرقے کو چنا ہی۔ ان کے متعلق وہ کہتا ہی کہ وہ خدا کی پرستش اسے لامحدود ذات سمجھ کر کرتے ہیں اور رسول یا پیغمبر کا واسطہ نہیں تلاش

---

[1] تارا چند کی کتاب "انفلوئنیس آف اسلام آن انڈین کلچر" (Influence of Islam on Indian Culture) صفحہ ۶۷ پر ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا ذکر۔

[2] مندرجہ بالا کتاب صفحہ ۶۹-۷۰۔

کرتے۔ براہمنی کی کتاب اس کے مطابق ان پر خدا کی طرف سے نہیں۔ بلکہ برہام (برہما) کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ اس صحیفے میں پانچ کتابیں تھیں جن میں سے پانچویں اس وجہ سے کہ اس کے معانی و مطالب بہت گہرے تھے، اکثر برہمنوں کو معلوم نہ تھیں، لیکن جو برہمن اس کو پڑھ لیتے تھے وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ بظاہر جیلی کی یہ پانچویں کتاب ویدانت ہے جس کے وحدت الوجود کے فلسفے نے اسے جیلی کی نظر میں اسلام سے ناقابل امتیاز بنا دیا۔[1] مسلمان صوفی جو وصل اور فنا کے طریقوں پر گام زن ہوتا ہے اسے ہمیشہ ایک روحانی پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ "اگر کسی شخص کا کوئی پیر نہیں ہے تو اس کا پیر شیطان ہے۔" یہ رہنما یا معلم جو پیر یا شیخ کہلاتا ہے وہ پروہت ہے کہ جس کے گرد اگرد صوفیوں کے وحدۃ الوجود کی تمام مشین چکر لگاتی ہے .... چیلے یا مرید کو یہ ہدایت ملی ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنے مرشد کو دھیان میں رکھے تاکہ بالآخر وہ اس کے مسلسل دھیان کی بدولت مرشد کے اندر جذب ہو جائے ہر آدمی اور ہر چیز میں اسے مرشد ہی کا جلوہ نظر آئے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں فنا کر دے۔ اس فنا فی الشیخ کی منزل سے مرشد اسے چند منزلیں اور طے کرا کے خدا کی ذات میں فنا ہونے کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ محمد صاحب نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنے (اسلام) کی تعلیم دی تھی، تصوف مرشد کے سامنے سر خم کراتا ہے جو کہ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔"[2]

---

[1] تاراچند کی کتاب "انفلوانیس آف اسلام آن انڈین کلچر" (Influence of Islam on Indian Culture) صفحہ ۷۷-۷۸

[2] تاراچند صفحہ ۸۱۔

حاجی وارث علی شاہ صاحب شمالی ہندستان میں ایک صوفی بزرگ گذرے ہیں۔ ان کی زیارت بارہ بنکی ضلع کے اندر دیوہ شریف میں ہے۔ ان کے مرید اور متبعین اپنے نام کے ساتھ وارثی لگاتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے۔ انہوں نے تصوف کی تعلیمات کو فارسی کے چند شعروں میں بیان کیا ہے۔ جن کو یہاں نقل کرنے سے مطلب کو واضح کرنے میں مدد ملے گی :۔

من ہمی گویم کہ پیر من خداست — پیش منکر ایں سخن گفتن خطاست
یک سوالے می کنم اے مرداں — پس جواب او را دہیدلے مومناں
ہیزم اندر نار چوں شد سوختہ — رشتہ اندر جامہ شد چوں دوختہ
پس ورا ہیزم بگویم یا کہ نار — رشتہ را جامہ بگویم یا کہ تار
چونکہ پیر من فنا فی اللہ شد — رفت بشریت ہمہ اللہ شد
پس بہ پائے او کنم ہر دم سجود — وقف کردم در رہش جان و وجود
عاشقی از جملہ عالم برتر است — زاں کہ ایں ملت خدائے اکبر است

ترجمہ :۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میرا پیر خدا ہے، منکر کے سامنے یہ لفظ منہ سے نکالنا خطا ہے۔ میں لوگوں سے ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب وہ لوگ دیں جو مومن ہیں لکڑی جب آگ کے اندر جل گئی، اور تاگا جب کپڑے کے اندر بن گیا تو اب میں اسے لکڑی کہوں یا آگ اور اسے تاگے کا تار کہوں یا کپڑا۔ چوں کہ میرا پیر فنافی اللہ ہوگیا ہے تو پھر بشریت رخصت ہو چکی اور وہ تمام تر خدا ہوگیا۔ اس لئے میں اس کے قدموں پر ہر وقت سجدہ کرتا ہوں اور اپنی جاں اور اپنا جسم اس کی راہ میں وقف کردیا ہے۔ عاشقی تمام دنیا سے برتر چیز ہے کیونکہ یہ خدائے اکبر کا دین ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی ایک گرو یا معلم کی ضرورت کا ذکر بہ کثرت آیا ہے

جو کہ چیلے کی ان مشکل اور محنت طلب ریاضتوں میں جو اسے کرنا ہیں رہ نمائی کر سکے، اور یہ کہ گرو کی امداد کے بغیر ترقی تقریباً ناممکن ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک روزمرہ کا وظیفہ یا جاپ ہے کہ "گرو ہی برہما ہے، گرو ہی وشنو ہے، گرو ہی مہیشور ہے، گرو ہی خود پر برہما ہے جس کے آگے میں جھکتا ہوں"۔ ہر ہندو کا یہ فرض ہے اور اس کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ ایک گرو تلاش کرے تاکہ اسکی ہدایتوں پر عمل کیا کرے۔

"کبیر پنتھ (مسلک) میں گرو کی حیثیت وہی ہے جیسی کہ صوفیوں کے کسی اور سلسلے میں۔ اگر صوفیوں کے متعلق یہ بیان صحیح ہے کہ "ان کے ہاں خدا کی اور انسان کی پوجا ایک سی ہے" تو وہ کبیر کے اس مقولے کا مصداق ہے کہ "گرو کو گووند (خدا) سمجھو"

یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ

"اگر ہری (خدا) ناراض ہو جائے تو پھر بھی بچنے کا کچھ نہ کچھ امکان رہتا ہے۔ لیکن اگر گرو ناراض ہو گیا تو پھر کوئی مفر نہیں ہے"

اور جس طرح کہ صوفیا کے سلسلے میں ہے اسی طرح کبیر پنتھ میں ہے کہ

"اصلی دھیان وہ ہے جو گرو کی شکل کا ہو، اور اصلی پوجا وہ ہے جو گرو کے قدموں کی کی جائے۔ اصلی ناؤ، گرو کا فرمان ہے جو کہ مطلب اور احساس کے رو سے سچ ہے اور تینوں دنیاؤں میں اور نو سرزمینوں میں گرو سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں ہے[1]"

تمام صوفیوں کی طرح نانک نے بھی یہی تعلیم دی ہے کہ روح جب خدا کی طرف چلتی ہو تو گرو کی رہنمائی ضروری ہے، ان کے طریقے میں بھی گرو کا وہی درجہ ہے جو کبیر پنتھ میں ہے"[2]

---

[1] تاراچند صفحہ ۱۵۰ [2] تاراچند صفحہ ۱۷۷

کبیر اور نانک کے نام اس طرح شمالی ہندستان کے ہر ہندو کے دل میں خود بخود آجائیں گے کہ جیسے ان لوگوں کے کہ جو اسلام اور ہندو ویدانت سے یکساں متاثر ہوں کبیر داس کی ساکھیاں اور ان کے معرفت کے گیت بے شمار ہندوں کی زبانوں پر ہیں اور صبح و شام پوجا کے وقت ہر ہندو گھرانے میں گائے جاتے ہیں۔

کبیر نے اس طرح ہندستان کی توجہ ایک ایسے مذہب کی طرف منعطف کی جو عالمگیر راستہ ہے، ایک سڑک بنا دی گئی تھی جس پر ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ ایسے مذہب پر ہندو یا مسلمان کسی کو اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کا ایک تخریبی پہلو بھی تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ایک نئی سڑک بغیر اس جنگل کو صاف کئے ہوئے بنا دی جاتی جو قدیم پگڈنڈیوں کے بیچ میں حائل تھا۔ کبیر نے اس لئے بے خوفی اور غصہ کے ساتھ ایک دل دوز زبان میں اس تمام ظاہرداری کے ڈھانچے پر حملہ کیا جس نے سچائی کو اپنے اندر چھپا کر نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا تھا اور ہندستان کے فرقوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ کبیر نے اپنی سرزنش میں نہ مسلمان کو بخشا نہ ہندو کو۔

"اس نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ وہ جیسا کہ بدھ کے زمانے کے بعد ہر مصلح نے اصرار کیا تھا رسمی قربانیاں، معجزے اور کرامات کی ہوس زبانی عبادت، مقررہ الفاظ کا دہرانا، جاترائیں، برت، بتوں کی اور دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا، برہمنوں کی فوقیت، ذاتوں کا فرق، چھوت چھات اور کھانے میں پرہیز چھوڑ دیں............ وہ مسلمانوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کو مستحق نجات نہ سمجھنے کا خیال۔ پیغمبر صاحب اور ان کی کتاب پر کورانہ اعتقاد، اپنی ظاہری عبادات پر

بھروسا حج بیت اللہ، روزے، باقاعدہ نمازیں، ولیوں اور پیروں اور پیغمبروں کی پوجا ترک کر دیں۔

"وہ ہندو مسلمانوں دونوں سے درخواست کرتا ہے کہ ہر ذی حیات کی عزت کریں اور خوں ریزی سے باز رہیں۔ وہ دونوں سے درخواست کرتا ہے کہ غرور خواہ نسل کا ہو یا مرتبہ کا اسے چھوڑیں، نہ حد سے زیادہ زاہد خشک نہیں اور نہ انتہائی دنیا دار، اور زندگی کو ایک نذر یا چڑھاوا خیال کریں۔ وہ بار بار اس بات کی تکرار کرتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہیں، وہ ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی خون سے بنے ہوئے ہیں[1]"

ہر شخص کو معلوم ہے کہ گرونانک کی تمام تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے دونوں مذہبوں کے بنیادی اصولوں کو باہم ملا کر ایک کر دیا ہے۔" نانک کا پیغام صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کر دینا تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سماج کے زخموں کے بھرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مذہبی جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا جائے[2] نانک نے اپنے ہی اوپر رحم نہیں کیا ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ نرمی کیسے برتتے۔ ایک مضبوط اور پر یقین دل کے ساتھ کہ جو پاک وصاف تھا اور نیک و بد کی اچھی طرح تمیز کر سکتا تھا وہ سامی جوش کے ساتھ ہندو مذہب اور اسلام کے تکلفات اور توہمات پر نفریں کرتا ہے[3] کبیر ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوئے تھے اور نانک ایک ہندو کے گھر میں اور پھر بھی وہ اس گداختگی کی پیداوار ہیں جو باوجود تمام ظاہری علیحدگی

---

[1] تاراچند صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۵ [2] تاراچند صفحہ ۱۶۸

[3] " " ۱۷۲ -

اور پرہیز کے جاری تھی. متحد کر دینے کی یہ کوششیں صرف فلسفیوں ہی کے طبقے تک محدود نہ تھیں۔ عمل کی دنیا میں بھی بے شمار مثالیں اس بات کی پیش کی جا سکتی ہیں کہ جن میں مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے مندروں اور مٹھوں پر نذریں چڑھائیں اور پرہیزگار ہندوؤں اور مذہبی علوم کے عالم پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر کوئی محقق اس قسم کے اوقاف اور جاگیروں کی ایک مکمل فہرست ایک جگہ جمع کر دیتا کہ جو مسلم بادشاہوں نے ہندو مندروں اور خانقاہوں کو دی تھیں اسی طرح جس طرح کہ ان عبادت گاہوں کی فہرست بنالی گئی ہے جن کو انھوں نے تباہ اور بے حرمت کیا تھا۔

"اگر ہندو مسلمانوں میں باہم تہذیب کے متعلق کوئی اشتراک عمل موجود نہ تھا تو پھر یہ کیوں ہوا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو اور ہندو راجوں نے مسلمانوں کو ان کے اپنے اپنے دارالعلوموں اور عبادت گاہوں کے لئے سندیں عطا کیں؟ جنوبی ہند کی تاریخ کے طالب علم کو قدم قدم پر ایسی مثالیں ملیں گی جن میں عادل شاہی، قطب شاہی، اور آصف شاہی خاندانوں نے اس جنگ کے بعد بھی جو انھوں نے دہلی کے شاہنشاہوں کے خلاف لڑی تھی مسلم عبادت گاہوں کے لئے اسی قسم کے اوقاف کئے ہیں"[1] اس قسم کی دو مثالیں صوبۂ بہار کی مجھے معلوم ہیں اور ان کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ گیا میں بودھ مہنت کی وہ بڑی زمینداری جس کی آمدنی سالانہ کئی لاکھ تک پہنچتی ہے اس کا مرکزی حصہ دہلی کے محمد شاہ بادشاہ نے وقف کیا تھا اور ایک فرمان کے ذریعہ مستی پور تارادیہ نامی گاؤں مہنت لال گیر کو بخشا تھا جو کہ بہ اعتبار جانشینی

---

[1] رتولا چند چکرورتی کی کتاب "کال اِٹ پالیٹکس" (Call it Politics) صفحہ ۴۴۔

بدھ مذہب کے بانی سے جو تھا مذہبی پیشوا تھا۔ اسی طرح دربھنگہ کی وہ عظیم الشان زمینداری جو کہ شاید ہندوستان بھر میں سب سے بڑی زمینداری ہے دراصل مغل شاہنشاہ اکبر نے موجودہ برہمن مہاراج ادھیراج کے بزرگوں کو ان کے علم اور پرہیزگاری کے انعام میں دی تھیں :- شیر شاہ نے اپنی ہندو رعایا میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اوقاف کئے تھے اور ان کا انتظام بالکل انہی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس قسم کی فیاضانہ پالیسی نے اسے اپنی ہر مذہب و ملت کی رعایا میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔" [1]

چند ان مثالوں کا ذکر بھی اس موقع پر کر ہی دیا جائے تو اچھا ہے جو ڈاکٹر سید محمود صاحب نے مجھ سے بیان کی تھیں :-

کشمیر کا سلطان زین العابدین اکثر امرناتھ اور شاردا دیوی کے مندر کی زیارت کے لئے جاتا تھا، اور اس نے وہاں جاتریوں کے آرام کے لئے مکانات بنوا دئے تھے۔

نجیب آباد کے پٹھانوں کی ۱۷۰۰ء میں ہردوار پر حکومت تھی۔ نواب نے ہندو جاتریوں کی آسائش کی غرض سے بڑے بڑے مکان بنوا دئے تھے جو کہ آج تک موجود ہیں اور ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔

۱۵۸۰ء میں گرو ارجن دیو نے امرتسر میں ایک تالاب کھدوایا، اور اسی سال وہاں پوجا پات کے لئے مندر بنوانا تجویز کیا۔ انھوں نے ہرمان دیر کی بنیاد ایک

---

[1] ایشوری پرشاد کی کتاب ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا" History of Muslim Rule in India. صفحہ ۳۳۹۔

مسلمان عابد و زاہد کے ہاتھوں سے رکھوائی جس کا نام میاں پیر عرف بالا پیر تھا۔

سردار اودھم سنگھ کی لکھی ہوئی دربار امرتسر کی تاریخ میں مذکور ہے کہ بٹالہ کے منشی سبحان رائے نے جو کہ عالمگیر کے زمانے کے ایک مشہور مورخ تھے کتاب خلاصۃ التواریخ میں ایک گاؤں دیپالپور دال کا ذکر کیا ہے جو کہ کلانور کے قریب واقع ہے اور جہاں شاہ شمس الدین درباری کا مزار ہے۔ اس قبر کی زیارت کے لئے بہ کثرت مخلوق جاتی ہے۔ منشی سبحان رائے لکھتے ہیں کہ

"شاہ شمس الدین کی بزرگی کے ہندو اور مسلمان دونوں یکساں معترف ہیں لیکن دیپالی نامی ایک ہندو شاہ صاحب پر اعتقاد رکھنے میں ہندو مسلمانوں دونوں سے بڑھ گیا ہے۔ شاہ درباری کی وفات کے بعد دیپالی ان کی قبر کا مجاور اور درگاہ کا پہلا منتظم مقرر ہوا، اور اگرچہ مذہباً وہ مسلمان نہیں تھا پھر بھی اس کے تقرر پر ہندو مسلمان دونوں نے اتفاق رائے کیا ......

...... چند سال کے بعد مسلمانوں نے کوشش کی کہ ہندو مجاوروں کو وہاں سے ہٹا دیں یہاں تک کہ اس برخاستگی کے لئے مذہبی اسباب کا بھی ذکر کیا گیا۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت نے مسلمانوں کی ایک نہ سنی اور وہ تحریک ناکام رہی۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی جا رہی ہے عالمگیر کی تخت نشینی کا تیسرا سال ہے اور تا حال ہندو ہی اس قبر کے مجاور ہیں۔"

آج کل کے زمانے میں بھی حیدرآباد (دکن) میں ایک مشہور بزرگ کی درگاہ کے متولی ایک برہمنوں کا خاندان ہے۔ نظام نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر دے رکھی ہے اور عوام بھی بہ کثرت نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں نے کوشش کی تھی کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے درگاہ کو نکال لیں لیکن نظام نے اس کی اجازت نہ دی۔

موجودہ زمانے میں بھی حیدر آباد میں سیتارام کے مندر کے لئے ریاست کی طرف سے ایک امداد مقرر ہے نیز ایک دوسرے کے لئے بھی جو مہور (عادل آباد) میں واقع ہی ایک جاگیر وقف ہی کہ جس کی آمدنی کی مقدار پچاس ساٹھ ہزار روپئے سال کی ہوتی ہی۔ نظام نے سکھوں کے نانڈیر کے گردوارے کے لئے جو جاگیر دے رکھی ہی اس کی آمدنی بیس ہزار روپے سالانہ ہی۔

چند فارسی زبان کی سندوں کا حوالہ بھی یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ایک سند پر ۱۱۶۶ھ کی تاریخ ہی اور احمد شاہ بہادر غازی کی عطا کی ہوئی ہی:-

"قصبہ اچھینرہ ضلع اکبر آباد کے زمینداروں اور کاشتکاروں کو معلوم ہو کہ سترہ بیگھے قطعہ اراضی معافی بنیارتھ (مذہبی رسم) کے طور پر شتیل داس بیراگی کو شری ٹھاکر جی کے بھوگ اور نوید کی خاطر دئے جاتے ہیں تاکہ اراضی مذکورہ کی آمدنی سے بیراگی مذکوران کا خرچ چلائے اور شری ٹھاکر جی کی جملہ رسوم ادا کرے۔"

"اچھینرہ کے بازار چودھری کو معلوم ہوا کہ وہ شری ٹھاکر جی کو بیس بھر غلہ دیا کرے گا۔ بیراگی مذکور الصدر اس سے کبھی محروم نہ کیا جائے گا۔

مورخہ ۲ رمضان ۱۱۳۹ھ فصلی"

"من جانب شہاب الدین خاں جس میں کہ ایک جاگیر چنچواد کے گنیش جی کے مندر کے لئے دی گئی ہی":

قول نامہ

بنام مورث گسائیں ساکن چنچواد پرگنہ پونا جس کے متعلق خانِ حکمت نشان ناہر خاں نے اطلاع دی ہی کہ وہ جاگیر کے عطیہ کے لئے قول چاہتا ہی۔ لہٰذا قلمی ہوتا ہی کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اور قبیلے کے لوگوں کے ہمراہ اس گاؤں میں آباد ہو اور اس کو زرخیز بنانے کی کوشش کرے۔ باری تعالیٰ کی مرضی ایسی ہو

کہ اس پر کسی قسم کی کوئی مصیبت نہ پڑے - اس مقصد کے لئے جو تولیت نامہ تحریر ہوا ہے اس کی تاریخ ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ ہے۔

اسی قسم کے عطیوں کے دو فرمان الہ آباد میں ہیں۔ ان میں سے ایک مہیشور ناتھ کے مندر کے پجاریوں کے حق میں ہے۔ یہ اورنگ زیب کا دیا ہوا ہے۔

اورنگ زیب نے گردھر ولد جگر جیون ساکن موضع بستی ضلع بنارس کو اور جادو مشر ساکن مہیش پور پرگنہ حویلی کو، اور پنڈت بال بھدر مشر کو جو کہ تینوں مہنت تھے جاگیریں دیں۔

اورنگ زیب نے بصورت نقد مشر کلیان داس کو ملتان کے تنلامی کے لئے سو روپے کا عطیہ دیا تھا جو کہ اس وقت جاری ہے۔ حوالہ ضلع ملتان کے بندوبست کی رپورٹ تیار کردہ حکم چند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۱۵۳ھ میں ایک عطیہ اس صورت میں دیا تھا کہ روزانہ چار سیر گھی اجین کے مودی خانے سے مہاکال کے مندر کو ملا کرے تاکہ اس سے وہاں روشنی کی جائے۔

ایک عام طریقہ پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بادشاہ، اور حکمراں علم و فن کے بڑے سرپرست تھے اور صرف فارسی اور عربی ہی کی نہیں، بلکہ سنسکرت اور ہندستانی علم و ادب کی تعلیم بھی عام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ مختصر طور پر بھی جو کچھ انھوں نے ہندستان میں علم کی ترقی کے لئے کیا ہے بیان کیا جائے۔ شاہی فرمان کے مطابق کئی ایک سنسکرت کتابیں مختلف علوم و فنون کی فارسی اور عربی میں ترجمہ کی گئیں اس کے علاوہ پچاسوں مسلمان سردار تھے جنھوں نے خود سنسکرت کا علم حاصل کیا تھا اور اس زبان کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے خود سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا تاکہ ہندو علوم و فنون کے خزانے دنیائے اسلام

میں پھیلائے جا سکیں، اور دوسرے مترجمین کی بھی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اکثر سنسکرت کی کتابیں ہندو طالب علموں کی تعلیم کے نصاب میں داخل تھیں۔ مختصر یہ کہ سنسکرت کی ہر ممکن ذریعے سے توسیع کی کوشش کی جاتی تھی[1]"

ڈاکٹر جمیس ایچ کزنس (James H. Cousins) نے اسلامی ہند میں تعلیم کے متعلق لکھا ہے کہ مسلمان بادشاہ اور شہزادے خود طالب علم بن گئے تھے اور ہندو تہذیب کو اپنے دماغی مشاغل میں داخل کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی ادبی تعلیمات اسی کثرت سے ہندوؤں کی ادبیات کے ساتھ مل جل گئی تھیں جس کثرت سے مغلوں کی تصویر کشی راجپوتوں کی نقاشی میں وصل ہو گئی تھی۔ ہندوؤں کی مستند کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کر لی گئیں تھیں، اور اسی طرح لازمی طور پر ایرانی تہذیب نے ہندو تہذیب پر اثر ڈالا تھا۔[2]

ہندو آج بھی مسلمان ولیوں کی درگاہ یا مزار پر اسی کثرت سے جمع ہوا کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان، اور عرس کے موقعوں پر اجمیر شریف میں اور صوبۂ بہار میں بہار شریف میں، اور منیر شریف میں اور پھلواری شریف میں ان میلوں میں شرکت کیا کرتے ہیں۔ بہت سے ہندو تو فی الحقیقت مسلمان ولیوں سے اسی قسم کے تعلقات رکھتے ہیں کہ جیسے گرو اور چیلے کے یا پیر اور مرید کے تعلقات ہوتے ہیں۔

محرم کے جلوسوں میں ہندوؤں کا جوق در جوق شریک ہونا شمالی ہندستان میں

---

[1] ایس، ایم، جعفر کی کتاب "ایجوکیشن ان مسلم انڈیا" (Education in Muslim India) صفحہ ۱۵

[2] اخبار ایسٹرن ٹائمس (The Eastern Times) مورخہ ۱۰ جون ۱۹۳۵ء سے اقتباس۔

کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں کہ ان جلوسوں میں ہندوؤں کی تعداد فی الحقیقت مسلمانوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور اس کا باعث صرف یہ تھا کہ ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ ہندوؤں کی یہ شرکت صرف جلوسوں تک محدود نہیں ہوتی تھی۔ وہ حقیقتاً بالکل مسلمانوں کی طرح اپنے گھروں میں بھی محرم مناتے تھے اور اس عشرہ کی مدت کو رنج و غم اور عبادت الٰہی کا زمانہ خیال کرتے تھے اور کوئی مبارک تقریب مثلاً شادی بیاہ نئے گھر میں جانا وغیرہ اس مدت میں انجام نہ دیتے تھے۔ بہت سے ہندو اپنے تعزیئے اور سہریں بنایا کرتے تھے، اور ہندو لڑکے پورے طور پر پیک اور بہشتی بنا کرتے تھے وہی سبز پوشاک اور وہی بدھی اور وہی کاندھے پر مشک۔ ہندوؤں کے اکھاڑے مسلمانوں کے اکھاڑوں سے اپنے تلوار اور سردھیوں کے کرتبوں میں مقابلہ کیا کرتے تھے، اور گتکہ اور لاٹھی اور بہت سے دوسرے ہتھیاروں کے چلانے کا ہنر دکھلاتے تھے۔ اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ یہ اکھاڑے اکیلے ہندوؤں کے یا اکیلے مسلمانوں کے نہ ہوتے تھے، بلکہ دونوں کے مشترک اکھاڑے ہوا کرتے تھے۔

محرم کے جلوس جب انتہا سے زیادہ شور و غل مچاتے ہوئے مسجدوں کے سامنے سے گزرتے تھے تو کوئی ان پر اعتراض نہ کرتا تھا، اور کبھی سر پھٹول یا اس سے زیادہ شدید جرائم کی وارداتیں نہ ہوتی تھیں جیسی ان دنوں ہندوؤں کا باجا جامع مسجد کے سامنے سے گزرنے پر ہوا کرتی ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جس باجے پر بعض مقامات پر مسلمانوں کو اعتراض ہوتا ہے عام طور پر اس کے بجانے والے پیشہ ور مسلمان مغنی ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح گائے کی حالت ہے جس کی بقرعید پر قربانی اکثر ہندوؤں کو مشتعل کر دیتی ہے (اگرچہ روزمرہ خوراک اور چمڑے کی غرض سے ہر شہر میں اور بالخصوص چھاؤنیوں میں، اس کے ذبح کئے جانے کو ہندو برداشت کر لیتے ہیں)

کہ وہ گائے اکثر صورتوں میں ہندو کی گائے ہوتی ہے جسے وہ روپے کے عوض میں مسلمان کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اچھی طرح اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ خریدنے والا اسے کس کام میں لے گا۔ اس کے دوسری طرف ہمارے سامنے مسلمان بادشاہوں کی بابر سے لے کر نیچے کی طرف ایسی مثالیں ہیں جنھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوؤں کے جذبات کا احترام اس طریقے پر کیا جائے کہ مسلمان گائے کے ذبیحہ سے احتراز کریں اگرچہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ انھوں نے بالکل گاؤکشی بند کرادی ہو۔ اور ایسے تو مسلمانوں کے خاندان بےشمار ہیں کہ جن میں محض پڑوسی ہندو کے پاس خاطر سے گائے کا گوشت بالکل استعمال نہیں ہوتا۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دن (عید کے دن) گائے کی قربانی نہیں ہوئی کیونکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اُس دن (عید کے دن) ہر شخص جو صاحب حیثیت ہے۔ اپنے اپنے گھر میں ایک ایک بکرے کی قربانی کرے گا اور اس دن کو بڑے تہوار کی طرح سے منائے گا[1]"

ظہیرالدین محمد بادشاہ غازی (بابر) نے اپنے بیٹے شہزادہ نصیرالدین ہمایوں کو جو وصیت کی تھی وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔

جانِ پدر ہندستان کی اقلیم مختلف مذاہب سے بھری پڑی ہے۔ اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے تجھے اس اقلیم کا تاجدار بنایا۔ تیرا یہ فرض ہے کہ اپنی لوح دل سے مذہبی تعصبات یکسر مٹا دے اور ہر مذہب کے طریقوں کے مطابق ہمیشہ انصاف کر۔ خاص طور پر گائے کی قربانی سے پرہیز کر کہ اس کی وجہ سے تو ہندستان کے لوگوں کے دلوں پر فتح نہیں پا سکتا۔

---

[1] ایشوری پرشاد کی کتاب اے شورٹ ہسٹری آف مسلم رول اِن انڈیا" (A Short History of Muslim Rule in India) کے صفحہ ۳۸ پر "پلیسارٹ" (Pelsaart) کے حوالے سے لکھا ہوا ہے۔

اور اس ملک کی رعایا کو شاہی احسانات کی زنجیر میں باندھا جا سکتا ہے۔

کبھی کسی ایسے مذہب یا ملت کے مندر اور عبادت گاہ کو تاراج نہ کرنا جو حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہو۔ انصاف ہمیشہ ایسے طریقے پر کر کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ اسلام کے مقاصد کی ترقی نیکی اور احسان کی تلوار کے ذریعہ سے زیادہ ممکن ہے بہ نسبت ظلم کی تلوار کے۔

شیعہ اور سنی کے اختلافات سے ہمیشہ چشم پوشی کرنا ورنہ اسلام کا ضعف لازمی ہے۔

اور مختلف عقیدوں کی رعایا کو اسی طرح ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے کی اجازت دینا، کہ جس طرح انسانی جسم میں چاروں عناصر مخلوط ہیں تاکہ سلطنت کا جسم اخلاط کے اختلاف سے محفوظ رہے۔ تیمور صاحب قران ہر وقت تیری نظر کے سامنے رہیں تاکہ تو مملکت کے انتظامی معاملات میں تجربہ کار ہو جائے۔

مورخہ یکم جمادی الاول ۹۲۵ھ[۱]

مسلمانوں کی رواداری کی کچھ اور مثالیں بھی جو ڈاکٹر سید محمود صاحب نے مجھے بتائی ہیں یہیں بیان کئے دیتا ہوں:۔

مشہور پرتگالی مورخ فری سوزا (**Fari Souza**) نے اپنی کتاب "دکھن کی حالت" میں لکھا ہے "ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی ملازمت کرتے تھے اور مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا کرتے تھے اور ان کو بڑے مرتبے بخشتے تھے۔" دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کے

---

[۱] بابر کی وصیت کا ترجمہ جس کی ایک نقل ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجارام کالج کولھاپور کے پاس تھی، مطبوعہ اخبار "سرچ لائٹ" (**Search Light**) مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۲۶ء

خلاف کوئی تعصب موجود نہ تھا، اور وہ اپنی مذہبی پوجا پاٹ بلا کسی رکاوٹ کے کیا کرتے تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔

سر ایلفریڈ لائل (Sir Alfred Lyall.) ایشیاٹک سٹڈیز (Asiatic Studies) کے صفحہ ۲۸۹ پر لکھتے ہیں:-

"مسلمان بادشاہ ہندستان کو ایک اسلامی ملک میں تبدیل کرنے سے اس قدر محترز تھے کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان کے مذہب نے ان کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں کا تنہا اجارہ دار بنا دیا ہو۔"

"اورنگ زیب نے بہت سے قابل ہندوؤں کی سفارش شاہ جہاں اور اس کے وزراء سے ملازمت کے لیئے کی۔ مثال کے طور پر یہ ملاحظہ ہو کہ جب ایلچپور میں دیوانی کی ایک جگہ خالی ہوئی تو اورنگ زیب نے ایک راجپوت افسر رام کرن کی پرزور سفارش کی لیکن کسی وجہ سے شاہ جہاں نے وہ سفارش قبول نہ کی۔ اورنگ زیب نے دوبارہ لکھا کہ اس سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا (واقعات عالمگیری جلد اول صفحہ ۱۱۴) اس قسم کی بہت سی مثالیں رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری میں موجود ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنایا لیکن یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اس کی طبیعت کا رنگ ظاہر ہو سکتا ہے۔ شاہ جہاں نے دندھرا کے راجہ اندرمان کو متواتر حکم عدولیاں کرنے کے الزام میں قید کر دیا تھا۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار ہو کر گیا تو اس نے شاہ جہاں سے اندرمان کی رہائی کے لیئے بہت زور کے ساتھ سفارش کی تھی لیکن شاہ جہاں کچھ ایسا ناراض تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی سفارش واپس کر دی اور لکھ بھیجا کہ اندرمان نے ما بدولت کو سخت ناراض کیا ہے تاہم اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے رہائی مل سکتی ہے۔ اورنگ زیب نے اس حکم کے خلاف بہت سختی کے ساتھ

احتجاج کیا اور شاہ جہاں کو لکھا کہ اس شرط پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بہت ہی
اخلاق اور تنگ نظرانہ ہے۔ اور پھر لکھا کہ اگر اسے رہائی دینی ہے تو بس انہی شرطوں پر
دیجئے جو کہ اس نے خود پیش کی ہیں۔ شفاء اللہ خاں وزیر اعظم کے نام اورنگ زیب
کا یہ خط آداب عالمگیری میں موجود ہے۔

(۲) سماجی زندگی

ہندوؤں کا مسلمانوں کی اور مسلمانوں کا ہندوؤں کی سماجی زندگی پر جو اثر پڑا ہے
کچھ کم قابل لحاظ نہیں ہے۔ اگر ہم زندگی کے تین اہم ترین واقعات یعنی پیدائش
شادی بیاہ، اور موت سے متعلقہ رسموں پر نظر ڈالیں تو یہ اثر بہت ہی واضح طور
نظر آ جاتا ہے۔ میں یہاں ان چند رسوم کا ذکر کروں گا جو صوبہ بہار کے متوسط طبقے
ہندوؤں اور مسلمانوں میں عام اور ایک جیسی ہیں۔

یہ ایک عام رسم ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت بالخصوص جبکہ وہ لڑکا ہو گیت
گائے جاتے ہیں جنھیں بہار میں سوہر کہا جاتا ہے۔ محلے کے گھروں میں سے عورتیں آتی ہیں
گانے اور دعوت میں شرکت کرتی ہیں۔ زچہ کے کمرے کے دروازے پر آگ جلتی رکھی جاتی ہے
اور اس کے علاوہ لوہے کا ایک ٹکڑا اور ایک کانٹوں دار پودا بھی کہ جسے منٹھیا یج کہتے ہیں
اور بعض دوسری چیزیں بھوت پریت کو دور رکھنے کے لئے رکھ دی جاتی ہیں۔ پیدائش کے
چھٹے دن ماں اور بچہ دونوں کو غسل دیا جاتا ہے اور اس رسم کا نام چھٹی ہے اس کے بعد
ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور تارے گنتی ہے۔ چھٹی کے بعد بیسویں
دن اور چالیسویں دن بھی کچھ رسوم ہوتی ہیں جن کا نام بیستووی اور چھیلا (چلّہ) ہے۔
زچگی کے زمانے میں چھٹی نہانے تک ماں ناپاک سمجھی جاتی ہے اور اسے اس بات کی اجازت

نہیں ہوتی کہ دوسروں کی کھانے کی چیزوں کو ہاتھ لگادے۔ اسلامی شریعت میں بھوت پریت کا گھروں میں آنا اور زچہ کو کسی کے کھانے کو ہاتھ نہ لگا سکنا یہ دونوں تخیل تو ناقابلِ قبول اور نامانوس ہیں اور اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ دنوں کی ایک مقررہ تعداد گذارنے کے بعد ہی زچہ اور بچہ نہائے، لیکن اس کے باوجود مسلمان گھروں میں سب کچھ یہی ہوتا ہے۔

بچّے کے بال اتروانا بھی ایک ضروری اور اہم رسم ہے اور یہ رسم ہندو مسلمان دونوں میں عام ہے۔ ہندو اسے مونڈن کہتے ہیں اور مسلمانوں میں اس کا نام عقیقہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس رسم کا مذہب سے بھی کوئی تعلق ہو لیکن رسموں کی یکسانیت حیرت انگیز ہے۔

اسلام میں شادی لفظ کے قانونی معنوں میں ایک معاہدہ ہے۔ دولھا اور دلہن خاوند اور بیوی بن کر رہنے کا اقرار کرتے ہیں اور دوسرے تمام معاہدوں کی طرح اس معاہدہ کی توثیق بھی گواہوں کے ذریعہ کی جاتی ہے اور معاوضہ دیئے جانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تاوان شادی کے وقت ہی مقرر ہوجاتا ہے اور اس کی ادائیگی اس وقت تک عمل میں نہیں آتی جب تک کہ معاہدہ فسخ نہ کیا جائے۔ شادی کا اہم ترین اور سب سے زیادہ ضروری حصہ بہت ہی مختصر چیز ہوتی ہے۔ اور صرف یہ ہے کہ فریقین چند گواہوں کی موجودگی میں رضامندی کا اقرار کرلیں اور اس سب کارروائی میں مشکل سے چند منٹ صرف ہوتے ہیں۔ اس کا نام نکاح ہے اور دعوتوں وغیرہ سے بالکل جُداگانہ ہے جسے شادی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں شادی ایک مذہبی حکم ہے اور اسی وجہ سے وہ اصولاً ناقابلِ تنسیخ ہے۔ عہد جو کیا جاتا ہے وہ ایک مذہبی عہد ہے اور اس کے گواہ صرف انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ سورج اور چاند اور زمین اور پانی اور پتھر یعنی ہستی کی وہ سب علامات جو اس وقت تک باقی رہتی ہیں کہ جس وقت روح اپنا چکر پورا کرکے اپنی ابدیت میں نہ داخل ہوجائے یہ رسم اگر ٹھیک طور سے ادا کی جائے تو کافی وقت لیتی ہے۔ اس بیان سے یہی معلوم

ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کی شادی کی رسموں میں بنیادی فرق ہے۔ لیکن عملاً دیکھا یہ جاتا
جہاں ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنی اپنی بنیادی رسوم اپنے اپنے مذہب کے مط
ادا کرتے ہیں۔ وہاں وہ تمام رسمیں جو ضروری نہیں ہیں ایک کی دوسرے کے س
بہت بڑی حد تک مشابہ ہوگئی ہیں۔ ظاہری شان وشوکت، جلوس دعوتیں اور جش
عورتوں کے گیت۔ تحفے تحائف، عملی مذاق، آپس کی چھیڑ چھاڑ اور کھیل تماشے س
دونوں فرقوں میں بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ اسلام نمود و نمائش کو منع کرتا ہے
مذہب نہ منع کرتا ہے اور نہ اس کا حکم دیتا ہے؛ لیکن دونوں فرقوں میں ان موقع
پر جو کچھ کیا جاتا ہے اس میں مشکل ہی سے کوئی فرق ہوتا ہے۔

ان رسموں کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ غالباً دلچسپ ہوگا۔

صوبۂ بہار کے مسلمانوں میں شادی بیاہ سے متعلق رسمیں اور ضیافتیں ہن
کی اسی موقع کی رسموں سے بہت کچھ اثر پذیر ہوئی ہیں۔ جیسا کہ پیشتر ذکر آچکا ہے مسلما
میں شادی کی رسم صرف نکاح ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں نکاح کو شادی سے الگ
کر دیا جاتا ہے جو کہ کسی دوسرے وقت اور دوسری جگہ پر کی جاتی ہے۔ شادی کے
موقع پر دولہا والوں کی جماعت (برات) جس کی شان وشوکت اور ساز و سامان
دولہا کی خاندانی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ دلہن کے گھر جاتی ہے، اور بالعموم اسے
دلہن کے باپ کے گھر میں نہیں بلکہ کسی اور گھر میں یا اکثر خیموں اور شامیانوں میں
ٹھہرایا جاتا ہے۔ برات کی روانگی اور آمد سے چند روز پیشتر ہی دولہا اور دلہن دونو
کے گھروں میں کچھ رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک رسم کا نام رت جگا ہے
میں عورتیں رات بھر جاگتی ہیں اور گاتی رہتی ہیں اور گلگلے پکاتی ہیں۔ کسی دوسرے
روز منڈوے کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں کہ ایک قسم کا شامیانہ سا مکان کے
صحن میں لمبے لمبے بانس گاڑ کر تان دیا جاتا ہے۔ تیسرے موقع پر کندوری کی رسم ادا

ہوتی ہے جو یہ ہے کہ کھانا پکا کر مُردوں کے نام پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کھانے کی مستحق صرف سیدانیاں ہی ہوتی ہیں۔ ایک مقررہ تاریخ پر برات کی روانگی عمل میں آتی ہے اور وہ دلہن کے گھر پہنچتی ہے۔ شادی سے چند روز قبل لڑکی کو مایوں بیٹھنا پڑتا ہے جسے مانجھے کی رسم بھی کہتے ہیں اس موقع پر لڑکی ایک کمرہ میں بٹھا دی جاتی ہے اور اب شادی کے دن تک اس پر سوائے گھر کی خاص خاص عورتوں کے اور کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ اسی زمانے میں اس کے جسم پر اُبٹن ملا جاتا ہے (ہلدی اور خوشبوؤں کا مجموعہ) اور اس مقام سے وہ شادی کے دن نکالی جاتی ہے۔

ہندوؤں میں بھی ایک مبارک دن دیکھ کر منڈوا یا منڈپ شادی سے ایک دو دن قبل بنایا جاتا ہے اور اسی میں شادی کی رسم عمل میں آتی ہے۔ ایک مخصوص مذہبی رسم بھی ادا کی جاتی ہے جس کے ذریعے مرے ہوئے بزرگوں کی روحوں کو بلایا جاتا ہے تاکہ وہ شادی میں شرکت اور اس نئے جوڑے کو اپنے رشتہ داروں میں شامل کر لیں۔ لڑکی کے جسم پر ہلدی ملی جاتی ہے اور یہ رسم بہت ہی اہم ہے اور یہ مشہور ہے کہ ہلدی ملنے کی رسم لڑکی کی زندگی میں دوبارہ نہیں ہو سکتی، مطلب یہ کہ لڑکی کی خاوند کے مرجانے پر بھی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی کو شادی سے قبل چند روز کے لئے عام نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا جاتا ہے، اور اس مدت میں وہ کچھ تو ہلدی کی مالش سے اور کچھ غسل نہ کرنے کے سبب سے میلی کچیلی نظر آتی ہے اور شادی سے ایک ہی دو روز پہلے وہ ایک رسم ادا کر کے نہلائی جاتی ہے۔ ہر ایک رسم کی ادائیگی کے موقع پر ہندوستان بھر کے ہندوؤں میں یہ ضروری ہے کہ برہمن کھلائے جائیں۔ ہندوؤں کی برات بھی اپنی نمود و نمائش کے لحاظ سے بالکل مسلمانوں ہی کی سی ہوتی ہے، ہاتھیوں کی قطاریں، گھوڑے، اور اس زمانے میں تو موٹریں بھی، باجا گاجا اور رات کا وقت ہے تو روشنی کا ہر قسم کا سامان ہمراہ

ہوتا ہے۔ ہندو مسلمان دونوں میں یہ دستور ہے کہ برات کو علیحدہ مکان میں یا خیموں میں ٹھہراتے ہیں اور اس کا سبب خاص کر یہی ہے کہ دلہن کا باپ اپنے بہت سے آدمیوں کے لئے اپنے گھر میں جگہ نہیں نکال سکتا۔

ہندوؤں میں برات کا جلوس دلہن کے گھر پہنچتا ہے تو اس کا استقبال دلہن کے گھر عورتیں اس طرح کرتی ہیں کہ دولہا کے اوپر کچھ پانی اور کچھ چاول نچھاور کرتی ہیں، اس کی پیشانی پر تلک لگاتی ہیں اور اس کے سامنے روشنی ادھر سے ادھر ہلاتی ہیں۔ دلہن کا باپ بھی دولہا کا استقبال کچھ رسم ادا کرکے کرتا ہے اور کچھ تحفہ دیتا ہے۔ دوسرے سب براتیوں کی بھی خاطر تواضع ہوتی ہے اور انہیں کچھ ہلکا سا ناشتہ کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کل مجمع اس جگہ جاتا ہے جہاں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس رسم کا نام بری چھادن ہے۔ اس کے فوراً بعد دلہن والے پانی اور کھانا لے کر برات والوں کے مقام پر پہنچتے ہیں اور رسمی تکلف کے ساتھ انہیں کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ دولہا کے بڑوں کو تحفے دیئے جاتے ہیں اور اس رسم کا نام دھورچک ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دولہا والے دلہن کے گھر پر جاتے ہیں جہاں کہ دلہن کو لاکر منڈپ میں بٹھایا جاتا ہے اور دولہا کا بڑا بھائی دلہن کو کپڑے، زیور، مٹھائی اور عطر پیش کرتا ہے جو کہ ایک مندر کی شکل کی ٹوکری میں رکھے ہوتے ہیں جو کہ نیچے سے خوب چوڑی اور اوپر کی طرف مخروطی شکل کی ہوتی جاتی ہے۔ زندگی بھر میں صرف یہی ایک موقع ہوتا ہے کہ دولہا کا بڑا بھائی اپنی چھوٹی بھاوج کو دیکھ یا چھو سکتا ہے۔ اس رسم کو کسر اترگش کہتے ہیں جس کے معنے دلہن کو دیکھنے کے ہیں۔ اس کے بعد شادی کی خاص رسم ادا کی جاتی ہے۔ دولہا اور دلہن دونوں کو منڈپ میں لایا جاتا ہے۔ دلہن اس لباس اور زیور سے آراستہ ہوتی ہے جو دولہا والوں کی طرف سے اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور دولہا اس لباس میں ہوتا ہے جو دلہن والوں نے اسے بھیجا ہے اور

پھر خدا سے دعا کے بعد دلہن کا باپ رسمی طور پر دلہن دولہا کو پیش کر دیتا ہے۔ طرفین کے بعض قریبی رشتہ دار موجود ہوتے ہیں۔ صوبہ بہار میں سخت پردے کی بنا پر دولہا کی طرف کے لوگ سوائے پروہت کے یا دو ایک اور ایسے آدمیوں کے کہ جن کی شرکت رسم کے لئے ضروری ہے اس رسم میں شرکت نہیں کر سکتے کیونکہ دلہن کی طرف کی عورتیں وہاں موجود ہوتی ہیں۔ تقریب میں شریک ہونے والے سب لوگ گواہ خیال کئے جاتے ہیں، اور رسم کے طور پر خدا، اور سورج اور چاند اور آگ اور پانی اور زمین اور پتھروں وغیرہ کو بھی گواہی کے لئے پکارا جاتا ہے اور ان سے استدعا کی جاتی ہے کہ دولہا اور دلہن پر اپنی برکتیں نازل کریں۔ اور پھر دولہا دلہن کچھ منتر اپنی زبان سے دہراتے ہیں جن میں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کے وعدے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ نیا جوڑا آگ کے چاروں طرف طواف کرتا ہے اور اس رسم کا اختتام اس طرح پر ہوتا ہے کہ دولہا اپنے ہاتھ سے دلہن کی پیشانی پر سیندور کا ٹیکا لگا دیتا ہے۔ اس رسم کا نام سیندور دان ہوتا ہے۔ یہ سرخ ٹیکا عورت کی خوش قسمتی کا نشان سمجھا جاتا ہے اور وہ جب تک اس کا خاوند زندہ ہے برابر اسے لگاتی رہتی ہے۔

"مسلمانوں میں دولہا والوں کی آمد کے بعد بَری کی ایک رسم ہے یعنی دولہا والے دولہا کے مکان سے دلہن کے لئے کپڑے، تیل عطر، مٹھائیاں اور پھل وغیرہ لے کر دلہن کے گھر کو روانہ ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ باجا بھی بجتا ہوا جاتا ہے۔ آگے آگے سہاگ پڑا ہوتا ہے جو کہ ایک قسم کی ٹوکری نیچے سے چوڑی اور اوپر کو تیلی مخروطی شکل کی ہوتی ہے جس میں مصالحے، پھل مٹھائی کلاوہ اور چاول بالکل اسی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح ہندوؤں میں۔ جب دلہن والوں کو یہ بَری وصول ہو جاتی ہے تو ان کی طرف سے دولہا کے کپڑے وغیرہ آتے ہیں جن کا نام خلعت ہے۔ وہ وہی کپڑے پہن کر دلہن کے گھر جاتا ہے کہ جو اس کے لئے آتے ہیں۔ اگر ضروری مذہبی رسم یعنی

نکاح پہلے سے نہیں ہو چکا ہے تو اب نکاح عمل میں آتا ہے۔ دولہا دلہن کے سر پر اسی طرح
رکھتا ہے کہ جس طرح ہندوؤں میں سیندور کا ٹیکا لگایا جاتا ہے اور اس رسم کو مانگ بھ
جاتا ہے۔ اس موقع پر نظمیں پڑھی جاتی ہیں اور مناسب موقع گیت گائے جاتے ہیں
میں بھی ڈھولک، اور کنیا زکمیشن کے موقعوں پر نظمیں پڑھنے اور نوجوانوں اور فاضل
پنڈتوں میں بحث کا دستور ہے خواہ یہ بحث محض دل لگی اور تفریح کی خاطر ہو یا سنجیدہ
رسم کی ادائیگی کے وقت ہندو اور مسلمانوں دونوں میں عورتوں کے گیت گانے کا دست
اور یہ گیت دونوں فرقوں میں یا تو ایک ہی ہوتے ہیں یا ایک جیسے جن کی لَے اور دھ
ایک ہوتی ہے۔

برات عام طور پر دلہن کے گھر سے ایک دن ٹھہر کر روانہ ہوتی ہے۔ دوسر
دن دولہا کو پھر منڈپ میں بٹھایا جاتا ہے اور کچھ اور رسمیں جن میں عورتیں حصہ لیتی ہیں
کی جاتی ہیں۔ یہ رسوم مذہبی نہیں ہوتیں لیکن عام ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف
پر انجام پاتی ہیں۔ ہندوؤں میں دولہا کے جسم پر اُبٹن لگایا جاتا ہے جس کی وہ صرف اس
وقت اجازت دیتا ہے کہ جب اسے کچھ نذرانہ ملے۔ شام کو عورتیں دولہا کو دلہن
کمرے میں لے جاتی ہیں اور کوہ بر کی رسم ادا کرتی ہیں۔ برات کے رخصت ہونے س
پہلے منہ دیکھی (منہ دکھائی) کی رسم ادا ہوتی ہے جس میں دولہا اور دلہن کو ساتھ س
بٹھایا جاتا ہے اور اس موقعہ پر دولہا کے رشتہ دار دلہن کا منہ دیکھتے اور منہ دکھا
دیتے ہیں۔ اب سب سے آخری رسم بدائی (وداع) کی ہوتی ہے یعنی رخصت۔ اس تما
عرصہ میں جب کہ برات دلہن کے گھر ہوتی ہے دلہن والے دولہا والوں کو کھانا دیتے
مسلمانوں میں بھی دولہا کو منڈوے میں لے جایا جاتا ہے اور رونمائی کی رسم ادا کی جا
ہے جس میں کہ دولہا دلہن دونوں ایک آئینے میں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں
دلہن اور دولہا کی رخصت کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یہ دستور ہے ک

دولہا کے ہمراہ بہت سے تحائف کر دئے جاتے ہیں جن میں اکثر و بیشتر گھریلو استعمال کی چیزیں مثلاً کپڑے لحاف، بچھونا، پکانے کھانے کے برتن اور پالکی جس میں بٹھا کر دلہن کو لے جاتے ہیں وغیرہ۔ ہندوؤں میں اکثر ایک گائے بھی دی جاتی ہے اور جو لوگ دے سکتے ہیں وہ گھوڑا، ہاتھی یا موجودہ زمانے میں موٹر کار بھی دیتے ہیں۔

مسلمانوں میں دلہن کو سیدھا دولہا کے گھر نہیں لے جاتے بلکہ راستے میں کسی جگہ مثلاً درگاہ پر ٹھہرا دیتے ہیں اور یہاں دولہا کے گھر کی عورتیں پانی اور آم کی شاخیں لے کر آتی ہیں اور کچھ رسم ادا کرتی ہیں۔ دولہا کے گھر پہنچنے پر دولہا کا بہنوئی گھر میں جانے کا راستہ روک کر کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت تک راستہ نہیں دیتا جب تک کہ نقد کی صورت میں اس کا حق اس کو نہ مل جائے۔ ہندوؤں میں بھی بہنوئی اسی طرح راستہ روکتا ہے اور اپنا حق لیتا ہے، اور لڑکا اور لڑکی کسی عبادت کی جگہ مثلاً مندر یا کالی استھان میں لے جائے جاتے ہیں۔

اس بیان سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہندو اور مسلمانوں کی رسمیں بالکل ایک سی اور ملتی جلتی ہیں، اور یہ سب کچھ اس بات کے باوجود ہے کہ اسلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے بلکہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ کٹر اور پکے مسلمان انہیں اسلامی تعلیم کے خلاف خیال کریں گے۔

ہندو مذہب جیسا کہ سب کو معلوم ہے زندگی ہی میں نہیں بلکہ بعد مرگ بھی شادی کی تنسیخ کی اجازت نہیں دیتا اور اس سبب سے کسی ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے اور بیواؤں کے عقد ثانی کے لیے خود پیغمبر صاحب کی اعلیٰ سند موجود ہے کیوں کہ انہوں نے بیواؤں سے شادیاں کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہندو رسم و رواج اور ہندو ماحول میں رہنے کا اتنا زبردست اثر مسلمانوں پر پڑا ہے کہ شمالی ہندستان میں تو ضرور ہی یہ ہے کہ گو بیوہ کے نکاح ثانی کی

میں ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہے بہت کافی حد تک ترقی کر چکا ہے۔ مثال کے طور پر صرف مسلمان بھنگی کا نام لے دینا کافی ہوگا جسے مسلمانوں میں بھی اس سے بدتر کوئی سماجی درجہ حاصل نہیں ہے۔ جو ایک اچھوت ہندو بھنگی کو ہندوؤں میں حاصل ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اسلام ان چیزوں کو گوارا کرتا ہو۔ یہ تو صرف ماحول کا اثر ہے جو ہندستان کے مسلمان قبول کرنے سے باز نہ رہ سکے۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی بڑی بڑی جماعتیں جو اسلام قبول کر کے ہندوؤں میں سے آئیں وہ اپنے ہمراہ بہت سے ہندو رسم و رواج لے گئیں اور وہ رسمیں ان سے ابھی تک نہیں چھوٹی ہیں اگرچہ اتنا لمبا زمانہ گذر گیا۔ اس کے ثبوت میں ملکانہ راجپوتوں کا ذکر کر دینا کافی ہے کہ جن کو پھر ہندو دھرم میں لینے کی بیس سال پیشتر کی ناکام کوششیں اس قدر تعلقات کی کشیدگی کا باعث ہوئی تھیں۔ یہ ملکانہ راجپوت آج تک اپنی بہت سی پرانی رسموں کے اسی طرح پابند ہیں کہ جس طرح اپنے ہندو ہونے کے زمانے میں تھے۔ یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ اس طرح کے گروہ اور بھی ہیں کہ جنھوں نے اپنی ہندوانہ رسموں کو نہیں چھوڑا ہے۔

یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض بڑے بڑے گروہ ایسے ہیں کہ جنھوں نے ابھی چند روز پیشتر تک اپنے اُن وراثت کے قانونوں کو نہیں چھوڑا تھا جن کی پابندی وہ اسلام میں داخل ہونے سے پیشتر کرتے تھے باوجود اس کے کہ اسلام کے اپنے قوانین وراثت موجود ہیں۔ سندھ، گجرات اور بمبئی میں خوجوں، کچھی میمنوں، اور بوہروں کی مسلم جماعتیں ہیں۔ جو دولت مند ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ ہندستان کے دوسرے حصوں میں تجارت کرتے ہیں، بلکہ غیر ممالک میں بھی جیسے کہ جنوبی اور مشرقی افریقہ، عرب، ایران اور ملایا وغیرہ میں

نہ ازروئے مذہب ممانعت ہے اور نہ سماج ہی ان کو اس سے روکتی ہے لیکن باعزت مسلم خاندانوں میں بیوہ کا عقد اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

کفن دفن کی ضروری رسمیں بھی ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں دفن سے پہلے جنازے کی نماز پڑھائی جاتی ہے۔ بعد میں بھی پھر دعائیں مانگی جاتی ہیں اور محتاجوں کو تیسرے اور چوتھے دن پھر دسویں اور چالیسویں دن کھانا کھلایا جاتا ہے اور مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا ہے۔ مجھے صحیح نہیں معلوم ہے کہ آیا بعدِ مرگ کی ان رسموں کا اسلام نے حکم دیا ہے یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنوں کے تعین کے لحاظ سے وہ بالکل ہندوانہ رسمیں معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ہندو بھی مقررہ دنوں پر، دوسرے، ساتویں، دسویں، بارہویں، تیرہویں یا تیسویں دن پانی اور پنڈا مرنے والے کی روح کو نذر کرنے کے بعد غریبوں کو کھانا کھلاتے اور خیرات تقسیم کرتے ہیں۔

ذات پات کے جھگڑوں سے بھی ہندستان کے مسلمان الگ اور پاک نہیں رہے ہیں۔ سید، شیخ، پٹھان، ملک، مومن، منصور، رائیں (راعی) قصاب، حجام دھوبی اور بیسیوں ان کے علاوہ بھی ذاتوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن سے مسلمانوں کے اندر ذاتوں کی تقسیم بتائی جا سکے۔ ان میں سے بعض تو محض اس پیشے کی بناء پر ہیں کہ جو کسی نے اختیار کر لیا ہے، اور ان کے علاوہ جو ہیں وہ نسل کی بنیاد پر ہیں۔ جس طرح کہ بیوہ کی شادی کا معاملہ اسی طرح یہ بھی ہے کہ مذہب یا سماج اس قسم کی شادیوں کو بالکل نہیں روکتی ہے جو ایک ذات یا فرقے کے مسلمان دوسرے فرقے میں کریں لیکن پھر بھی شادیاں اکثر اپنے ہی حلقہ کے اندر کی جاتی ہیں۔ اور شادی بیاہ سے بڑھ کر یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں میں بے تکلف اٹھتا بیٹھتا ہے تو اسے قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی الگ الگ بنے اور خود کو دوسروں سے علیحدہ کوئی چیز سمجھنے کا وہ احساس جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا؛ اور جو ذات پات بنانے میں

ان کے تجارتی کاروبار ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ ۱۹۳۷ء تک نہ صرف ہندو رسم و رواج کے بلکہ ہندو قانون وراثت کے بھی پابند تھے۔ اسی طرح سے بلوچی، اور بعض پنجابی مسلمان بھی اپنے رواجی قانون کی پابندی کرتے تھے۔ موپلوں پر "مارومکا تھایم" قانون کے ذریعہ حکومت ہوتی ہے۔ ابھی ۱۹۳۷ء میں یہ ہوا ہے کہ ایک قانون پاس کیا گیا ہے جس کے رو سے مسلمانوں پر شریعت کے قانون کی عمل درآمد ہوگی اگرچہ اس رسم یا رواج کے خلاف بھی کوئی چیز قانون میں ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ لیکن سب ہندو بھی تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانے پر نہیں بیٹھتے۔ یہ پرہیز ہمیشہ رہا ہے اور آج بھی موجود ہے اور نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے بلکہ ہندوؤں کی مختلف ذاتوں اور ایک ذات کی مختلف شاخوں تک کے درمیان موجود ہے۔ ایک برہمن ایک راجپوت کے ساتھ نہیں کھاتا۔ اور ایک راجپوت کسی بنئے یا کایستھ کے ساتھ ہم نوالہ نہیں ہوسکتا خود برہمنوں کے اندر ایک سکادو یپی برہمن ایک سرجوپاری کے ساتھ، ایک دکشنی برہمن ایک بنگالی یا میتھیلی برہمن کے ساتھ نہیں کھا سکتا، اور نہ وہ اس برہمن کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔ سرجوپاری برہمنوں کی یہ حالت کہ وہ کسی سرجوپاری کے ساتھ بھی نہیں کھا سکتے تاوقتیکہ وہ ان کا رشتہ دار نہ ہو، اور نہ سری واستو کالستھ، امبا مستھا یا کرن کایستھ کے ساتھ کھانے پر بیٹھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی غیر ہندو ان پرہیزوں کی تحقیقات کی کوشش کرے تو وہ اس گورکھ دھندے میں پھنس کر حیران رہ جائے گا۔ پرہیز صرف یہیں تک محدود نہیں ہے کہ ایک ذات والا دوسری ذات والے سے، یا کسی ذات کی ایک شاخ والا اسی ذات کی دوسری شاخ والے سے پرہیز کرے بلکہ یہ چھوت چھات کھانے کی مختلف

چیزوں اوران کے پکانے کے طریقوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بہار میں روٹی اگر گھی میں تلی ہوئی ہے تو اسے تو اس حالت میں بھی کھالیا جا سکتا ہے کہ کسی دوسری ذات والے نے اسے چھولیا ہو لیکن اگر وہ آگ پر سینکی گئی ہو تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا۔ بنگال میں اس قسم کی چھوت نہیں مانی جاتی۔ بعض ترکاریاں اگر وہ بغیر نمک کی آمیزش کے پکی ہیں تو کھالی جا سکتی ہیں لیکن اگر ان میں نمک ڈال دیا گیا تو پھر حرام ہو جاتی ہیں۔ صوبوں صوبوں کی چھوت چھات میں بھی فرق ہے اور ذاتوں ذاتوں کے قاعدے قانون بھی الگ الگ ہیں، اور کھانے پینے کی چیزوں کے بھی علیحدہ علیحدہ قوانین ہیں۔ کوئی ایسا شخص کہ جو ہندوؤں کے اندر پیدا نہ ہوا ہو اور انہی میں رہ کر پلا بڑھا ہو ان پرہیزوں کو سمجھنا تو بڑی چیز ہے جان بھی نہیں سکتا اور نہ وہ اصول اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں (اگر انہیں اصول کہا جا سکے) کہ جو ان پرہیزوں کی بنیاد ہیں۔ اس لئے یہ کچھ بھی تعجب کی بات نہیں ہے اگر کوئی کالیستھ اس بات سے نہ آزردہ ہو اور نہ اسے اپنی توہین خیال کرے کہ ایک راجپوت نے اس کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا نہ کھایا، یا اس کے برعکس کالیستھ نے ایک راجپوت کے ہاتھ سے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا اور اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے اور اسی لئے اس میں کچھ توہین یا تحقیر انہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اچھوت ذاتیں بھی تو اب سے چند روز پیشتر تک بغیر ذرا سی شکایت یا ناراضی کے اس تحقیر کو بجا اور جائز خیال کرتی تھیں جو ان کے نصیب میں آتی تھی۔ میں نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے وہ ہندو عوام کے متعلق ہے اور وہ لوگ اس کے ضمن میں نہیں آتے جنہوں نے موجودہ زمانے کی تعلیم حاصل کی ہے یا جن پر ذات پات کی کانفرنس یا اصلاحات کی تحریکوں کا اثر ہے جیسے برہمو سماج یا آریہ سماج اور یا مہاتما گاندھی کی مساوات کے قائل ہو چکے ہیں۔ ان تعلیم یافتہ یا اصلاح پذیرفتہ ہندوؤں نے اکثر اپنی زندگی میں ان پرہیزوں کو بالکل ترک کر دیا ہے

اور بہت سے ایسے لوگ بھی جو عملاً چھوت چھات کی پابندی کرتے ہیں اسے عقلاً درست نہیں خیال کرتے۔

وہ مسلمان بھی کہ جن کا ہندوؤں سے ربط وضبط ہے اور ہندو سماج کی ریت رسم سے واقف ہوگئے ہیں ان پرہیزوں کے معاملے میں ان کا رویہ بھی ہمدردانہ ہے اور باہمی برتاؤ میں اس کا برا نہیں مانتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس چھوت چھات سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک رواج ہے جو باپ دادا کے وقت سے چلا آیا ہے اور ہندوؤں نے اسے اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے وہ ہندوؤں کے یہاں شادی بیاہ یا دوسرے خوشی کے موقعوں پر جب بلائے جاتے تھے تو بے تکلف اور بلا تامل شریک ہوتے تھے اور اسی قسم کے موقعوں پر اپنے یہاں ہندوؤں کی دعوت کرتے تھے۔ پرخلوص سماجی تعلقات کی راہ میں کھانا پینا کوئی رکاوٹ نہیں بنا تھا۔ ہندو ہمیشہ اپنے مہمانوں کے لئے اپنی ذات پات کے قواعد کی پوری پابندی کے ساتھ کھانا پیش کیا کرتے تھے، اور اسی طرح مسلمان بھی ان باتوں کا پورا لحاظ کرکے اپنے ہندو دوستوں کی دعوت کرنے کے عادی تھے۔ یہاں پھر میں یہی بات دہرانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے عام اور سیدھے سادے مسلمانوں کے متعلق ہے، اور موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی حالت پر شاید صادق نہ ہو۔ جو کچھ میں نے اب تک کہا ہے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ میں ذات پات کی بندھنوں کو حق بجانب ثابت کرنا یا ان کی خرابیوں کو ہلکا کرکے دکھانا چاہتا ہوں بلکہ میں نے حالات و واقعات جیسے کچھ بھی وہ تھے بیان کر دیئے ہیں۔ لیکن اب حالات اور ان کے ساتھ ساتھ خیالات اور باہمی برتاؤ کے طرز میں بھی فرق آ گیا ہے۔ اس لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ تاحد امکان اس قسم کی تفریق و امتیاز دور کیا جائے، اور جس قدر جلد دور ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے بالخصوص اس لئے کہ ہندو مسلمان

دونوں میں ایسے لوگوں کی تعداد روز افزوں ہے جو ان کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہاں یہ بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے کہ انھیں بطور ایسے ایک عنصر کے بہت زیادہ اہمیت دی جائے جو دونوں قوموں کی باہمی مصالحت، خوش دلی، اور ہمدردانہ تعلقات کے راستے میں حائل ہے۔

ایک ایسے گاؤں میں کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہوں۔ اور ایسے گاؤں بے شمار ہیں ان صوبوں میں بھی کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ان صوبوں میں بھی کہ جہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے ——— یہ روزمرہ کی نظر آنے والی بات ہے کہ وہاں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان حقیقی اور دلی دوستانہ تعلقات اور ہمسلگی کی اخوت موجود ہے اور ایک ہندو اسی طرح بے جھجک اپنے مسلمان پڑوسی کو بھائی، چچا اور کاکا کہتا ہے کہ جیسے ایک مسلمان اپنے ہندو پڑوسی کو انہی ناموں سے خطاب کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے نام ایسے ہیں کہ جو دونوں حریفوں کے لوگوں میں مشترک ہیں اور یہ چیز خصوصیت کے ساتھ نیچے طبقے کے لوگوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہندو نام مسلمانوں نے یا تو رکھ لئے ہیں یا ان کے ہندوانہ زمانے کی یادگار کے طور پر باقی ہیں اور اسی طرح بہت سے مسلمان نام ہندوؤں نے اختیار کر لئے ہیں۔ یہ چیز صرف عرف یا کنیت یا خطاب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ لوگوں کے اصلی اور حقیقی ناموں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ آدمیوں ہی پر کیا موقوف ہے گاؤں، شہر، تالاب، اور بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہر اس چیز کے نام کہ جو اپنا الگ ایک نام رکھتی ہے اس کا یا تو ہندوانہ نام ہے یا اسلامی، یا ایسا نام ہے کہ جو آدھا اسلامی ہے اور آدھا ہندوانہ، بلا لحاظ اس بات کے کہ اس گاؤں کی آبادی مسلم ہے یا ہندو اور اس چیز پر قبضہ ہندو کا ہے یا مسلمان کا یا جیسا کہ بہ کثرت دیکھنے میں آتا ہے دونوں فریقوں کی ملی جلی آبادی ہے۔

پرانی دیہاتی زندگی اب شکست و ریخت ہوتی جا رہی ہے۔ چونکہ میں بہار کے ایک

گاؤں میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا اور اب تک بھی دیہات سے میرا تعلق قطع نہیں ہوا ہے اس لئے میں وہاں کی عام زندگی کے حالات بیان کرنے کی جسارت کرتا ہوں جیسے کہ وہ ایک مدت پیشتر تک تھے جبکہ میں ایک لڑکا ہی سا تھا۔ اور اب بھی پورے طور پر مٹے نہیں ہیں۔ ہر ایک گاؤں بجائے خود مکمل اور اپنی دنیا آپ ہوتا تھا۔ اس کی اپنی زمین ہوتی تھی جس پر اس گاؤں کے لوگ کاشت کرتے تھے، اس کی اپنی چراگاہیں مویشیوں کے لئے ہوتی تھیں، اور اس کے اپنے مزدور اور کاریگر اور مختلف پیشہ ور لوگ ہوتے تھے۔ اس طرح ہر ایک گاؤں میں آپ کو کاشتکار، مزدور، زمیندار اور برہمن مل سکتے تھے اور بہ کثرت دیہات میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد تھے۔

ہر گاؤں کا اپنا ایک بڑھئی، اپنا لوہار، اپنا حجام، اپنا دھوبی، اپنا کمہار، اپنا منہار، اپنا بھڑ بھونجا، اور اپنا تیلی ہوا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ بھنگی، چمار، اور ڈوم بھی ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص کام دیہاتی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ اور بالعموم فصل کی تیاری پر ان لوگوں کو کسانوں سے اپنی محنت مزدوری کا صلہ غلّہ کی شکل میں ملا کرتا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کی خدمات کی خوشی اور تقریبوں کے موقعوں پر جیسے کہ بچے کا پیدا ہونا، شادی، غمی وغیرہ میں ضرورت ہوتی تھی، اور ان خدمات کے لئے انہیں اس شخص کی حیثیت کے مطابق کہ جس کے یہاں تقریب ہو انعام و اکرام بالائی آمدنی کے طور پر ملا کرتا تھا۔ ان کام کرنے والوں میں سے بعض مسلمان بھی ہو سکتے تھے لیکن وہ بلا تامل ہندوؤں کے کام کرتے تھے اور اسی طریق پر صلہ پاتے تھے۔ مثال کے طور پر حجام ہی کو لے لیجئے جو ہندوؤں کی بہت سی رسوم میں ایک بڑی اہم شخصیت ہے۔ چوڑا کرن (پہلی مرتبہ بچے کے بال اتروانا) کی رسم کے موقع پر جس کے ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں بچے کو جنیو ڈالنے کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے۔ حجام ہی سب کچھ کرتا دھرتا ہے۔ شادی کے موقع پر بھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی

حدتک تمام رسموں میں وہ کچھ نہ کچھ خدمت ضرور انجام دیتا ہے۔ کریاکرم کے وقت مردہ کا سر منڈوانا ہر ایک ذات کے ہندوؤں میں ایک ضروری رسم ہے اور قدرتی طور پر اس کے لئے حجام ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ شرادھ کے موقع پر نذر نیاز اور پنڈے کے متعلق بہت سے کام کرتا ہے۔ ایسے بہت سے گاؤں ہیں جن میں کوئی ہندو نائی نہ ہو۔ وہاں مسلمان نائی ہی سب وہ کام سوائے کھانا یا پانی دینے کے انجام دیا کرتا ہے۔ جو ہندو نائی سے متعلق ہیں۔ ہندوؤں کو اس سے کام لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا نہ وہ اسے اپنے مذہب یا رواج کے خلاف خیال کرتے ہیں اور نہ وہ مسلمان حجام ہی ایسے کام کرنے سے انکار کرتا ہے جن میں سے بہت سے مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسلام کی شریعت کے خلاف ہوں۔ چوڑیاں پہننا ہر ہندو عورت کے لئے لازمی ہے اگر اس کا خاوند زندہ ہو۔ شادی کے یا دیگر مبارک موقعوں پر کہ جب چوڑیاں بدلنا ضروری ہوتا ہے یا عام طور پر روزمرہ کے پہننے کے موقعوں پر بھی جو لوگ چوڑیاں پہناتے ہیں وہ مسلمان ہی ہوتے ہیں جن کی عورتیں اس کام کے لئے ہندو گھروں میں جاتی ہیں اور متمول ہندو گھرانوں میں بھی جاتی ہیں جن میں سخت پردے کا رواج ہے۔ اسی طرح دھوبی اور بھنگی بھی ہندو اور مسلمان دونوں ہو سکتے ہیں، اور دونوں اپنا معمولی کام بھی اور تقریبوں کے موقعوں پر مخصوص کام بھی بلا اس امتیاز کے انجام دیتے ہیں کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ایک اور ذات بھی ہے جسے مالی کہا جاتا ہے جو باغ کا کام کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اور پھولوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ان کے ذمہ یہ کام ہے کہ نہ صرف تقریبوں کے موقعوں بلکہ تمام مذہبی کاموں اور روزانہ کی پوجا پاٹ کے لئے بھی پھول مہیا کریں۔ مالی بھی یہ خدمات بلا اس لحاظ کے انجام دیتا ہے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ ہندوؤں کو اپنے دیوتاؤں پر چڑھانے کے لئے مسلمان مالی سے پھول خریدنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، اور نہ مسلمان ہی کو اس پر کوئی اعتراض ہوتا ہے کہ

بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اسے ترکی کے اتباع میں پہننا شروع کیا تھا اور ترک اسے خود ہی چھوڑ چکے۔

پاجاموں کا استعمال مسلمانوں میں ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ عام ہے اور بعض مقامات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن پاجامہ پہننے والے ہندوؤں کی تعداد بھی کچھ تھوڑی سی نہیں ہے اور یہ بھی ہے کہ سب مسلمان بھی پاجامہ نہیں پہنتے دھوتی جس کا نام ہی سنسکرت زبان سے نکلا ہے اور جو ہندوؤں کی مخصوص پوشاک بھی ہے اسے ہندستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت بھی کسی نہ کسی شکل میں پہنا کرتی ہے، اور اس کی شہادت ہر وہ شخص دے سکتا ہے جو دیہات میں گیا ہو اور قصبوں اور گاؤں کے مسلمانوں سے اسے واسطہ پڑا ہو، لیکن یہ لباس دیہات میں زیادہ ہے۔

جسمانی آرائش اور سنگھار کی چیزوں کی یکسانیت پردے کی موجودگی کے باوجود حرم میں داخل ہو گئی ہے۔ بہت سے زیورات مسلمان اور ہندو عورتوں میں مشترک ہیں اور ان میں سے بہت سوں کے نام یا تو ہندو ماخذ سے نکلے ہوئے ہیں یا مسلم ماخذ سے، اور ان کے وہی نام بدستور چلے آتے ہیں خواہ پہننے والیاں ہندو خواتین ہوں یا مسلمان اسی طرح ساڑی باندھنے کا رواج تمام ہندستان کی عورتوں میں عام ہے، اور جن مقامات پر شمال مغربی ہندستان کی طرح عورتیں پاجامے پہنتی ہیں تو وہاں تنہا مسلم خواتین ہی اسے نہیں پہنتیں بلکہ سکھ اور ہندو خواتین بھی۔ پہاڑی مقامات پر بھی تمام عورتیں پاجامے ہی پہنتی ہیں اور اس کا باعث ان مقامات کی سخت سردی ہے۔

پردہ

ایک مستقل رسم جو غیر ملکی سیاح کو جو ہندستان میں آئے حیرت میں ڈالے گی۔ وہ پردہ ہے جسے بعض مقامات پر گوشہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خالصتہً مسلمانوں کی رسم ہے اگرچہ یہ

اس سے خریدے ہوئے پھول یا تو مندر میں کسی بت پر چڑھائے جائیں گے یا کسی اور مذہبی رسم میں کام آئیں گے۔ یہ حالات صدہا سال سے ہوتے آئے ہیں، اور یقینی طور پر دونوں فرقوں میں گہرے دوستانہ تعلقات کا نتیجہ ہیں۔

لباس

لباس پر سب سے زیادہ اثر اس آب وہوا کا ہوتا ہے کہ جس میں پہننے والے زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندستانی صوبے صوبے کا لباس مختلف، اور بڑی حد تک پہننے والوں کی مالی حیثیت پر منحصر ہے۔ سماج کے نیچے کے طبقے میں اور غریب لوگوں میں لباس کا فرق زیادہ نہیں ہوتا اور نہ اعلیٰ طبقے کی پوشاک میں باہم کچھ فرق ہوتا ہے۔ حقیقی اور بہت زیادہ نمایاں فرق ایک اچھے امیر آدمی، اور ایک نادار مفلس کی پوشاکوں میں ہوتا ہے۔ کوئی کسی غیر ملک کا آدمی عام طور سے پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سچدا نند سنہا کے ہندستانی لباس میں یا پنڈت جواہر لال نہرو یا کمار گنگا نند سنہا صدر بہار پراونشل ہندو مہا سبھا اور نواب محمد اسمٰعیل یا چودھری خلیق الزماں جو کہ مسلم لیگ کے درخشندہ تارے ہیں، یا سر علی امام یا خود قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کے لباسوں میں کوئی فرق نہیں محسوس کر سکتا اسی طرح اسے سردار سر دول سنگھ کولشر، اور مولانا ظفر علی خاں یا مولانا ابوالکلام آزاد کی پوشاک میں سکھوں کی پگڑی کے سوا اور کوئی فرق نہ نظر آئے گا۔ اگر یہی غیر ملکی بہار یا بنگال یا پنجاب یا صوبۂ متحدہ کے کسی گاؤں میں جائے جہاں کہ مسلمان کسان اپنا کھیت جوتنے میں مصروف ہو تو وہ اسے کسی ایسے لباس میں نہ پائے گا جو اس کو اس کے ہم پیشہ و ہم وطن ہندو سے ممتاز کر سکے۔ میں نے ترکی ٹوپی کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ہندستانی لباس میں داخل نہیں ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ سے کچھ مسلمانوں نے

ضروری ہو کہ ہندستان میں اصل پردہ سے بے نیاز ہو کر اپنے قواعد وضوابط یہاں پردہ نے خود بنا لیے ہیں مجھے بتایا گیا ہو کہ اسلامی شریعت کے مطابق عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ممانعت نہیں ہے، صرف اتنا ہو کہ وہ اپنا چہرہ اور جسم نقاب یا برقعہ کے ذریعے چھپائے رہیں لیکن ہندستان میں عام طور پر انہیں کسی صورت میں بھی گھر سے قدم باہر نکالنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن اس کی پابندی انہی عورتوں سے ممکن ہے کہ جن کا کام گھر میں بیٹھے رہنے سے چل سکے۔ غریب عورتیں جن کا کام نہیں چل سکتا انہیں مجبوراً باہر نکلنا پڑتا ہے۔

قدیم ہندو رسوم میں پردہ بالکل داخل نہیں ہے بلکہ درحقیقت سنسکرت زبان کا ادب ایسے اذکار سے بھرا پڑا ہو کہ عورتیں آزادانہ باہر نکلتی اور اپنے خاوندوں کی ایسے سب کاموں میں شریک رہتی تھیں جن میں عورتیں شریک ہو سکتی ہیں۔ پردے کی موجودہ رسم ہندوؤں نے مسلمانوں سے لی ہے اور انہی مقامات پر سختی کے ساتھ اس پر عملدرآمد کیا جاتا ہے کہ جہاں مسلمانوں کا زیادہ اثر رہا ہے۔ جنوبی ہند میں کہ جہاں مسلمانوں کا اثر کم پہنچا تھا پردے کا رواج بہت ہی کم ہو۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جو مسلمانوں کی تقلید کرنا پسند کرتے ہوں۔ اس زمانے میں پردہ اٹھا دینے کی اصلاحی تحریک ہندوؤں میں بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ آسانی سے پھیلتی جا رہی ہو کیونکہ ہندو مذہب کے خلاف اسلام نے پردے کو کسی نہ کسی صورت میں جائز قرار دیا ہو۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ دونوں فرقوں کا ایک دوسرے پر بہت کافی اثر پڑا ہو اور اپنے تمام مذہبی اختلافات کے باوجود کہ جن کی وجہ سے ان کے بہتیرے رسم ورواج بھی جداگانہ سانچوں میں ڈھل گئے تھے دونوں نے مل جل کر امن اور چین سے زندگی بسر کرنا اختیار کر لیا تھا۔ پھر بھی یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ دونوں فرقے کبھی مل کر ایک نہیں ہو گئے تھے، اور دونوں میں ایک

بھی ایسا نہ تھا کہ دوسرے کو اپنے اندر کلیتہً جذب کر لیتا۔ یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ کبھی ایسا ہو سکے گا۔ اس حقیقت کا علم کہ اسلام ایک غیر ملک کا مذہب ہے اور اس میں اپنے پیروؤں کی زندگی کو باقاعدہ کرنے اور ان پر حکومت کرنے کے لئے اپنی الگ ایک شریعت موجود ہے جس کا پس منظر ہندو مذہب سے بالکل مختلف ہے، اس بات کو اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور بنا دیتا ہے کہ وہ ہندو مذہب میں جذب ہو سکے یا ہندو مذہب کو اپنے اندر جذب کرے۔ ہندوؤں کا ادب، فلسفہ، اور مذہب بہت ہی ترقی یافتہ ہیں اور کروڑوں آدمی ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کے دامن سے وابستہ ہیں۔ ہندو مذہب نے ان سب منکر فرقوں کو اپنے اندر جذب کر لیا جو سرزمین ہند پر وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے۔ ہندو مذہب کا بدھ مذہب کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کے ضمن میں پروفیسر رہائس ڈیوڈس (*Rhys Davids*) نے لکھا ہے کہ "ہندو مذہب خیال کی اور خیال کے اظہار کی سب سے زیادہ کامل آزادی دیتا ہے جیسی کہ دنیا میں کہیں موجود نہیں [۱] ہے۔"

یہ مذہب ویدوں اور اُپنشدوں کے سب سے ابتدائی زمانے سے آیا ہے اور فلسفہ اور خیال کے مختلف دھاروں کی ترقیوں کی توضیح اور تشریح کرتا ہے۔ اس لئے معتقدات کا کوئی بھی ضابطہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جسے ہندو ضروری ہی قبول کر لیں۔ لیکن ہندو مذہب شخصی اور سماجی رواجوں کے کچھ قواعد کی پابندی پر زور دیتا ہے جو ہر زمانے اور ہر مقام پر مختلف ہوتے رہے ہیں تاکہ فوری ضروریات اور ناگہانی اتفاقات کی مطابقت سے کام دے سکیں۔ اس لئے ہندوؤں کے اندر سماجی اصلاح کی بہت

---

[۱] رہائس ڈیوڈس کی کتاب "بدھسٹ انڈیا" (*Buddhist India*) صفحہ ۲۵۰۔

بڑی صلاحیت ہے، اور ہندو مذہب کا یہی لچکیلا پن ہے جس نے ہندو سماج کو اس بات میں ہمیشہ مدد دی ہے کہ خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لے اور اس بات میں بھی مدد دی ہے کہ بہت سے دوسروں کو جن کے پاس اس قسم کا اور اتنا قدیم فلسفیانہ اور مذہبی پس منظر نہ تھا اپنا جیسا بنا لے۔ اپنے اندر سے پیدا ہونے والے منکر فرقوں کو جذب کر لینے میں اسے بہت ہی بڑی مدد اپنی اس آزادی خیال اور اس صلاحیت سے ملی جو اسے ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے کے متعلق حاصل ہے یہاں تک کہ اسے منکرین کے فرقوں کے بانیوں کو معتقد بنانے میں کچھ تامل نہیں ہوتا جیسے کہ اس نے بدھ مذہب کے ساتھ کیا۔ بدھ کو ایک اوتار تسلیم کیا گیا حالانکہ ہندو کتابوں سے ایسے اقتباسات نقل کئے جا سکتے ہیں جن میں بدھ کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ جھگڑا اپنی علامات کے لحاظ سے اس جھگڑے سے مشابہ ہے جو دوسروں کو اپنا جیسا بنا لینے کے زمانے میں جاری تھا۔ اور آج بدھ مذہب یعنی اس کا فلسفہ اور اخلاق کا قانون اتنے مکمل طور پر ہندو مذہب میں جذب ہو گیا ہے کہ بدھ کی جائے پیدائش میں شاید ایک شخص بھی بدھ مذہب کا پیرو باقی نہیں ہے۔ بدھ مذہب ہندو مذہب سے نکلا تھا اور اس کے فلسفے کا پس منظر پورے طور پر ہندوانہ ہے بہ اعتبار خیال بھی اور بہ اعتبار اظہار بھی۔ اس لئے ہندوستان میں وہ آسانی سے ہندو مذہب میں جذب ہو گیا۔ لیکن دوسرے ملکوں میں جا کر بطور ایک نئے مذہب کے خوب پھلا پھولا جہاں اس کے کسی دوسرے مذہب کے اندر جذب ہونے یا کسی کو اپنے اندر جذب کر لینے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس قسم کے پس منظر کے ساتھ ہندو مذہب نہ اسلام کو اپنے اندر جذب کر سکا نہ کر سکتا ہے اور نہ اسی کے اندر خود جذب ہو سکا نہ ہو سکتا ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ایسا ہوتا کہ یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے اور ترقی کرتے رہتے یہ دونوں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے اور میرے خیال میں یہ ان دونوں

میں سے کسی کو فائدہ نہ پہنچائے گا کہ بھولی بسری باتوں اور واقعات کو جو ان کی صدیوں کی ساتھ ساتھ رہنے کی تاریخ میں پیش آئے تھے اب کرید کرید کر نکالا جائے اور ان کے دو الگ قومیں ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے یا مفت کی باہمی رقابت اور دشمنی پیدا کی جائے۔ اس سے یہ بہت زیادہ مفید اور یقینی طور پر بہت زیادہ شریفانہ بات ہوگی کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ دونوں فرقے صدہا سال تک ساتھ ساتھ رہے ہیں اور دوستی اور خوش دلی کے ساتھ رہے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ یہ حقیقت سمجھ لینے کے قابل ہے کہ آئندہ زمانے میں بھی دونوں میں سے کسی ایک کے لئے ساتھ ساتھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

میں اس باب کو اس سے بہتر کسی طریق پر ختم نہیں کر سکتا کہ تواریخ کے دو مشہور پروفیسروں کی کتابوں سے اقتباسات پیش کروں۔ ان میں سے ایک ہندو ڈاکٹر تارا چند ہیں جن کی کتاب سے اس کتاب میں اکثر اقتباسات کئے گئے ہیں، اور دوسرے ایک مسلمان مسٹر صلاح الدین خدا بخش قانون اور اسلامی تاریخ کے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب لکھتے ہیں:-

ہندستان کی ہر شعبۂ زندگی پر مسلمانوں کا اثر اس قدر زیادہ پڑا ہے کہ خواہ اسے ہم کسی قدر بھی بڑھا چڑھا کر بیان کریں پھر بھی وہ مبالغہ نہ ہوگا لیکن یہ اثر سب سے زیادہ صاف اور واضح طور پر لوگوں کے رسم و رواج، گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے کاموں، موسیقی، وضع و لباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کی رسموں، میلوں اور تہواروں، اور مرہٹہ راجپوتوں اور سکھ راج کماروں کے شاندار آداب و رسوم میں نظر آتا ہے۔ بابر کے عہد میں ہندو مسلمانوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور نقطہ ہائے خیال اس درجہ یکساں ہو گئے تھے کہ

وہ ان کے "ہندستانی طریقوں" کو عجیب خیال کرنے پر مجبور ہوا تھا، اور اس کے جانشینوں نے اس کے اس ترکہ یعنی ہندستان کو اس قدر آراستہ اور دولت مند کر دیا کہ آج ہندستان بجا طور پر اس میراث پر ناز کر سکتا ہے جو انہوں نے اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑی[1]"

صلاح الدین خدا بخش صاحب نے لکھا ہے:-

"ہم سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں، اور ہندوؤں سے اسی طرح الگ اور ممتاز ہیں کہ جس قدر سامی نسل آرین نسل سے، اور یہ کہ ان کے یہ باہمی فرق اور امتیاز زندگی کی جڑوں تک پہنچے ہوئے ہیں، عادتیں مختلف ہیں، مزاج مختلف ہیں، سماجی رسم و رواج مختلف ہیں، نسلی خصوصیات جداگانہ ہیں، اور یہ کہ یہ تمام فرق اور باہمی اختلافات اس قدر زیادہ ہیں کہ دونوں کا باہم دگر مل جانا ناممکن، اور کبھی پوری نہ ہونے والی توقع ہے۔ لیکن مجھے تو کسی طرح بھی یقین نہیں آسکتا کہ یہ دلیل صحیح اور محکم ہے۔ یہ بات ہمیں تسلیم ہے کہ مسلمان اس ملک میں غیر ملکی فاتحین کی حیثیت سے آئے تھے، اور ہندوؤں سے اسی قدر مختلف تھے کہ جیسے انگریز ہم دونوں سے مختلف ہیں؛ لیکن اس حقیقت کو کس طرح بھلا دیا جائے کہ صدہا سال تک وہ ان کے ساتھ ساتھ اس طرح مل جُل کر رہ چکے ہیں کہ قدرتی طور پر ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا رہا ہے، انہوں نے ہندستانی عورتوں سے شادیاں کی ہیں، ہندستان کے رسم و رواج کو اپنا لیا، اور ان کی رگ رگ میں ہندستانی خصوصیات اور ہندستانی خصلتیں پیوست ہو چکی ہیں۔ اس بات کا سب سے زیادہ ناقابل تردید ثبوت ہمیں مسلمانوں کی

---

[1] ڈاکٹر تاراچند کی کتاب صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲ -

شادی بیاہ کی رسموں میں ملتا ہے جو کہ سرتاپا ہندوانہ رسمیں ہیں، نیز عورتوں کی مخصوص رسموں میں مثلاً شادی شدہ زندگی کی علامت کے طور پر سیندور کا استعمال، اور بیوہ عورتوں پر خوراک و لباس کے متعلق پابندیاں، بیوہ کے عقد ثانی سے پرہیز ہی نہیں، بلکہ اسے عجیب خیال کرنا، اور اسی طرح کی اور ہزاروں زنانہ رسموں میں قدم قدم پر یہی ثبوت ملتا ہے۔ یہ تمام چیزیں صرف سطحی اور ظاہری تعلقات کی بنا پر وجود میں نہیں آسکتیں بلکہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دونوں قوموں کے درمیان کوئی گہرا رشتہ اور قلبی تعلق ہے۔ اس سے بھی زیادہ واضح ثبوت زبان کا ایک اور وضع و لباس کا یکساں ہونا ہے۔ اور اس کے علاوہ، کہنے کو خواہ کوئی کچھ بھی کہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں سے بہت سے ہی نہیں، بلکہ ان کی مردم شماری کا بہت ہی بڑا حصّہ وہ لوگ ہیں جو ہندو سے مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ کوئی فرضی یا قیاسی بے بنیاد بات نہیں بلکہ مستند اور مسلّمہ واقعہ ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام باہم ایک دوسرے پر اثر انداز اور اثر پذیر ہوتے رہے ہیں جس کی وجہ سے سماج کے قواعد و ضوابط ڈھل گئے ہیں، اور جس کی وجہ سے مذہبی خیالات ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ اور یہ رنگین تصویر ان دو دریاؤں یعنی ہندو مذہب اور اسلام کی ہے جو مسلمانوں کی ہندستان میں آمد کے بعد سے پہلو بہ پہلو بہتے رہے ہیں۔"[۵]

---

[۵] ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی کتاب سم ایمی نینٹ بہار کنٹیمپوریریز" (Some Eminent Bihar Contemporaries) کے صفحات ۱۸۵ - ۱۸۶ - پر ایک اقتباس شائع کیا ہے۔

کیا یہ تمام خوب صورت تانا بانا جسے صد سال میں بے شمار مردوں اور عورتوں نے جن میں ہندو مرد و زن بھی تھے اور مسلمان مرد و زن بھی اپنے غیر ارادی عمل اور نامحسوس کوششوں سے بُن کر ایک نفیس اور نایاب کپڑا جسے ہم اپنی سماج کہتے ہیں تیار کیا ہو اسی کا مستحق ہے کہ اسے سیاسیات کے ظالم، بیدرد، اور نافہم ہاتھوں میں دیدیا جائے کہ وہ اسے پھاڑ چیر کر دھجیاں بکھیر دے؟

(۳) زبان

وہ زبان جو شمالی ہندستان میں آج کل بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہو اسے خواہ کسی نام سے بھی پکارا جائے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ کوشش کی پیدا کی ہوئی نہ بھی ہو تب بھی اس پر سب سے زیادہ اثر ہندو مسلمانوں کی متحدہ کوششوں ہی کا پڑا ہو۔ اس کا ماخذ سنسکرت اور سنسکرت کی شاخیں پراکرت اور پالی زبانیں ہیں جو کہ اس زمانے میں رواج پا گئی ہیں جبکہ سنسکرت عوام کے بولنے کی زبان نہیں رہی تھی۔ مسلم حملہ آوروں اور فاتحوں کی اپنی اپنی دہی زبانیں تھیں کہ جس جس قبیلے سے ان کا تعلق تھا، لیکن ان میں سے ہر ایک پر فارسی کا زیادہ اور عربی کا کم کم اثر تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے عہد میں سرکاری زبان فارسی تھی اور اونچے خاندانوں کے ہندو بھی کثرت سے اسے پڑھتے اور حاصل کرتے تھے بالخصوص وہ ہندو جن کا حکومت سے اور حکمرانوں سے قریبی واسطہ اور تعلق تھا۔ لیکن وہ کبھی عوام کی زبان نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کے اندر زیادہ تعداد ایسے ہی مسلمانوں کی تھی جو ہندستان میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس زمانے کے مسلمان عوام کی زبان بھی فارسی نہ تھی۔

اس لئے قدرتی طور پر ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جس میں ملک کے حکمران اور محکوم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ باہم بات چیت کر سکیں۔ دونوں نے مل کر بول چال کے لئے ایسی زبان کو ترقی دینا شروع کیا، اور اس قدر ابتدائی زمانے ہی میں جیسا کہ امیر خسرو کا زمانہ تھا وہ اتنی ترقی کر چکی تھی کہ امیر خسرو نے اس میں شعر کہے ہیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے، کیونکہ آج کل وہ دو زبانیں خیال کی جاتی ہیں، حامی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی میں، اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ وہ الگ الگ دو زبانیں ہیں، ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ ہے۔ چونکہ اپنے مذہبی احکام کے متعلق ہندوؤں کو سنسکرت کی طرف، اور مسلمانوں کو عربی اور فارسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دونوں ماخذوں سے الفاظ اس میں داخل ہوتے رہتے درحالیکہ اس کا اپنا ڈھانچا اصلی حالت پر قائم رہتا۔ وہ اصلی ڈھانچا جس پر کہ زبانوں کی عمارت بنتی ہے زبان کی دونوں صورتوں یعنی اردو اور ہندی میں بالکل ایک ہے۔ فرق و امتیاز جو کچھ ہے وہ تھوڑے سے الفاظ میں ہے۔ اسی لئے شمالی ہندوستان میں ایسا ہے کہ صرف ایک زبان ہے کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں گفتگو کرتے ہیں اگرچہ تعلیم یافتہ لوگ اپنی اپنی تحریروں میں سنسکرت اور عربی اور فارسی کے الفاظ اپنی اپنی تعلیم کے مطابق کم یا زیادہ تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایک ایسی چیز کے متعلق بھی اختلافات کھڑے کر لئے جائیں کہ جو بالکل صحیح طور پر ہندو مسلمان دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ بھی، اور ہونا بھی چاہیئے۔

ہندی کی طرف سے لڑنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے اور کسی وقت میں بھی مسلمانوں کے اس احسان سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے جو ہندی زبان اور ہندی ادب کو ترقی دینے کے صورت میں انہوں نے امیر خسرو کے وقت سے لے کر آج تک

کیا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے اس مجموعۂ نظم میں مل سکتی ہے جو انھوں نے "کبیتا کومدی" کے نام سے شائع کی ہے جس میں ہر زمانے کے مسلمانوں کا کلام ہے۔ اس مجموعے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے نہ صرف وہ زبان اپنے اشعار میں استعمال کی ہے کہ جسے ہندی کے ادیب ہندی کہتے ہیں، بلکہ اس میں بعض ایسی مذہبی نظمیں بھی شامل ہیں جن کا اصل مضمون ہندوانہ ہے یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سیتارام اور رادھا کرشن ہی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے بیشتر ہندو ادب کے لئے موضوعات مہیا کئے ہیں۔ ایک مختصر کتاب جوان پانچ جلدوں کے مجموعے میں شامل ہے کہ جو گورکھپور کے گیتا پریس نے شائع کیا ہے۔ اس میں صرف مسلمانوں کے لکھے ہوئے مذہبی بھجن ہیں اور ہندو مذہب کا دلدادہ ان سے لطف اندوز ہونے اور ان سے روحانیت کا سبق حاصل کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ رحمان کے دوہے شمالی ہند میں ظرافت طبع اور عقل آموزی کے لئے اسی طرح گھر گھر میں پیرے ہوئے ہیں جس طرح گردھر کے سویئے۔ کبیر کا نام ایک مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے اس سے پہلے ہی لیا جا چکا ہے جس نے کہ اپنشدوں اور ویدانت کی بلند تعلیمات کو ان کے اونچے منبر سے گرا کر اس قدر نیچا کر دیا ہے کہ وہ عوام کی سمجھ میں آ سکیں اور انہیں جوگیوں کی پوشیدہ کٹیوں اور جنگلوں اور پہاڑوں اور آشرموں سے کھینچ کر کسانوں کی جھونپڑیوں میں پہنچا دیا ہے۔ جو خدمات کالی داس نے شمالی ہندستان میں، اور مہاپربھو چیتن نے بنگال اور بہار میں بھگتی کی تہذیب کو ہر دلعزیز بنانے میں انجام دی ہیں وہی لوگ ہندو ویدانت کی تعلیمات عام کرنے کے لئے کبیر نے شمالی ہند میں انجام دی ہیں۔

اسی طرح اردو ادب کی جو خدمت ہندوؤں نے کی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی ہندو اس جماعت کا ایک بہت بڑا حصہ نہیں ہیں جو کہ اردو زبان اور اردو ادب کی دلدادہ ہے۔ اس لئے یہ صرف گذشتہ تاریخ ہی کو جھٹلانا نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت موجودہ زمانے کی زندگی کے روزمرّہ کے مشاغل اور واقعات سے

انکار کرنا ہی کہ زبان کے مسئلے کو ہندو مسلمان کے درمیان ایک لڑائی کی ہڈی بنا دیا جائے۔

مسلمانوں کی خدمات صرف ہندی یا اردو ہی کو ترقی دینے تک محدود نہیں رہی ہیں۔ دوسری صوبہ واری زبانوں کی بھی بہت کچھ مدد کی گئی ہے اور وہ بھی اپنی ترقیات کے لئے ایک بڑی حد تک مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں۔ شمال میں ہندی، مغرب میں مرہٹی، اور پورب میں بنگالی زبانیں محض بول چال کی زبانوں سے ترقی کرکے ادبی زبانیں بن گئیں اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کافی حصّہ ہے۔ ان سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ایک بالکل نئی معجون مرکب زبان تیار ہوتی ہی اور اس کے لئے مسلمان اپنی ترکی اور فارسی زبانوں کو ترک کر دیتے ہیں اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر وہ اسے اسی طرح کہ جس طرح انھوں نے اپنا سمویا ہوا فن تعمیر اور سمویا ہوا فن نقاشی بنا لیا تھا۔ زبان میں بھی حسب ضرورت تراش خراش کرکے ایک نئی اردو زبان بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں اس زبان کو اپنی زبان سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، اور یہ معجزہ ظہور میں آتا ہی کہ ہندی بھاشا کو ایک قسم کی ادبی تحریروں کے لئے اور اردو کو دوسری قسم کی تحریرات کے لئے استعمال کیا جانے لگتا ہی، اور اسی طرح جب کسی مسلمان یا کسی ہندو کا تخلیقی تخیل ایک سمت کو پرواز کرتا تھا تو وہ ہندی میں لکھنے بیٹھ جاتا تھا اور جب دوسری طرف کو پرواز کرتا تھا تو اس کے خیالات اردو کا لباس پہن کر ظاہر ہوتے تھے، ہندی زبان پر مسلمانوں کا اثر بہت گہرا تھا اور جو اس کے لغات، اس کی صرف و نحو، اس کی تشبیہات و استعارات، اس کی نظم، اور اس کی طرز ادا سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہی اور جو خیال کہ ہندی کے بارے میں صحیح ہی، بالکل وہی مرہٹی اور بنگالی کے متعلق صحیح ہی اور پنجابی اور سندھی زبانوں کے متعلق اس سے بھی زیادہ ؂

؂ تارا چند کی کتاب انفلوانیس آف اسلام آن انڈین کلچر" (Influence of Islam on Indian Culture) صفحہ ۱۳۹ - ۱۴۰

بنگال کے حکمرانوں کی کوششیں صرف مسلمانوں کے علوم کی سرپرستی تک محدود نہ تھیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی مربیانہ نگہداشت کو ادب کی ایک ایسی ترقی پر بھی مرکوز کردیا تھا جو بنگالی زبان بولنے والے سب آدمیوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ بنگالیوں کو یہ بات کسی قدر قاعدۂ قدرت کے خلاف معلوم ہوگی کہ ان کی زبان ایک ادبی زبان کے مرتبے پر پہنچنے کے لئے ان کی بجائے مسلمان حکمرانوں کی رہینِ منت ہو۔ بنگال کے مسلمان حکمرانوں کی توجہ سب سے پہلے دو رزمیہ نظموں یعنی رامائن اور مہابھارت نے اپنی طرف منعطف کی جن کے ایماء سے وہ بنگالی میں ترجمہ کی گئیں جو کہ گھریلو زبان تھی۔ مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناظر شاہ کے حکم سے ہوا تھا جو بنگال پر حاکم تھا (۱۲۸۲ء سے ۱۳۲۵ء) اور جو بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا اور اس کی تعریف اپنے ایک گیت میں کرکے شاعر اعظم ودیاپتی نے جسے لازوال بنادیا ہے۔ یہ امر متحقق نہیں ہے کہ آیا بنگال کے کسی مسلم حکمران نے یا ہندو راجہ کنس نرائن نے کیرتی بس کو رامائن کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ اگر یوں بھی ہو کہ راجہ کنس نرائن ہی نے یہ ترجمہ کرایا تھا تب بھی اس میں شک اور شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مسلمان حکمراں کی مثال نے راجہ کو اس کام پر ابھارا۔ شہنشاہ حسین شاہ بھی بنگالی زبان کا بڑا سرپرست تھا۔ اسی نے ہلدھر باسو کو بھگوت پوران کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرنے پر مقرر کیا۔ حسین شاہ کی فوج کے ایک جرنیل پراگل خاں اور اس کے لڑکے چھتی خاں نے مہابھارت کے ایک حصہ کا ترجمہ بنگالی میں کراکے اپنے ناموں کو زندۂ جاوید بنا لیا ہے۔

---

۵ "این این لا" کی کتاب "پرموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ مہامیڈن رول"
Promotion of Learning in India during Mohamedan Rule. صفحہ ۱۰۷-۱۱۰

زبان کے مسئلے پر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک "دو قوموں والے" نظریئے کا تعلق ہے، وہ تقسیم ہند کے حامیوں کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زبان علاقے علاقے کی ہوا کرتی ہے، نہ کہ فرقے فرقے کی۔ یوں دیکھئے کہ بنگال میں ہندو مسلمان دونوں کی زبان بنگالی ہے، اسی طرح گجرات میں گجراتی، اور پنجاب میں پنجابی ہے اور ہندی یا اردو، یا ہندستانی یا اور بھی کچھ اس کا نام رکھ لیا جائے تو وہ شمالی ہندستان کی زبان ہے جس میں وہ تمام علاقہ شامل ہے جو پنجاب کی سرحد سے لے کر بنگال کی سرحد تک ایک طرف، اور ہمالیہ کے دامن سے لے کر ان صوبوں کی سرحدوں تک کہ جن میں مرہٹی اور تیلگو زبانیں وسطِ ہند اور جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں۔ دوسری طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہ زبانیں جنوبی ہندستان کی زبانوں سے جیسے تیلیگو، تامل، کناری، اور ملیالم ہیں مختلف ہیں اور ان کی اپنی بات چیت کی زبانیں اور ان زبانوں کے مقامی اختلافات ہیں کہ جن میں عوام گفتگو کرتے ہیں ہندستان بھر میں کہیں کوئی ایسی تقسیم آبادی کی موجود نہیں ہے جو پورے کا پورا علاقہ ہم مذہب بھی ہو اور ہم زبان بھی۔ زبان کی تقسیم بالکل علاقہ وار ہے اور کہیں فرقہ وارانہ یا از روئے مذہب نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی زبان — جن میں اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہے۔ شمال مشرقی ہندستان میں بنگالی ہے۔ اور اگر مشترکہ زبان ہندوؤں اور سکھوں اور مسلمانوں کی پنجاب میں اسی طرح پنجابی ہے، تو پھر کوئی بھی ایسی زبان نہیں مل سکتی جو شمال مغرب کے ان چاروں پانچوں علاقوں میں ایک ہو جنہیں شمال مشرق کے مسلم علاقے میں شامل کرنے کی تجویز کی جارہی ہے۔ پنجابی زبان پشتو اور سندھی اور بلوچی زبانوں سے کم سے کم اتنی ہی مختلف ہے کہ جتنی ہندی زبان بنگالی زبان سے ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر قومیت کا مسئلہ زبان کی یکسانیت کی بنیاد پر طے کیا جائے تو پھر خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم سب ایک قوم بن جائیں گے کیونکہ ان سب کی زبان ایک ہی ہے، اور اسی طرح یہ بھی بالکل واضح ہے کہ پنجابی، سندھی، پٹھان

اور بلوچی مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان سب کی زبانیں باہم اسی قدر مختلف ہیں کہ جتنی وہ بنگالی زبان سے مختلف ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی ادب ایک طرف سنسکرت، اور دوسری جانب عربی ہے۔ کیونکہ یہی دو زبانیں دونوں کے سرچشمے ہیں۔ ایک بنگالی بولنے والا ہندو بھی اسی طرح سنسکرت سے مذہبی ہدایات حاصل کرتا ہے کہ جس طرح ایک تامل یا سندھی بولنے والا۔ اسی طریقے پر مذہبی ہدایات کے لئے ایک پنجابی بولنے والے مسلمان کو بھی اسی عربی سرچشمے کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے کہ جس کی جانب ایک جنوبی یا مشرقی ہندستان والا رجوع کرتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جہاں مذہبی علوم کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے جدا جدا سرچشمے ہیں یعنی ایسے سرچشمے کہ جن سے ملک کے اندر کہیں بھی ہر وقت کی بول چال میں کام نہیں لیا جاتا، وہاں ان دونوں فرقوں کی ایسی زبانیں بھی موجود ہیں کہ جنہیں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور بعض مقامات کی ایسی زبانوں میں کافی بڑا ادبی ذخیرہ بھی موجود ہے۔ جو بلا لحاظ مذہب و ملت دونوں میں مشترک ہے۔ درحالیکہ یہ بنیادی تعلقات کی زبان صوبے صوبے کی بالکل مختلف ہے۔

اگر ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں، ایک ہندوؤں کی اور دوسری مسلمانوں کی؛ اور ہندستان کو ہندو اور مسلم دو علاقوں میں تقسیم کر دینے کے بعد ہر علاقے کو یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح اپنے لئے مناسب سمجھے علاقے کو ترقی دے بشرطیکہ جو اقلیت اس علاقے میں آباد ہے اس کے جملہ حقوق جن میں سے ایک زبان بھی ہے محفوظ رہیں، تو پھر اردو زبان کے مستقبل کا کیا حشر ہوگا جبکہ وہ کسی بھی ایسے علاقے کی زبان نہ ہوگی کہ جو مسلم علاقہ بنے گا۔ یا تو شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں اسے ایک غیر ملکی الدیسی زبان کی طرح نوازا اور پالا جائے گا، یا وسط ہند میں جہاں اکثریت کی زبان اردو نہیں ہے، اقلیت کی زبان سمجھ کر صرف اس کا تحفظ کیا جائے گا۔

اگر اسی بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں تو پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کو اپنے اپنے طور پر جس طرح وہ چاہیں ترقی کرنے دیا جائے، اور ایک مشترکہ چیز کو جس میں نہ تو خالص سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہو نہ خالص عربی اور فارسی لغتوں کی، باقی رکھی جائے کہ تمام ملک کی مشترکہ اور قومی زبان کی حیثیت سے ترقی کرتی رہے اور سب جگہ بولی اور سمجھی جائے۔

(۴) فنونِ لطیفہ

فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، موسیقی اور رقص کو حاصل ہے۔ ان میں سے ہر ایک فن مسلمانوں کی ہندستان میں آمد سے پہلے سنسکرت یا بعض اور صوبائی زبانوں کی طرح بہت ترقی کر چکا تھا۔ اس لئے اس کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ فنون مسلمانوں کے اسی قسم کے فنون کے اندر جذب ہو جائیں گے اور ہوا بھی یہی کہ وہ جذب نہ ہوئے۔ ان فنون نے مسلمانوں کے فنون میں انھیں جو چیز بھی قابلِ شمول اور اپنی پسند کے مطابق ملی اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا، اور شمالی ہند کی زبان کی طرح فنون لطیفہ نے بھی اپنی ایک نئی معجون مرکب بنا لی۔ اور فی الحقیقت اسلامی تہذیب پر بعض امور کے لحاظ سے بڑا اثر ڈالا۔

فنِ تعمیر

مسلمانوں کے عہد کا تعمیر کا فن ہندوؤں کے یا بدھ مذہب کے زمانے کے فن تعمیر سے بہت مختلف ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بالکل بدیشی ہے کہ جیسے غیر ملک سے لاکر اجنبی زمین پر نصب کر دیا گیا ہو۔ یہ بات سمجھ میں کسی طرح نہیں آ سکتی کہ تاج محل کی تعمیر میں ہندو معماروں اور ماہرین فن کاریگروں کا بالکل ہاتھ ہی نہ لگا ہو، یا کہ مسلم عہد میں

جو ہندوؤں کے مندر بنائے گئے ان میں مسلمان معماروں نے ایک اینٹ بھی نہ لگائی ہو۔ شمالی ہندستان میں آج کل بھی عام طور پر ہندوؤں کے نہ صرف مکانات، بلکہ ہندوؤں کے مندر بھی مسلمان کاریگر ہی بناتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی بعض بہت ہی مشہور تعمیرات میں فنِ تعمیر کے ماہرین نے ان مخصوص چیزوں کا ذکر کیا ہے جو ہندو اور مسلم فنِ تعمیر کی باہمی آمیزش کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

"مسلمانوں نے جو عمارتیں مذہبی، شہری، یا فوجی مقاصد کے لئے بنائیں وہ خاص طور پر مسلم: شامی مصری، یا ایرانی، یا وسطِ ایشیا کے طرز پر نہ تھیں، اور نہ ہندو عمارتیں، اور مندر، اور مٹھ وغیرہ خالص ہندو طرز پر بنائے گئے تھے۔ اسلامی طرزِ تعمیر کی سادہ کرختگی کو گداختگی سے آشنا کر دیا گیا تھا، اور ہندوانہ چمک کی افراط کو روک دیا گیا تھا۔ کاریگری، آرائش و زیبائش اور عام نقشہ اکثر حالات میں ہندوانہ ہوتا تھا۔ اور اس پر محرابی شکلوں، سادہ قبوں، صاف چکنی دیواروں، اور لمبے چوڑے اندرونی حصّوں کا اضافہ کر دیا جاتا تھا جو اسلامی طرزِ تعمیر سے لئے گئے تھے۔ فنِ تعمیر کی لحاظ سے ان تمام عمارتوں کی خصوصیات جو تیرہویں صدی کے بعد سے تعمیر ہوئیں خواہ بنانے والے ہندو ہوں یا مسلمان بالکل یکساں ہیں، اگرچہ جس استعمال کے لئے عمارت بنائی گئی ہے۔ اس کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ اور مقامی دستور، اور سرزمین کی خصوصیات کی بنا پر عمارتوں کے طرز میں بھی کچھ اختلاف ہے۔"

"فرگوسن کی اکاڈمی کی تقسیم اور درجہ بندی کے مطابق جس چیز کا نام اسلامی طرزِ تعمیر ہے وہ دہلی، اجمیر، آگرہ، مالوہ، گجرات، جونپور، اور بیجاپور کی تمام ہندستانی عمارتوں میں قطع نظر اس سے کہ مقامی حکمران عرب تھے یا پٹھان، یا ترک، یا ایرانی، یا مغل یا ہندستانی، مسجدوں اور مقبروں سب میں نمایاں ہے اور

محلات کے قبے نیز وہ ہندوانہ نشان جو قبوں کے اوپر ہوتا ہے (کلس) اور وہ محرابیں جو کہ ہندو خانقاہوں کے مشابہ بنی ہوئی ہیں، وہ محرابیں جو اکثر بہ لحاظ تعمیر ہندوانہ کردی گئی ہیں، وہ پوشیدہ علامات جو آرائش اور تعمیر کے نقشوں سے نمایاں ہیں غرضکہ یہ سب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہندستان کے معماروں کے خیال میں مکہ معظمہ کے پیغمبر صاحب کا فرقہ، اس معجون مرکب میں سے ایک فرقہ ہے کہ جسے ہندو مذہب کہا جاتا ہے۔ وہ نہایت اچھے مسلمان ہوں لیکن پھر بھی ہندو ہی رہے۔[۱]"

ہیوَیل (Havell) نے اس نظرئے کو اپنی کتاب میں جو ہندستان کے فنونِ لطیفہ پر لکھی ہے بہت ہی واضح کردیا ہے اور اس پر کچھ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔[۲] اس طرز تعمیر کا اثر اٹھارہویں صدی میں ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیل گیا تھا۔ حتیٰ کہ دور افتادہ نیپال بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہا۔[۳] شاہی محل مٹھ اور مندر جو انیسویں صدی میں تعمیر ہوئے تھے خواہ وہ پچھم میں جام نگر کے اندر بنے ہوں یا پورب میں، کلکتہ کے اندر، یا پنجاب میں سکھوں نے بنوائے ہوں، یا وسطِ ہندستان میں جینیوں نے وہ سب ایک طرز پر بنے ہوئے ہیں جو ہندو مسلمانوں کے مشترکہ فنون تعمیر کا طرز ہے۔[۴] اور یہ ہندو مسلمانوں کا مشترک طرزِ تعمیر صرف

---

[۱] "ہیوَیل" (Havell) کی کتاب "انڈین آرکیٹکچر" Indian Architecture، صفحہ ۱۰۱۔

[۲] ڈاکٹر تاراچند کی کتاب صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۴۔

[۳] ہیوَیل کی کتاب صفحہ ۲۵۵۔

[۴] " " " ۲۵۶

ہندستان کی یادگاروں کی تعمیر تک محدود نہ رہا، بلکہ روزمرہ کے استعمال کی عمارتوں پر بھی مثلاً گھر، سڑکیں، اور گھاٹوں پر بھی چھا گیا۔[۵] ہندوؤں کے رہنے کا مکان اپنے نقشے اور طرز تعمیر کے لحاظ سے مسلمانوں کے مکان سے بالکل مختلف نہیں ہوتا اگرچہ آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر ایک صوبے سے دوسرے صوبے کے مکانات بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

سنگ تراشی

سنگ تراشی کے فن نے اس وجہ سے کہ یہاں مورتیاں اور بت بنانے کا فن بہت عام اور بہت اہم تھا، ہندستان میں بہت ہی ترقی کی تھی۔ اسلام بتوں اور مورتیوں اور بتوں کی پوجا کو برا خیال کرتا ہے اس لئے اس فن نے اسلامی ممالک میں کوئی ترقی نہیں کی اور اسی لئے اسلامی سنگتراشی کا ہندستان کے فن پر کوئی اثر نہیں ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ ایرانی بادشاہوں کی تقلید میں ہندستان کے مسلم بادشاہوں نے اپنی عمارات اپنے محلات، اور اپنی تفریح گاہوں کو نظر فریب بنانے میں اسی حد تک سنگ تراشی سے مدد لی ہے کہ جس حد تک نقاشی سے۔[۶]

نقاشی

انسانوں کی تصویریں بنانا، موسیقی بالخصوص ساز اور باجے، اور ناچنا بھی ایسے

---

۵ ہیویل کی کتاب صفحہ ۲۵۷

۶ ایس ایم جعفر کی کتاب کلچرل ایسپکٹس آف مسلم رول ان انڈیا" (Cultural Aspects of Muslim Rule in India) صفحہ ۱۱۰

ہی فن ہیں جن کی اسلام حمایت نہیں کرتا اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بالکل حرام نہ ہوں۔ ہندو مسلمانوں میں یکسانیت سب سے زیادہ مصوری اور موسیقی ہی میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ اس کے باوجود ہے کہ اسلام نے اگر ان کی قطعی ممانعت نہ بھی کی ہو تب بھی ان کی طرف کوئی توجہ تو ہرگز نہیں کی ہے۔

"مصوری کے فن کو ابتدائی عہد کے مسلمان بادشاہوں کی وہ سرپرستی حاصل نہ ہوئی جو دوسرے فنون نے حاصل کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ابتدائی دور میں اسلام نے مصوری کی ممانعت اس لئے کر دی تھی کہ وہ بت پرستی سے بہت قریب ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ مسلمان شرفا۔ اور مسلمان بادشاہوں نے عام روایت سے الگ ہو کر اس فن میں مشق بہم پہنچائی ہو، لیکن بہ کثرت ایسے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا جن میں مصوری کو ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی پرانی عادتیں اور دلچسپی کے مشغلے نہیں چھوڑے تھے، اور اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندستان کے اس زمانے کے مسلمانوں نے اس فن کی طرف سے اس قدر غفلت نہیں برتی کہ جیسا خیال کیا جاتا ہے۔ نومسلموں کی ایک بڑی اکثریت اور ان کی اولاد نے ضرور اس فن کو ہاتھ میں لیا ہوگا۔ اور ان پرانے مسلمانوں نے بھی جو ایران سے آئے تھے اور ایرانی خیالات اور ایرانی تاثرات ان میں بھرے ہوئے تھے۔ اس فن میں مہارت پیدا ضرور کی ہوگی اگرچہ نہ اتنے جوش کے ساتھ اور نہ اس مقصد کے ساتھ کہ جو ان کے ہم عصر ہندوؤں کا تھا۔ اس طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگرچہ حکمراں اس کے مخالف نہ سہی مگر کم از کم اس کی طرف سے بے پرواہ ضرور تھے تب بھی عوام نے بڑی حد تک اس کی سرپرستی کی۔

لیکن مغلوں کی کیفیت ان سے مختلف تھی۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق ان کا

اپنا ایک مخصوص تخیل تھا جس سے انھیں محبت تھی اور جس کی سرپرستی وہ اس کی ہر صورت اور ہر دور میں کرتے رہے۔ بابر اپنے ہمراہ بہترین مصوری کے شاہکار جو اسے اپنے بزرگوں کے یعنی تیموریہ خاندان کے کتب خانے یا تصویرخانے میں ملے لے کر آیا تھا اور تیموریہ خاندان اپنی مصوری کی مہارت اور تصویروں سے دلچسپی رکھنے کے لئے مشہور تھا۔ ان نمونوں کو ہندستان کے مغل بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے کلیجے سے لگاکر رکھا اور انھیں اپنا مایۂ ناز خزانہ خیال کرتے رہے"۔[1]

مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تصاویر، ہندو، جین، اور بدھ تہذیبوں کی اپنی ایک امتیازی خصوصیت رکھتی ہیں۔ حقیقت کی جو جھلک انہیں نظر آتی ہے۔ اور ان کے دل پر نازل ہوتی ہے اور ان کی تصاویر کو ایک مخصوص رنگ بخشتی ہے۔ وہ صرف انہی کی ہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب کی علامت ہے جو حسن کی قدرشناس ہے اور جس نے ان تجربات میں جنم لیا تھا جو مختلف نسلوں کی آمیزش اور امتزاج کی بدولت ہوئے تھے، اور یہ امتزاج اس قسم کا تھا کہ جس کے معنی مخالف رجحانات کے اندر اعتدال پیدا ہو جاتا ہیں۔ خوشی اور غم، سکھ اور دکھ، کامیابی اور ناکامی، دنیاداری اور دنیا گذاری، زندگی سے محبت اور زندگی سے نفرت، مغلوب الحواسی اور عقل کی مدد سے خواہشات، عمل اور جذبات پر حکمرانی اور اطمینان اور جمود و سکون اور خاموشی........ غالباً اجنتا کی دیواروں کی تصویریں ہی ہندستانی مصوری کا جیسی کہ وہ زمانۂ قدیم میں تھی تقریباً تنہا بچا ہوا نمونہ ہیں۔ محققین نے حضرت عیسیٰ سے پیشتر کے ادب میں مثلاً "دنایا پٹیک" اور پھر بعد کی ہندو منظومات مثلاً مہابھارت رامائن شکنتلا وغیرہ میں اس مصوری کے حوالے دریافت کئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کی عظمت سے تعلق رکھنے والی تصاویر کے ٹکڑے مختلف غاروں میں ملتے ہیں۔ لیکن وہ ایک پوری

---

[1] جعفر صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶ -

باقی ماندہ تصویر کہ جو سچے طور پر اس مصوری کو ظاہر کرتی ہے جو ایک زمانے میں پورے ہندستان پر چھائی ہوئی تھی صرف اجنتا ہی میں ملتی ہیں۔ یہ تصاویر ان مندروں کی چھتوں اور دیواروں پر بنی ہیں جو کہ ثابت چٹانوں کو کھود کر اور کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ انہیں سنہ عیسوی کی ابتدائی چھ صدیوں میں زمین سے کھود کر نکالا گیا تھا۔ بادشاہوں کے خزانے اور تجارت کے شہریاروں کی تمام دولت ان تصویروں کے بنوانے پر صرف ہوگئی ہوگی جن سے خواہشات اور پرہیزگاری دونوں کی تسکین ہوتی ہے۔[1]

بابر نے جس زمانے میں ہندستان فتح کیا تو بہزاد (مشہور مصور) کا ستارۂ اوج پر تھا۔ اس کا انداز مصوری کمال کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ مصوری کے قدردان، بابر اور اس کے ہمراہی، اور بعد میں ہمایوں کے ایران سے اخراج کے بعد ہندستان آنے پر چغتائی امرا نے بہزاد کو ہندستانی مصوروں کے سامنے امام فن بنا کر کھڑا کر دیا کہ جس کی ان سب کو تقلید کرنی چاہیئے اور جس کی تصاویر کی وہ نقل اتارا کریں اس طرح بہزاد اور اس کا مخصوص طرز ہندستانی مصور کے لئے نمونہ بن گئے اور تیموری طرز نقاشی کی مبادیات اجنتا کی روایات کے ساتھ پیوست کر دی گئیں۔ تیموری طرزِ نقاشی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انفرادیت بہت زیادہ ہے۔ اس طرز کو مجمع اور بھیڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے تصویر کے اندر مختلف اشیاء کی جگہ متعین کرنے سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ تمام چیزوں کو صاف اور عمدہ روشنی میں دیکھتا ہے اور ہر چیز کی نوک پلک الگ الگ اور واضح طور پر نمایاں کر دیتا ہے، وہ بس ایک صورت کو لے کر اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات تصویر میں واضح کرتا ہے اور اس کے لئے انتہائی محنت اور تکلیف برداشت کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تقاضوں کو بہت زبردست قوت کے

---

[1] تاراچند صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹ -

ساتھ محسوس کرتا ہے، اور جو تصویر بھی بناتا ہے اس میں اس پرجوش قوت عمل کا اظہار کر دیتا ہے۔[1] ا
کی طرح اس طرز نقاشی میں بھی اظہارِ کمال کا ذریعہ خطوط ہی ہیں، لیکن دونوں خطوط کے
درمیان کس قدر عظیم الشان فرق ہے .... جن عناصر سے یہ تصویریں بنتی ہیں وہ
ان سے بہت ہی مختلف ہیں جو اجنٹا میں پائے جاتے ہیں[2] مغلوں کی مربیانہ نگہداشت
کے زیر اثر ان دونوں طرزوں کے شعوروں کے ملاپ سے ایک بالکل نیا انداز پیدا ہو گیا
اجنٹا کی لچک کے ساتھ موزونیت تناسب اور فاصلہ کی صحت کے نئے قوانین سمرقند
اور ہرات سے آگر مل گئے۔ قدیمی آن بان کے ساتھ نئی شان شامل ہو گئی اور پرانی سادہ
اور سلیس زندگی کی عریانی نے اب درباری صحت اور کرخت آداب کا لباس پہن لیا۔ اس
میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو مسلم دونوں طرزوں کی پرجوشی اور گرماگرمی کسی حد تک
اس ملاپ کے سر صدقے ہو گئی اور ایک بے لچک شان پیدا ہو گئی لیکن اس کے ساتھ
ساتھ رنگوں کی عجیب وغریب شوخی اور خطوط کی بے انتہا باریکی حاصل ہو گئی۔ اس طرز
خاص کا ارتقا بہت تیزی کے ساتھ عمل میں آیا۔ غالباً بابر نے آگرے میں ہندو اور مسلمان
مصوروں سے تیموریہ فن نقاشی کا تعارف کرایا تھا .... کلارک
(Clarke) نے اس نئی طرز کا نام طرز ہمایونی رکھا ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا
ہے کہ اس میں بھی ہندستانی رنگ صاف جھلکیاں مار رہا ہے۔ بعد میں اکبری دور کے
مصوروں نے ضرور اسی طرز نقاشی کی تعلیم پائی ہوگی اور غالباً انہیں یہ تعلیم ان چار ماہرین
فن سے ملی ہوگی جن کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے یعنی فرخ قلماق عبدالصمد شیرازی
میر سید علی تبریزی، اور مسکین۔ شاگرد جو ہندو تھے وہ غالباً ایسے مصور ہوں گے جن
کو پرانے طرز میں پوری مہارت حاصل ہوگی اور اپنی طرز کی مصوری میں کافی شہرت بھی رکھتے ہوں
گے کہ شاہی دربار میں بلائے جانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ اپنی قابلیت

---

[1] تاراچند صفحہ ۲۶۵ - ۲۶۶
[2] تاراچند صفحہ ۲۶۸

کو اپنے نئے آقاؤں کی خوشنودی مزاج کے مطابق صرف کریں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں اس قدر ابتدائی زمانے ہی میں جیسا کہ اکبر کا زمانہ تھا یہ نئی ہندو مسلم طرز اس قدر ترقی یافتہ صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ آئین اکبری میں مندرجۂ ذیل مصوروں کا ذکر آیا ہے:۔ دسونت بساون، کیشولال، مکند، مادھو، جگن ناتھ۔ مہیش۔ کھیم کرن۔ تارا۔ سنوالا، ہری بنس، اور رام۔ اس زمانے کی تصاویر پر بہت سے اور ہندو مصوروں کے نام بھی ملتے ہیں۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ان قلمی تصاویر کے عکسوں میں جو کہ اب خدا بخش کتب خانے میں بانکی پور میں محفوظ ہیں تلسی۔ سرجن۔ سورداس، الیسر۔ شنکر۔ رام اسر۔ بنوالی۔ نند، ننھا۔ جگ جیون۔ دھرم داس۔ نارائن۔ چترمان۔ سورج۔ دیوجی۔ سرن۔ گنگا سنگھ۔ پارس۔ دھنا۔ کھیم۔ وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ بعض تصویروں میں مصور کے نام کے ساتھ اس کا وطن بھی دیا ہوا ہے، اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ صرف کشمیر، گجرات اور گوالیار ہی کے نام ملتے ہیں۔ اس زمانے میں ہندو تہذیب کے یہی مشہور و معروف گہوارے تھے، اور یہ حقیقت دریافت ہونے سے کہ اکبری دربار کے مصوران مقامات سے آئے تھے اس روایت کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہندو مصوری اجنٹا کے بعد ترقی کرتی رہی ہے، یہ بات بھی اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ مغل طرز نقاشی محض وسط ایشیا اور ایرانی طرز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قدیم طرز کو نئے جوش نے ترقی دی ہے[1]۔

متحدہ ہندو مسلم طرز کی کہ جس کا ایک طرف تو اجنٹا کی دیواری تصویروں سے رشتۂ یگانگت تھا اور دوسری طرف سمرقند و ہرات کی سچی نقل مطابق اصل تصاویر کے ساتھ اپنائیت تھی۔ بہت سی شاخیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اور یہ شاخیں باہم صرف اسی

---

[1] تاراچند صفحہ ۲۶۸ - ۲۷۱

بات میں مختلف تھیں کہ کوئی ہندوانہ طرز سے زیادہ قریب تھی اور کوئی اسلامی طرز سے زیادہ مشابہ تھی۔ جے پور اور کانگڑے کے راجپوت اور پہاڑی طرز اور ہمالیہ کی ہندو ریاستوں کے طرز قدیمی ہندو طرز کی جانب میلان رکھتے تھے، اور دکن، لکھنؤ، کشمیر اور پٹنے کی قلموں کا رجحان مسلم طرز کی طرف تھا، اور سکھ قلم نے ان دونوں کے بین بین اپنے لئے جگہ نکالی تھی۔ لیکن یہ سب درحقیقت دہلی اور آگرے کے درباری طرز کی شاخیں تھیں[1]

پٹنے کے مسٹر پی۔ سی، مانک جن کے پاس ہندستانی تصاویر کا ایک بہت ہی نادر اور مایۂ ناز مجموعہ ہے اور جو خود بھی اس فن کے ایک بڑے نقاد ہیں ہندستان کی مصوری پر ایک مضمون میں مغلوں کے عہد میں مصوری کی ترقیات کا ذکر لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ کٹر مسلمانوں پر انسانی تصویریں یا دوسرے جانداروں کی تصویریں بنانا حرام اور مذہبی احکام کے مطابق ان کے لئے گناہ تھا۔ قدیم موسوی شریعت کا حکم کہ "تو اپنے لئے کوئی تراشیدہ یا کندہ تصویر نہ بنائے گا" مسلمانوں کو بھی ملا تھا۔ اور انھوں نے اس کی لفظی پابندی کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایران کے شاہ عباس کے زمانے میں اور ابتدائی عہد کے لطیف المذاق مغل بادشاہوں کے دور میں مسلمانوں نے اپنے اوپر سے یہ پابندی اٹھا دی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اگرچہ آنکھوں کو عجیب قسم کا انتہائی سرور بخشتی ہیں لیکن ان میں سے بہت ہی کم ایسی ہیں جو روح کو گدگدائیں لیکن ان کے ہندو شاگردوں کی اور رفقائے کار کی راہ میں ایسی کوئی رکاوٹ نہ تھی جن کی نظروں میں کہ ان کے دیوتا اور دیویاں بالکل اصلی ہستیاں تھیں کہ جنھوں نے روایتی شکلیں اور جسم اختیار کر لئے تھے، اور شاید یہی وجہ ہوگی کہ ایک ہندو مصور کی تصاویر انسان کی روح پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور فن کی معراج کمال بھی غالباً یہی ہے۔

---

[1] تاراچند صفحہ ۲۷۲

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذہب اور مصوری کے درمیان صدیوں تک قریبی تعلق رہا ہے اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بہت سے شاہ کاروں میں بھی یونانی اور اطالوی مذہبیات سے چن چن کر مذہبی یا نیم مذہبی مضامین کے متعلق تصویریں تیار کی گئی ہیں [1]

موسیقی

زمانۂ موجودہ کی ہندستانی موسیقی مسلمانوں کے اثر اور تعلیم سے کچھ کم فیض یاب نہیں ہوئی ہے، اگرچہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی وہ ہندستان میں بہت کافی ترقی پا چکی تھی اور مسلمانوں کے یہاں گانا بجانا ناجائز خیال کیا جاتا تھا پھر بھی موجودہ موسیقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی کوششیں شامل ہیں، اور اس طریقے پر امتزاج ہوا ہے کہ بنیاد تو ہندوانہ ہے اور آرائشیں اور جھالریں ہندو مسلم مرکب کی بنائی ہوئی ہیں اگر ان کثیر التعداد اور مختلف باجوں کی تواریخ لکھی جائے تو مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان میں سے اکثر کے موجودہ شکل اختیار کرنے اور تکمیل کو پہنچنے کا سہرا ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوشش کے سر رہے گا اور ان کوششوں میں بھی حصۂ غالب مسلمانوں کا ہوگا بلکہ بعض حالات میں تو تنہا مسلمانوں کا۔ اسی طرح سے موجودہ راگ اور راگنیوں کی ترقی اور ترتیب میں بھی مسلمان راگیوں کے کارنامے بہ کثرت ملیں گے۔

"اسلام کے ابتدائی زمانے میں موسیقی پر بھی وہی افتاد پڑی تھی جو مصوری پر لیکن غالباً اس کا سبب وہی نہ تھا بلکہ یہ کہ راگ انسان کے دل پر اس قدر زبردست

---

[1] اخبار "سرچ لائٹ" (Search Light) سالانہ نمبر سنہ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۵۔

قبضہ کر لیتا ہے کہ اس میں محو ہو کر پھر وہ کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کر سکتا .... شاید موسیقی کی زبردست دل آویزیاں ہی اس کا باعث ہوئیں کہ شروع شروع میں مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بے التفاتی کے باوجود انسانی جبلت رنگ لائے بغیر نہ رہی اور موسیقی کی تہذیب و ترتیب سی طرح سے اور اگر زیادہ سرگرمی سے نہیں تو اسی سرگرمی کے ساتھ شروع ہوگئی کہ جیسے مصوری کی ہوئی تھی۔ اسلام نے ایران میں پہنچنے سے کہ جہاں موسیقی کو کافی ہر دل عزیزی حاصل تھی، اور صوفیا کے اثر کی بدولت جو موسیقی کو روح کی بلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، اور اسے روحانی ترقی میں مددگار سمجھتے تھے اس فن کے متعلق مسلمانوں کے برتاؤ میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوگئی۔ اور وہ کلنک کا ٹیکا جو موسیقی کے ماتھے پر لگا ہوا تھا بڑی حد تک دھل گیا حالات اور بھی سازگار ہوگئے جب مسلمان یہیں ہندستان میں رہ پڑے اور انھوں نے دیکھا کہ ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گو خدا کی عبادت تو مسجدوں میں گانے اور باجے کے بغیر ہی پکے اسلامی طریقے پر ہوتی رہی لیکن دعوتوں وغیرہ کے موقعوں پر بہ کثرت گانے بجانے والے نظر آنے لگے۔ صوفیوں کی موسیقی سے دلچسپی نے یہ طریقہ رائج کر دیا کہ نیم مذہبی قسم کے جلسے کئے جانے لگے جن میں خدا کی محبت کے راگ جنھیں قوالی کہا جاتا ہے گائے جانے لگے اور گانے والے پیشہ ور گویئے ہوتے تھے جنھیں قوال کہا جاتا تھا۔[۵] مختصر یہ کہ ہندستان کے مسلمانوں کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، اس سے کہیں زیادہ کہ جتنا ہمیں باور

---

[۵] جعفر صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۶۔

کرایا جاتا ہے۔ موسیقی کے مسلمانوں میں عام ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی کہ جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے یا ہندوؤں کی اولاد تھے اور گانے بجانے کا شوق اس قدر ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود بھی اسے چھوڑ نہ سکے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بالکل غیر محسوس طریقے پر یہ فن مسلمانوں کے گھروں میں پہنچ گیا، اور بہت ہی ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس جگہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح موسیقی بھی ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا ذریعہ بن گئی۔ باہمی اشتراک عمل اور میل جول کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے فوراً شروع ہو گیا تھا اور بالکل بین طور پر یہ بات نظر آتی تھی کہ دونوں فرقوں نے کس طرح ایک دوسرے سے وہ تمام خوبیاں اور کمالات حاصل کر لئے جو دونوں کے پاس تھے اور اس طرح ایک دوسرے کو باکمال بنا دیا[۱]۔"

"مصوری کے ساتھ کا دوسرا فن لطیف موسیقی بھی شاہی نوازشوں سے محروم نہ رہا اور اس کے عہد حکومت میں اوج کمال پر پہنچ گیا۔ اس کے دربار میں بے تعداد ماہرینِ موسیقی تھے جن میں ہندو، ایرانی تورانی کشمیری، مرد اور عورتیں سب شامل تھے۔ دنیا کا مشہور گویا میاں تانسین جو کہ ایک نو مسلم تھا اور جس کی قبر گوالیار میں گویوں کے لئے زیارت گاہ بن گئی ہے اکبر کے دربار کا ایک گویا تھا۔ اسی زمانے میں بڑا ماہر فن ہری داس گویا بھی تھا جس نے تان سین ثانی اور رام داس جیسے گویوں کو تعلیم دی تھی۔ تان سین ثانی لکھنؤ سے آیا تھا اور مشہور ہے کہ ایک مرتبہ خانخانان سے ایک لاکھ روپئے انعام میں حاصل کئے

---

[۱] جعفر صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵ -

تھے......... موسیقی کے فن کا آفتاب اکبر کے عہد میں نصف النہار پر پہنچ
چکا تھا۔ گانے کے فن پر کہ جس میں مختلف راگ اور راگنیاں شامل تھیں کہ جن میں
سے بعض اب محض عدم مشق کی وجہ سے بھلائی بھی جا چکی ہیں، شاہی توجہ کا مرکز تھا
اور اسی کے ساتھ ساتھ بجانے کے فن کو بھی مع اس کے آلات اور سازوں کے
بہت کچھ ترقی دی گئی تھی۔ موسیقی کی قلمرو میں یہ بات بہت ہی نمایاں تھی کہ ہندوؤں
اور مسلمانوں نے کس طرح اپنے اپنے کمالات ایک دوسرے کو دے کر باکمال بنا
دیا۔ یہ باہمی میل جول کا سلسلہ اکبر کے زمانے کی پیداوار نہ تھا بلکہ بہت مدت پہلے
سے جاری تھا۔ علم موسیقی کی تواریخ مسلمانوں کی ہندستان میں آمد کے بعد سے باہمی
اشتراکِ عمل اور ایک دوسرے کے ساتھ میل جول کا ایک ایسا باب شروع
کرتی ہے کہ جس میں یہ دونوں فرقے سیاسی اور سماجی طور پر بالکل متحد ہو گئے
تھے۔ مثال کے طور پر خیال کے گانے کو لے لیجئے جس کے متعلق یہ مشہور ہے
کہ جونپور کے سلطان حسین شرقی کی ایجاد ہے۔ یہ گانا اب ہندوؤں کی موسیقی
کا ایک جزو اعظم ہے۔ اسی طرح دُھرپد کا گانا مسلمانوں کی موسیقی میں داخل
ہو چکا ہے۔ زمانۂ قدیم کی ہندستانی موسیقی کی حالت اور زمانہ موجودہ کی اس کی
کیفیت اچھی طرح اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اس میدان میں ہندو مسلم میل
جول صدہا برس سے چلا آرہا ہے...... صرف بادشاہ اور اس کے امراہی
اس فن لطیف کے دلدادہ نہ تھے بلکہ تمام شرفا بھی اپنا اور اپنے خاندانوں کا دل
اسی مشغلے سے بہلایا کرتے تھے[۵] شاہ جہاں بادشاہ اس فن کا بہت بڑا مربی

---

[۵] این. این. لا (N. N. Law) کی کتاب پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن لا
Promotion of Learning in India
During Mohamedan Law
صفحہ ۱۵۵-۱۵۸

تھا اور غالباً خود بھی اچھا گاتا تھا۔ اس کے دربار کے دو بڑے مغنّی رام داس اور مہا پتر تھے۔[۵]"

اگر موسیقی کے ماہرین کی ایک مکمل فہرست بنائی جائے تو یہ بالکل یقینی ہے کہ اس میں مسلمان استادانِ فن کی تعداد اس سے زیادہ ہوگی کہ جتنی اس ملک میں ان کی آبادی کا تناسب ہے اور شاید اس تعداد سے بھی بڑھ جائے کہ مجلس قانون ساز میں جتنی نشستیں انہیں ملی ہیں اگر کسی ایک ایسی موسیقی کی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملے کہ جو اس فن کے شائقین نے کسی جگہ منعقد کی ہو، اور اس میں ہندوستان کے موجودہ اور زندہ گویّوں سے تعارف ہو تو اس حقیقت سے انکار کرنے والوں کو اس بات کا پورا ثبوت مل جائے کہ ایک ایسا باہمی خلط ملط موجود ہے جسے ایک لفظ "ہندوستانی تہذیب" ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو ہندوستان کی موسیقی سے آشکارا ہوتا ہے۔ اس موسیقی میں کہیں فرقہ وارانہ لگاؤ نہیں ہے۔

مسٹر ایس، ایم جعفر اپنی کتاب "سم کلچرل ایسپکٹس آف مسلم رول ان انڈیا" (Some Cultural Aspects of Muslim Rule in India) میں ہندو اور مسلمانوں کی باہمی آمیزش کی کوششوں کے ذکر میں لکھتے ہیں

"مسلمان جو ہندوستان میں آئے انہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا اور یہیں رہنے بسنے لگے۔ ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ ہندوؤں کے ملک میں رہ کر ان سے دائمی طور پر دشمنی کے تعلقات رکھیں۔ ساتھ ساتھ باہمی میل ملاقات اور ایک دوسرے کو پرکھنے اور سمجھنے کے موقعے نکل آئے۔ جتنا جتنا زمانہ زیادہ گذرتا گیا انہیں مجبوراً ایک بیچ کا راستہ ایسا نکالنا پڑا کہ دونوں خوش دلی اور صلح

---

[۵] کتاب مذکورۃ الصدر صفحہ ۱۸۳

داشتی کے ساتھ مل کر پڑوسیوں کی طرح رہیں۔ انھوں نے سنسکرت اور فارسی زبانوں سے تانا بانا لیکر ایک نئی زبان پیدا کرلی، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کے جداگانہ چشموں نے اپنا اپنا راستہ چھوڑ کر اس نئے راستے پر بہنا اختیار کرلیا جس کا نام اردو ہے۔ اس طرح جو تہذیب بنی وہ نہ خالصتہً اسلامی تھی اور نہ ہندوانہ بلکہ ان دونوں تہذیبوں کا مبارک مجموعہ تھی مسلمان بادشاہوں اور مسلمان سرداروں نے ہندوؤں کے فنون لطیفہ، ادب، علم، اور فلسفہ کی سرپرستی کی اور اپنے مدرسوں اور مکتبوں کے دروازے سب پر بلا لحاظ مرتبہ اور نسل اور مذہب کے کھول دئے۔ ولیوں اور داناؤں کی طرح انھوں نے بھی اپنے حلقۂ اثر میں ہندو مسلمانوں کو باہم ملا دینے کی پوری کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں فرقوں میں کامل طور پر مصالحت ہوگئی۔ اس لئے ہمیں ان باتوں پر تعجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کی خانقاہوں پر جا جا کر مٹھائیاں چڑھاتے تھے، قرآن سے فالیں نکالتے تھے، برے اثرات کو دور رکھنے کے لئے گھروں میں قرآن کی جلدیں رکھتے تھے اور مسلمانوں کے تہوار منایا کرتے تھے، اور اسی طرح مسلمان بھی جواب میں اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ...... چونکہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی کہ جو ہندو سے مسلمان ہوئی تھی اس لئے ان کی سماجی حالت اور تہذیب میں ایک دم سے انقلاب برپا نہیں ہوا اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ ان چیزوں میں بہت کچھ ترقی اور اصلاح ہوگئی۔ انھوں نے اپنا مذہب تو ضرور تبدیل کردیا تھا لیکن اپنی رسمیں، اپنی عادتیں، اور اپنے شوق کی چیزوں کو ترک نہ کیا تھا۔ مذہب کی تبدیلی سے ان کا ماحول اور ان کے گرداگرد کی فضا نہ بدلی جو کہ جا بجا توہم پرستی اور ذات پات کے جھگڑوں سے آلودہ تھی۔ نتیجے کے طور پر ایک متحدہ ہندو مسلم سماج بن گئی جس میں بہت سی ہندوؤں کی سماجی خصوصیات موجود تھیں[۵]۔"

۵؎ جعفر صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۷ -

تہذیب ایک بہت ہی مرکب معجون ہوتی ہے اور اس کے اجزا کی تعریف کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا قوم کی تعریف کرنا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ جو شخص کسی ایک تہذیب کے اندر پیدا ہوا ہو وہ ناممکن ہے کہ اپنی تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے امتیاز نہ کر سکے۔ اور یہ بھی ہے کہ اسی ایک تہذیب کے دائرے کے اندر ضمنی تہذیبیں اور ضمنی جماعتیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ جو الگ الگ ہونے کے باوجود اسی ایک مادری تہذیب کا جزو ہوں۔

ایک ایسی تہذیب کہ جو مختلف بلکہ باہم متخاصم سماجی، مذہبی، اور بعض دوسری قوتوں کے باہم مل جانے سے پیدا ہوئی ہو اس کے اندر اس قسم کی ضمنی جماعتوں اور ضمنی حلقوں کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ان ضمنی جماعتوں کی موجودگی ایک مادری تہذیب کے وجود کی منافی نہیں ہوا کرتی کہ جو ان سب ضمنی چیزوں پر چھائی ہوئی ہو۔ اور یہ مادری تہذیب بالکل اسی طرح باقی موجود رہتی ہے کہ جس طرح خود وہ ضمنی جماعتیں۔ جب کبھی ہم دو تہذیبوں کا مقابلہ کرنے بیٹھیں تو ہمارے لئے صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ ہم ان دونوں جماعتوں کی مادری تہذیبوں کا باہم مقابلہ کریں۔ یہ درست نہ ہوگا کہ ہم ایک ضمنی حلقۂ تہذیب کا دوسرے ایسے ہی ضمنی حلقے سے مقابلہ کرکے نتیجہ نکال لیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ یہ ضمنی حلقے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ لیکن پھر بھی اپنے اندر کچھ خصوصیات ایسی رکھتے ہوں جو ان میں تو مشترک ہوں لیکن اور تمام تہذیبوں سے بالکل الگ اور مختار ہوں۔ ہندستان کے ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، سکھ سب آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود ان سب میں کچھ باتیں ایسی مشترک ہیں کہ جو کسی غیر ملکی تہذیب میں مثلاً یورپ کی تہذیب میں نہیں ملتیں۔ اس دعوے میں جسے شک کی گنجائش معلوم ہو وہ ذرا برطانوی نوآبادیات اور دیگر مقبوضات میں جاکر ہندستانیوں کی حالت اور حیثیت دیکھے تو اسے اپنے اس خیال کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی کہ ہندستان میں ہندو اور مسلم دو جدا جدا تہذیبیں ہیں۔ جنوبی

افریقہ، یا آسٹریلیا، یا کینیڈا کے یورپین کی یا کینیا کے یورپین کی نظر میں ہر ہندستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا سکھ یا پارسی یا عیسائی بالکل ایک، اور ایسی شخصیت ہے کہ جسے اپنے درجے سے آگے بڑھ کر یورپین تہذیب کو گندہ کرنے کی اجازت نہ ملنی چاہیئے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہندستانیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ اس لئے ہے کہ وہ محکوم ہیں اور ان کے ساتھ یہ ذلت کا برتاؤ جائز ہے۔ چینی تو خود مختار قوم ہیں، اور جاپانیوں کو تو اس جنگ عظیم سے پہلے اگر عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا تب بھی ان کا لحاظ اور پاس تو ضرور حد سے زیادہ کیا جاتا تھا۔ لیکن ان دونوں قوموں کے لوگوں کے ساتھ بھی یورپین تہذیب کے یہ محافظ نئی اور پرانی دونوں دنیاؤں میں بالکل اسی طرح کا برتاؤ کرتے تھے یہ امتیاز یورپ اور ایشیا کی تہذیبوں کے فرق کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خواہ کتنے بھی اختلافات موجود ہوں اس سے انکار کرنا نادانی ہوگی کہ دونوں نے ساتھ ساتھ رہ کر ایک مشترکہ تہذیب بنائی ہے کہ جو ہندستانی تہذیب ہے، اور جو ہر ہندستانی کو ہر غیر ملکی سے خواہ وہ مشرق سے آیا ہو یا مغرب سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے۔ اتنی مدت دراز کا ساتھ اور باہمی میل جول، اور جنگ اور صلح کے زمانے کی مشترکہ کارگذاریاں قدرتی طور پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں کہ دونوں کو ایک بنا دیں۔ آم کے دو مختلف درختوں کی ٹہنیاں اگر جوڑ دی جائیں یا ایک درخت کا قلم دوسرے درخت میں لگا دیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قلمی درخت میں زیادہ لذیذ پھل لگتے ہیں۔ ان دونوں شاخوں کو پھاڑ کر الگ الگ کر دینا سخت غلطی اور بے رحمی ہے۔ جو بات کہ بہت ہی اہم اور ہر وقت یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اتنی مدت دراز گذر جانے کے بعد کہ جس مدت میں درخت نے بہت سے طوفانوں کو سر سے ٹال کر قوت حاصل کر لی ہے، اب اسے چیر کر الگ الگ دو کر دینا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر آپ

کوشش میں کامیابی بھی ہو جائے تو وہ دونوں حصوں کے لئے مضرت رساں ہو گی، اور دونوں کو کمزور اور بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں ہر سمت سے غیر محفوظ بنا دے گی۔

(۵) ایک مُلک

ہندستان کے اندر آب و ہوا اور زمین کی شکل و صورت کا اختلاف بدرجۂ غایت ہے اور یہ اختلاف شمال میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے لے کر جنوب میں ایسے نقطہ تک پھیلا ہوا ہے کہ جو قریب قریب خط استوا پر واقع ہے۔ یہاں اندرونِ ملک میں ایسے وسیع خطّے بھی ہیں کہ جو سمندر سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور یہاں ساحل سمندر کا علاقہ بھی ہے جو چار ہزار میل کے قریب لمبا ہے۔ ہمارے ملک میں راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستان بھی ہیں اور آسام اور بنگال کے شاداب اور سرسبز میدان بھی۔ ہمارے ملک میں شمال مشرق کی طرف سے آسام میں اور جنوب مغرب کی جانب مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں بے اندازہ بارش بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ راجپوتانہ، سندھ اور آندھرا کے بعض حصّوں میں بارش کا کہیں نام بھی نہیں یا بس برائے نام بارش ہوتی ہے۔ اندرونِ ملک کے بعض مقامات پر گرمی اور سردی بھی اپنا انتہائی زور دکھاتی ہے بالخصوص صوبۂ پنجاب و سرحد میں اور ادھر جنوبی ہندستان کے ان علاقوں میں جو ساحل سمندر پر واقع ہیں۔ دوسری اور بہت سی باتوں کی طرح یہ آب و ہوا کا اختلاف، اور جغرافیائی صورت و شکل کا اختلاف آبادی کی ایسی تقسیم سے میل نہیں کھاتا جو مذہبی یا فرقہ وارانہ بنیاد پر کی جائے۔ سرد اور خشک شمال مغربی علاقہ، اور نم آلود، طوفانی، اور سیلاب بہار مشرقی اور شمال مشرقی علاقہ ایک دوسرے سے بہ لحاظ آب و ہوا اور بہ لحاظ شکل و صورت بالکل مختلف ہیں، لیکن ان دونو

علاقوں میں مسلمان بڑی کثرت سے آباد ہیں اور یہ کثرت ہی اس مطالبے کی بنیاد ہے کہ ہندستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔

آب و ہوا اور زمین کی شکل کے اختلاف کا اثر ان لوگوں کی ترقی پر پڑا ہے جو اس میں رہتے ہیں، اور اسی طرح ان کی پوشاک پر اور رہنے کے مکانوں کی نوعیت پر، بہت سی ان کی سماجی رسموں پر، اور مختصر یہ کہ عام طور پر ان کی زندگیوں کے خاص شعبوں پر پڑا ہی۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہندستان ایک بجائے خود مکمل ملک ہے جو آس پاس کے ملکوں سے پہاڑوں اور سمندروں کی قدرتی اور تقریباً ناقابل عبور دیواروں کے ذریعے الگ کر دیا گیا ہے۔ ہندستان پر حملہ آوروں، ہندستان کے فاتحوں، اور ہندستان کے بادشاہوں کو بھی خواہ وہ ہندوؤں کے زمانے کے ہوں یا مسلمانوں کے زمانے کے اپنی سلطنت پورے ملک میں پھیلا دینے میں کچھ یونہی سی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ہر حکمراں کی دلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح پورے ہندستان پر قبضہ نہ سہی۔ بالادستی ہی میسر آجائے۔ شمال مغرب کے گوشے میں ہمیشہ تھوڑا سا حصہ ملک ایسا رہتا چلا آیا ہی کہ جس پر کسی کا کبھی قبضہ نہ ہوا، اور ہمیشہ اس کے حکمراں بدلتے رہے، کبھی ہندستانی اور کبھی بدیشی، یا غیر ہندی۔ حکومت برطانیہ نے بھی تمام ملک پر بالادستی حاصل کرنے میں اسی ہزار سال کی پرانی روایت کا اتباع کیا ہی جو ہندوؤں کے چکرورتی بادشاہوں اور مسلمان حکمرانوں کے وقت سے چلی آتی ہے۔ آج کل جس طرح صوبے ہیں اسی طرح اگلے زمانے میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو کبھی کبھی آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ لیکن ہمیں اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کسی فرد واحد نے بھی جو ان صوبوں میں رہتا ہو، یا ان پر حکمرانی کرتا ہو کبھی یہ خیال بھی کیا ہو کہ وہ ہندستانی کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، یا اس کے زیر نگیں جو حصۂ ملک ہی وہ ہندستان کے ایک حصہ کے سوا اور کچھ ہے اور یہ حصۂ ملک چین، ایران، ترکستان،

اور عرب سے بلکہ شاید برہما سے بھی بالکل الگ اور ممتاز نہیں ہے دوسری طرف ہر ہندو جو اپنی سندھیا کرتا ہے اس کو ایک اشلوک سنسکرت میں سے پڑھنا پڑتا ہے جس میں وہ تمام ملک کا تصور اس طرح باندھتا ہے کہ وہ سب ایک ہے، اور خیال کرتا ہے کہ سندھو، گنگا، اور کاویری دریا اس کی چھوٹی سی پانی کی لٹیا میں مل جاتے ہیں۔ اور یہ طریقہ صرف اس زمانے ہی تک جاری نہ تھا کہ جب کبھی کبھی کوئی چکرورتی تمام ملک پر اپنی بالادستی کا دعویٰ کرتا تھا، بلکہ اس زمانے میں بھی سندھیا اسی طرز پر ہوا کرتی تھی کہ جب ملک کے مختلف حصوں پر مختلف حکمراں تھے، اور اس زمانے میں بھی کہ جب مسلمان بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھتے تھے، اور اس زمانے میں بھی کہ جب مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں مختلف حصہ ہائے ملک میں قائم ہو گئی تھیں۔ اور آج بھی جبکہ ہندوستان کے پورے جزیرہ نما پر برطانوی بالادستی قائم ہے وہی پرانا اشلوک دہرایا جاتا ہے۔ تیرتھ کے چار مقامات ہندوؤں کے لیے ہیں جنہیں چار دھام کہا جاتا ہے، اور ان کی زیارت کے متعلق ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ اس سے سب سے بڑا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ ان مقامات کے نام یہ ہیں۔

رامیشورم، جو جنوب میں جزیرہ نما کی بالکل نوک پر واقع ہے
بدری کا شرم، ہمالیہ پہاڑ کے اندر تقریباً پندرہ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے
جگن ناتھ پوری، مشرقی ساحل پر اڑیسہ میں ہے، اور دوارکا، کاٹھیاواڑ میں مغربی ساحل سمندر پر ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بات سے قطع نظر کہ حکومت کون کرتا تھا، اور ملک کی انتظامی یا سیاسی تقسیم کیا تھی، ہندوؤں نے کبھی کسی زمانے میں بھی کسی ایسی چیز کو ہندوستان نہ تصور کیا تھا جو اس ہندوستان سے کم ہو جیسا کہ وہ آج ہمارے زمانے میں ہے۔ مسلمانوں اور انگریزوں نے بھی صرف انہی سرحدوں کو قبول کر لیا جو ہندوؤں کی مقرر کردہ روایتی سرحدیں تھیں۔

اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ ابھی کل پرسوں تک جب تک کہ دو قوموں والے نظریہ کا اعلان نہیں ہوا تھا، خود مسلمانوں نے بھی کبھی موجودہ ہندستان کے کسی حصہ کو اس کے سوا کچھ اور نہ سمجھا کہ وہ ہندستان کا ایک حصہ اور اس کا ایک جزو ہے۔ ہندستان کے کسی فاتح مسلمان کے دل میں کبھی اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا کہ ہندستان کے کسی حصے کو اس بدیشی ملک میں شامل کردے کہ جہاں سے وہ آیا تھا۔ حملہ آوروں میں سے جو بھی رہ سکتا تھا یہیں رہ پڑا اور اسی بات کی کوشش کرتا رہا کہ جو حصہ ہائے ملک اس کی قلمرو سے باہر تھے انہیں اپنا تابع فرمان بنالے۔ یہ بات کہ سرحد پر زمین کی ایک جھالر تھی کہ کبھی اس طرف کو گرائی جاتی تھی اور کبھی اس طرف کو مندرجۂ بالا بیان کی صحت و صداقت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔

اپنی حکمرانی کی حیثیت ہی میں نہیں، بلکہ برطانیہ کی محکومی کے زمانے میں بھی برطانوی ہندکے، بلکہ دیسی ریاستوں کے باشندہ مسلمانوں نے بھی کل پرسوں سے پہلے تک ہندستان کے کسی بھی حصے کے متعلق یہ خیال نہ کیا تھا کہ وہ ہندستان کے حصے کے علاوہ اور کچھ ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے اگر خود مسلم لیگ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہو کہ شمال مغربی اور مشرقی علاقے جن میں کہ اس کی خواہش ہے کہ خود مختار ریاستیں بن جائیں، ہندستان کے حصے نہیں ہیں، یا یہ کہ وہ ہندستان کی حدود سے باہر ہیں۔ جہاں تک کہ مجھے معلوم ہے مسٹر سی رحمت علی جو کہ پاکستان کی قومی تحریک کے بانی اور صدر ہیں وہ اکیلے شخص ہیں کہ جنہوں نے بالاعلان یہ کہا ہے کہ

"ہندستان کے صوبوں کے ہندستان کے ساتھ اتحاد کو قبول کرلینا ملت کی گردن پر ہندستانیت کا ظالمانہ جوا رکھنا ہے"۔

انھوں نے اپنے ہم مذہبوں سے درخواست کی ہے کہ

"ہندستان سے تمام تعلق قطع کرکے رہیں اور ملت کو ہندستانی

ہوجانے سے بچائیں اور اسلامستان کی خدمت کریں۔[۵]"

وہ مسلم لیگ سے اس بات پر بگڑتے ہیں کہ اس نے اپنا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" کیوں رکھا ہے۔ کیونکہ اس کے تو نام ہی پر ہندستانیت کا ٹھپا لگا ہوا ہے اور اس طرح اس سے ہمارے جھگڑے کی تکذیب ہوتی ہے جو ہم نے ہندستانیت کے خلاف اٹھایا ہے۔ اس سے ہندستانیت کی روح ہم میں پیدا ہوتی ہے، اور اس طرح یہ نام غداری سے ہمیں ہندستانیت کے پھندے میں پھنساتا ہے۔ ہمیں ناموں کی اہمیت کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ نام شناخت کی علامات ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے وہ ان کی شناخت کا باعث ہوتے ہیں کہ جن کے نام وہ نام ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اخلاقی نشانیاں ہوتے ہیں اور نشانیوں کی حیثیت سے خیالات میں تحریک پیدا کرتے ہیں .... اس غلطی نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے ہماری قومیت کو گھٹا کر ہمیں ہندستانی کردیا ہے۔ میں اس لئے ایسا نہیں کہتا ہوں کہ اس لفظ ہندستانی میں کوئی عیب یا برائی ہے۔ وہ بجائے خود اسی قدر قابل عزت نام ہے کہ جیسے کوئی دوسرا نام۔ میں تو اس لئے ایسا کہتا ہوں کہ ہم سرے سے ہندستانی ہیں ہی نہیں، اور اس لئے ہمارے لئے اپنا نام یا اپنے ادارے کا نام ہندستانی رکھنا بالکل مرتد ہوجانے کے ہم معنی ہے۔[۲]"

---

۵ "دی ملت آف اسلام اینڈ دی مینیس آف انڈینزم" (*The Millat of Islam and the Menace of Indianism.*)

یہ ایک خط ہے جو چودھری رحمت علی صاحب نے پاکستانی قومی تحریک کی جماعت اعلیٰ کو بھیجا تھا۔ صفحہ ۱۵

۲ اسی خط کا صفحہ ۱۵

مسٹر رحمت علی نے اس حقیقت کے ان پر منکشف ہونے کے بعد اسلام کے شمال مغربی پانچ قلعوں" کا نام پاکستان ۱۹۳۲ء میں رکھا، اور ۱۹۳۷ء میں بنگال کو بنگستان کا اور حیدرآباد دکن کو عثمانستان کا نام دیا۔ ان تینوں علاقوں کو وہ ملت کے تین قلعے تبلاتے ہیں جو کہ خود مختارانہ اختیارات کے ساتھ ہندستان کے دو قوموں والے براعظم میں شامل ہیں[۵]"

اس طرح ہمیں معلوم ہو گیا کہ ۱۹۳۳ء کے بعد ہی سے ایسا وقوع میں آیا ہے کہ مسٹر رحمت علی نے اور "پاکستان نیشنل موومنٹ" (Pakistan National Movement) نے ہندستان کو ایک چھوٹا براعظم قرار دیا ہے کہ جس میں مختلف ممالک موجود ہیں۔ اگر کسی دوسرے شخص یا دوسری جماعت نے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی اس وقت تک کوشش کی ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ انتظامات کی غرض سے ملک کی تقسیمیں کی جا سکتی ہیں، لیکن مجھے تو معلوم نہیں کہ انسان اس طریقے پر ملک بھی بنا سکتے ہیں۔ یورپ میں جب کبھی کسی ملک کے ٹکڑے کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس کا نتیجہ نفرت اور عداوت کی صورت میں نکلا ہے جو خوں ریز جنگوں میں تبدیل ہوتی رہی ہیں اور یہ جنگ جو پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھی اور حال ہی میں ختم ہوئی ہے انھی جنگوں میں شامل ہے۔ ہمیں ان واقعات سے سبق حاصل کرنا اور متنبہ ہونا چاہیئے۔

---

[۵] خط چودھری رحمت علی صفحہ ۱-۱۶-

(۶) ایک تاریخ

ہندستان پر مسلمانوں کے حملے اس وقت سے شروع ہوتے ہیں کہ جب محمد بن قاسم سندھ کے ساحل پر نویں عیسوی صدی میں اترا تھا اور اس وقت تک جاری رہے جب کہ آخری مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے اٹھارہویں صدی میں حملہ کیا۔ یہ امر بہت ہی مشتبہ ہے کہ ان حملوں میں سے جو کہ آٹھ یا نو سو سال تک متواتر ہوتے رہے کوئی سا ایک بھی ایسا مذہبی حملہ تھا کہ جو اسلام کو پھیلانے کی غرض سے مذہبی دیوانوں نے کیا ہو۔ دوسری تمام فتوحات کی طرح سے ان حملوں کی بنا بھی دنیاوی اور مادّی اغراض تھیں نہ کہ مذہبی تحریک اور سرگرمی۔ سب سے پہلے جو حملے کئے گئے ان میں تو قدرتی طور پر مقابلہ ہندوؤں سے ہوتا ہی تھا کیونکہ اس وقت تنہا ہندو ہی ملک میں رہتے تھے اور اس لئے ہندو مسلمانوں کی لڑائی ہو گئی۔ لیکن ابتدا ہی سے ان حملہ آوروں کی خواہش یہ تھی کہ ہندستان میں آباد ہو جائیں، اور گیارہویں صدی میں شہاب الدین غوری کے عہد کے بعد مسلمان حملہ آور جو بھی آئے خواہ وہ پٹھان تھے یا تاتاری، یا ترک یا مغل یا افغان انہوں نے ہندستان کے حصّوں پر حکومت قائم کرلی اور برابر اپنی حکومت کی حدود بڑھاتے رہے۔ جس قدر کہ سلطنت وسیع ہوتی گئی اسی قدر دہلی میں بیٹھ کر کہ جو ان کا پایۂ تخت تھا سب کا انتظام کرنا دشوار ہوتا گیا اور انہیں دور و دراز کے علاقوں میں اپنے نائبوں کو حاکم بنا کر بھیجنا پڑا۔ یہ گورنر جو بھیجے گئے تھے کافی موقع شناس ہوتے تھے، اور مرکزی حکومت کی ادنیٰ سی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے صوبوں میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھتے تھے۔ اس طرح ہمیں مسلمان بادشاہوں کی طویل تاریخ میں دو قسم کی لڑائیاں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ لڑائیاں ہوتی تھیں جو سلطنت کی توسیع کے لئے کی جاتی تھیں اور ابتدائی زمانے میں یہ لڑائیاں قدرتی طور پر

ہندوؤں ہی سے ہوتی تھیں جواب تک ان علاقوں پر حکمراں تھے کہ جن علاقوں کو فتح کرکے دہلی کی سلطنت میں شامل کر لینے کی خواہش تھی۔ لیکن بہت زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ خود مختار اسلامی ریاستیں بہت سی بن گئیں اور اب ان لڑائیوں میں سے اکثر و بیشتر لڑائیاں جو مسلمان بادشاہانِ دہلی کو لڑنی پڑیں ہندوؤں کے خلاف نہ تھیں بلکہ ان مسلمان بادشاہوں کے خلاف تھیں جنہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی یا پھر اپنے ہی اُن گورنروں کی خلاف تھیں جو بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ ایسی لڑائیوں میں ہندو دونوں طرف سے لڑا کرتے تھے۔ وہ تمام مسلمان حملہ آور جو شمال مغرب سے غوری بادشاہوں کے بعد آئے انہیں ہندستان کی مسلم حکومتوں پر حملہ کرنا پڑا۔ اور انہوں نے کیا، اور مسلمان بادشاہوں سے لڑنا پڑا اور وہ لڑے۔ تیمور اور نادر شاہ کے حملے ہندو بادشاہوں پر نہیں ہوئے تھے بلکہ دہلی کے مسلمان بادشاہوں پر کئے گئے تھے اور انہی نے ان کا مقابلہ کیا۔ بابر کو کسی ہندو راجا سے نہیں، بلکہ ابراہیم لودھی سے جو کہ ایک مسلمان بادشاہ تھا پانی پت کے میدان میں لڑنا پڑا تھا قبل اس کے کہ وہ مغل سلطنت کی بنیاد ڈالے۔ جب بابر نے میواڑ کے رانا سانگا سے جنگ کی ہے تو رانا کے مددگاروں میں راجپوتوں کے علاوہ میوات کے علاقے کا حسن خاں، اور سکندر لودھی کا بیٹا سلطان محمود لودھی بھی تھا جسے رانا سانگا نے دہلی کے بادشاہ کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ ۱۵۲۷ء میں جب بابر نے راجپوتوں اور مسلمانوں کی اس ملی جلی فوج کو کانوہ کے مقام پر شکست دی ہے تب کہیں جا کر اس کی بادشاہی قائم ہوئی تھی۔ بابر کے بیٹے ہمایوں نے شیر شاہ کے ہاتھ سے شکست کھا کر جو کہ ایک مسلمان پٹھان تھا دہلی کا تخت ہاتھ سے کھو دیا تھا۔ اور جب شیر شاہ کے مرنے کے بعد تخت پھر ہاتھ آیا تو ہمایوں کے بعد اس کے بیٹے اکبر کو مسلمان بادشاہوں سے اس لئے لڑنا پڑا تھا کہ سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر سکے۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک مغل بادشاہوں کی قوت اور ان کا وقت زیادہ تر صوبوں کے مسلمان گورنروں کی

بغاوتیں فرو کرنے میں صرف ہوا ہی، یا پھر ایسے خود مختار بادشاہوں پر فتح حاصل کرنے میں جو مسلمان تھے۔ یہ ایک مشہور بات ہی کہ اورنگ زیب نے دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی مسلمان سلطنتوں کے فتح کرنے میں کئی سال صرف کئے اور اس نے وہیں وفات پائی۔ دہلی کے بادشاہوں کی طرف سے ان میں سے اکثر مہموں اور جنگوں کی سپہ سالاری ہندو کیا کرتے تھے جیسے کہ اکبر کے زمانے میں مان سنگھ اور بھگوان داس اور اورنگ زیب کے عہد میں جسونت سنگھ۔ ان ہندو سرداروں نے صرف مسلمانوں ہی کو فتح نہیں کیا اور نہیں دبایا ہی بلکہ ان ہندوؤں سے بھی لڑ کر ان پر فتح حاصل کی ہے جو ملک میں کہیں کہیں اس وقت تک حکمراں تھے۔ ان حالات کو پڑھنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ہندستان پر اور ہندستان کے اندر مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت میں جو حملے ہوئے اور لڑائیاں لڑی گئیں وہ انہی مادّی اور دنیاوی جذبات کی بنا پر لڑی گئیں تھیں کہ جن کی بنا پر دنیا بھر کی تمام اور لڑائیاں لڑی گئی ہیں یا لڑی جاتی ہیں یعنی ذاتی خواہشات، خاندانی عداوتیں اور سلطنت کی توسیع اور استحکام، اور اس عزت اور شان کا حاصل کرنا جو فتح اور سلطنت کی بدولت میسّر آتی ہی۔

ہندستان کی چھ سو سال کی تاریخ جو کہ تیرہویں صدی میں اس وقت سے شروع ہوتی ہے کہ جب قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ء میں سلطنت قائم کی تھی۔ اٹھارویں صدی کے ختم تک جبکہ انگریزوں کا تسلّط ملک میں جم گیا ایک ایسی تاریخ نہیں ہے کہ جس میں مسلسل طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائیاں ہوتی رہی ہوں یہاں گنجائش بھی نہیں ہے اور اس کا موقع بھی نہیں ہی کہ یہ دکھایا جائے کہ اس طویل عہد میں ہندستان کے اندر مسلمانوں کی لڑائیاں مسلمانوں سے ہندوؤں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوئی ہیں۔ صرف ایک طائرانہ سی سرسری نظر ڈالی جاسکتی ہے۔

اس تمام دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا وہ زمانہ کہ جس میں سلاطین دہلی کے تخت پر متمکن تھے اور دوسرا وہ کہ جب مغلوں نے حکمرانی کی۔ پہلے دور میں جو واقعات رونما ہوئے وہ یہ تھے کہ مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کر لی اور اسے پورے ہندستان کے طول و عرض میں ایک طرف ہمالیہ سے لے کر رامیشرم تک اور دوسری جانب مغربی سرحد سے لے کر اڑیسہ اور بنگال کے مشرقی ساحلوں تک پھیلا دیا، اور اسی دور میں ساتھ ساتھ بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں جن میں سے بعض خود مختار تھیں اور بعض مسلمانوں کے زیر حکم تھیں، قائم ہوگئیں۔ اسی دور میں دہلی کے تخت حکومت پر شاہی خاندان بھی بدلتے رہے۔ دہلی کے سلاطین اس تمام زمانے میں یا تو ہندوؤں پر فتح حاصل کر کے ہندستان کے حصوں پر قبضہ کرتے رہے یا پھر اپنے ہی گورنروں کی بغاوتوں کو فرو کرنے میں اور اپنی قلمرو دوبارہ فتح کرنے میں، یا اپنے تخت اور دارالسلطنت کی حفاظت میں مصروف رہے۔ ۱۱۹۲ء اور ۱۵۲۶ء کے درمیانی زمانے میں دہلی کے تخت پر کم سے کم پینتیس سلاطین متمکن ہوئے ہیں اور وہ پانچ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر خاندان کا مذہب اسلام تھا۔ اور ہر خاندان جب اس کے زوال کا وقت آیا تو اس کی جانشینی دوسرے مسلمان ہی خاندان نے کی۔ ان پینتیس سلطانوں میں سے انیس یعنی ان میں سے اکثریت ایسی تھی کہ جو ہندوؤں کے ہاتھ سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

ان خود مختار اور نیم مختار حکومتوں میں جو ملک میں قائم ہوگئی تھیں بنگال جونپور، گجرات، مالوہ، خاندیش اور بہمنی سلطنتیں شامل تھیں۔ بہمنی سلطنت بعد کو برار، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈا اور بیدر کی پانچ حکومتوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ان سلطنتوں میں سے ہر ایک کی اپنی جداگانہ تاریخ تھی یعنی یہ تاریخ کہ اس نے اپنی پڑوسی مسلم حکومتوں سے بھی جنگ کی اور دہلی کی مرکزی سلطنت سے بھی برسرِ پیکار

رہی، اور کبھی کبھی ان ہندو راجاؤں سے بھی لڑتی رہی جو ملک کے مختلف گوشوں میں اب تک بھی حکمراں تھے۔

ہندستان کے مسلمان بادشاہوں کو بھی ان حملوں کی مدافعت کرنی پڑتی تھی جو شمال مغرب سے آنے والے مسلمان حملہ آور وقتاً فوقتاً ان پر کیا کرتے تھے، اور ان کی اتنی کثرت تھی کہ سلطان علاؤالدین کے زمانے سے برابر بعد تک سرحد پر ایک قسم کا قلعہ ان حملوں کو روکنے کے لئے ضروری سازوسامان کے ساتھ بنا کر رکھنا پڑا۔

۱۵۲۶ء میں جب بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے مقام پر شکست دی اور مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی تب بھی دہلی کا تخت اس کے جانشینوں کے لئے کانٹوں کا تاج بن گیا۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو اپنے بھائی کامران سے جس نے کابل اور قندہار پر قناعت نہ کرکے لاہور کو بھی فتح کر لیا تھا اور سارے پنجاب پر قابض ہوگیا تھا، لڑنا پڑا۔ ہمایوں کو اپنے دو اور بھائیوں یعنی ہندل اور مرزا عسکری سے بھی لڑنا پڑا تھا ہندل لڑائی میں مارا گیا اور کامران کو قید کرکے اس کی آنکھوں سے محروم کر دیا گیا عسکری کو بھی پکڑ لیا گیا لیکن اسے کامرآن کی طرح مکہ معظمہ کو ہجرت کر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

ہمآیوں کو اپنے تخت کی حفاظت کے لئے برابر لڑائیوں ہی میں مصروف رہنا پڑا۔ ایک مہم اس کو گجرات کے حاکم بہادر شاہ کے خلاف لے جانی پڑی لیکن وہ شیر خاں کی بغاوت کی وجہ سے گجرات پر قبضہ نہ رکھ سکا۔ شیر خاں بہار کا افغانی سردار تھا اس سے شکست کھا کر ہمایوں کو دہلی کے تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور اس نے ہندستان سے جلاوطن ہوکر ایران کے بادشاہ کی پناہ لی۔

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا جو افغان سرداروں کو قابو میں نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس بات پر مجبور ہوا کہ ان میں سے بعض کو یا تو قید

کردے یا قتل کرا دے۔ پنجاب کے گورنر نے بھی بغاوت کی تھی لیکن وہ شکست کھا کر کشمیر کو بھاگا اور وہاں قتل کر دیا گیا۔

سلیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز خاں تخت پر بیٹھا جسے چند ہی روز بعد اس کے ماموں مبارز خاں نے قتل کر دیا اور خود محمد شاہ کا نام اختیار کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کی سلطنت کا انتظام ایک ہندو کے سپرد تھا جس کا نام ہیمو تھا۔ اب امراء دربار نے بغاوت کر دی اور دہلی اور آگرہ پر ابراہیم سور کا قبضہ ہو گیا جسے بعد میں سکندر سور نے شکست دی۔ ہمایوں اب تک موقع کا منتظر تھا اور اب ہندوستان کی ابتری کی حالت کی خبر پا کر ایک دم سے فوج لے کر چڑھ دوڑا اور سکندر سور کو سرہند کے مقام پر شکست دے کر پھر اپنا تخت و تاج ۱۵۵۵ء میں واپس لیا۔ اور اس کے چند ہی روز بعد انتقال کر گیا۔

ہمایوں کے بعد اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کا چھوٹا بھائی محمد حاکم کابل پر قابض تھا اور برائے نام کابل ہندوستان کے ماتحت خیال کیا جاتا تھا۔ اکبر ابھی بچہ ہی سا تھا اور اس کی اتالیقی بیرم خاں کے سپرد تھی۔ اس پر سب سے پہلی مصیبت یہ آئی کہ سوری خاندان کے ہندو وزیر ہیمو نے دہلی پر چڑھائی کر کے مغل سپہ سالار فرید بیگ کو شکست دے دی۔ فرید بیگ کو بعد میں بیرم خاں نے اس جرم میں کہ وہ ہیمو کے حملے کی مدافعت نہ کر سکا تھا۔ قتل کی سزا دی۔ ہیمو نے اس فتح کے بعد وکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا اور سلطنت پر حملہ کر دیا لیکن پانی پت کی لڑائی میں اسے شکست ہوئی اور بیرم خاں کے ہاتھوں قید ہو کر قتل ہوا۔ اس کے بعد سکندر سور نے بھی ہتھیار ڈال دئے اور اس طرح ۱۵۲۶ء میں سوری خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اکبر بیرم خاں کی اتالیقی سے تنگ آ چکا تھا، اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبوں میں اس کی والدہ حمیدہ بیگم اور دایہ ماہم انکہ اور دایہ کے لڑکے ادہم خاں سے مدد ملی۔ اس نے ۱۵۰۶ء میں بیرم خاں کو علیحدہ کر دیا جو اس فیصلے کے آگے

سر جھکا کر مکہ کو ہجرت کر گیا۔ اس اندیشے سے کہ مبادا وہ بغاوت کرے اکبر نے اس کے پیچھے پیچھے پیر محمد کی سرکردگی میں ایک فوج بھی روانہ کر دی تاکہ اسے جلدی سے ہندستان سے رخصت کر دے۔ اس بات سے چڑ کر بیرم خاں باغی ہو گیا۔ اور پنجاب کی طرف چل پڑا اور اکبر بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچا۔ بیرم خاں نے آخر کار ہار مان لی۔ اور اس کی گذشتہ خدمات کے صلے میں اکبر نے اسے کوئی سزا نہ دی اور دوبارہ مکہ جانے کی اجازت دیدی۔ راستے میں بیرم خاں کے ایک دشمن کا قابو چل گیا اور اس نے اسے گجرات کے شہر پٹن میں قتل کر دیا۔

اکبر کے فوجی سردار پیر محمد اور ادھم خاں مالوے کی مہم پر بھیجے گئے اور انہوں نے بہت بے رحمی کے ساتھ اس مقام کے مسلمان بادشاہ پر فتح حاصل کی۔

اکبر کو مندرجہ ذیل بغاوتیں فرد کرنی پڑیں۔

(۱) عبداللہ خاں ازبک کی بغاوت جس نے مالوے میں پیر محمد کی جگہ حاصل کرلی تھی۔

(۲) خانِ زماں کی جس نے کہ جونپور میں بغاوت کی تھی، اور

(۳) خود اپنے بھائی مرزا حاکم کی جس نے ازبکوں کے بھڑکانے پر تخت کا دعویٰ کیا تھا۔ اکبر نے پنجاب پر دھاوا کیا تو حاکم تیزی کے ساتھ پسپا ہو گیا۔ خان زماں کو جنگ میں شکست ہوئی اور مارا گیا، اور اس کا بھائی جو پکڑا گیا تھا قتل کر دیا گیا۔ دوسرے باغیوں کو بھی سخت سزائیں ملیں۔

اکبر نے گجرات کا صوبہ مظفر شاہ کو شکست دے کر پورے طور پر ۱۵۷۳ء میں فتح کیا اور اسے براہِ راست اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ اکبر کی تاریخ میں یہ ایک اہم کارنامہ تھا۔

بنگالے پر شیر شاہ کے زمانے میں افغان سردار حکمراں تھے لیکن ۱۵۶۴ء میں

بہار کے سلیمان خاں نے غور پر قبضہ کر لیا اور دونوں صوبوں کا حاکم بن بیٹھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بایزید تخت پر بیٹھا لیکن اسے قتل کر کے اس کے وزیروں نے اس کے چھوٹے بھائی داؤد کو تخت پر بٹھا دیا۔ داؤد نے زمانیہ کے قلعے پر قبضہ کر کے بادشاہ کو ناراض کر دیا۔ اکبر نے اپنے سپہ سالار منعم خاں کو اس کے خلاف بھیجا، اور پھر خود بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ داؤد نے لڑائی میں ۱۵۷۶ئہ میں شکست کھائی اور میدان جنگ ہی میں مارا گیا۔ بنگالہ اور بہار کے صوبے سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔ اڑیسہ چند سال بعد ۱۵۹۲ء میں شامل کیا گیا۔

بنگالے میں مظفر خاں تربتی کا تقرر گورنری کے عہدے پر ہوا۔ اس کے سخت برتاؤ، اور مال گزاری کے تعین میں ناانصافی کی وجہ سے مقامی امرا اس سے ناراض ہو گئے۔ اکبر کی صلح کل مذہبی حکمت عملی نے جس کا منشا عام رواداری تھا اسے مذہبی حلقے میں غیر ہردل عزیز بنا دیا تھا، اور علما کی ایک جماعت نے جونپور کے قاضی کی سرکردگی میں ایک فتویٰ شائع کر دیا تھا کہ شہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز ہے۔ اس بات سے فائدہ اٹھا کر قاقشالوں نے جو کہ چغتائی مغلوں میں ایک نام آور قبیلہ ہے بابا خان کی ماتحتی میں غور پر چڑھائی کر دی۔ اکبر نے امن قائم کرنے کے لئے ٹوڈرمل کو روانہ کیا جو کہ ایک ہندو تھا۔ مظفر خاں لڑائی میں مارا گیا۔ پورا صوبۂ بنگال اور تمام بہار باغی قاقشالوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ آخری نتیجہ یہ نکلا کہ بغاوت فرو کر دی گئی۔

حاکم نے پھر دوبارہ پنجاب پر حملہ کیا لیکن اکبر نے اسے شکست دے دی۔ ۱۵۸۵ء میں اس کی وفات کے بعد کابل کا صوبہ بھی دہلی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ اور اس صوبے پر حکمراں بنا کر جسے بھیجا گیا وہ ایک ہندو راجہ مان سنگھ تھا سرحدی قبائل بھی دبا لئے گئے تھے۔ کشمیر کے مسلمان بادشاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ کشمیر حوالے کر دے اور یہ صوبہ بھی دہلی کی حکومت میں ملا لیا گیا۔ اسی طرح مرزا جانی حاکم سندھ سے

سندھ کا صوبہ بھی لے لیا گیا۔ قندھار کا الحاق دہلی کی سلطنت میں ۱۵۹۵ء میں عمل میں آیا تھا۔

اس طریقے پر پورے ہندستان، اور ہندوکش کے پار کے افغانی علاقوں کو سلطنت میں داخل کر لینے کے بعد اکبر نے دکن کی طرف توجہ کی۔ ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کی سلطنت چاند بی بی کے بہادرانہ مقابلے اور مدافعت پر غلبہ پانے کے بعد دہلی میں ملحق کر لی گئی۔ چاند بی بی برہان نظام کی بہن تھی۔ اس کے بعد اس نے برہان پور پر حملہ کیا اور خاندیش کے حاکم میراں بہادر سے اسیر گڈھ ۱۶۰۱ء میں چھین لیا۔

جب اکبر دکن کی مہم پر روانہ ہوا تھا تو دار السلطنت کا انتظام اپنے بیٹے سلیم کے سپرد کر آیا تھا اور یہ ہدایت کر دی تھی کہ مان سنگھ اور شاہ قلی خاں کی معیت میں میواڑ کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کر دے۔ سلیم نے بغاوت اختیار کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی لیکن بالآخر اکبر سے اپنے قصور کی معافی مانگ لی اور باہم صفائی ہو گئی۔ سلطنت کے امرا نے ایک خفیہ سازش شروع کی تھی کہ سلیم کو تخت سے محروم کر کے اس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو کو تخت پر بٹھایا جائے لیکن یہ سازش ناکام رہی اور ۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات کے بعد ہی سلیم جہانگیر کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

جہانگیر کو سب سے پہلے تو اس سازش کو دبانا پڑا جو خود اسی کے بیٹے کی غرض سے کی گئی تھی۔ خسرو آگرے کو بھاگ گیا اور وہاں پہنچ کر بغاوت کر دی۔ لڑائی میں خسرو نے شکست کھائی، پکڑا گیا اور پابہ زنجیر بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دیں۔ خسرو کے اعلیٰ اخلاق نے پھر اس کے گرد سازش کرنے والے لوگوں کا ہجوم کر دیا اور ایک سازش تیار ہوئی جس کا منصوبہ یہ تھا کہ بادشاہ جہانگیر کو قتل کر کے خسرو کی

بادشاہی کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ سازش بھی پکڑ لی گئی اور خسرو کو اندھا کر کے قید تنہائی میں برسوں کے لئے ڈال دیا گیا۔ ۱۶۱۶ء میں اسے اس کے جانی دشمن آصف خاں کے حوالے کر دیا گیا جس نے اسے اسی کے بھائی شاہ جہاں کے سپرد کر دیا، اور شاہ جہاں نے اسے ۱۶۲۲ء میں قتل کرا دیا۔ اس کی موت کے بعد باپ کو پچھتاوا آیا، اور اس کی لاش الہ آباد لے جا کر دوبارہ دفنائی گئی۔ خسرو باغ اسی جگہ ہے جہاں خسرو کی قبر ہے۔ شاہ جہاں کا سلطنت کے دعوے میں مدِ مقابل اور رقیب ایک اور بھی تھا۔ یہ شہزادہ شہریار تھا جو کہ ملکہ نور جہاں کا داماد تھا۔ شاہ جہاں نے بھی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی اور ۱۶۲۳ء سے اپنے باپ کے انتقال سے کچھ دن پہلے تک باغی ہی رہا۔ چند سال تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد جس میں کبھی قسمت ساتھ دیتی رہی اور کبھی ناکامیوں سے واسطہ رہا بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دئے اور اپنے دو بیٹوں دارا اور اورنگ زیب کو ضمانت کے طور پر دربار میں بھیج دیا۔ جہانگیر کو بنگالے میں افغانوں کی بغاوت بھی فرو کرنی پڑی اور اپنے خاص امرائے سلطنت کی بھی۔ مہابت خاں نے تو ایک مرتبہ اسے اور نور جہاں کو قید ہی کر لیا تھا۔ ہندوؤں کے خلاف جہانگیر نے دو قابل ذکر لڑائیاں کیں۔ ایک تو اس نے ۱۶۲۰ء میں کانگڑہ فتح کیا، اور میواڑ سے اطاعت قبول کرائی جو اکبر کے زمانے سے برابر مغل بادشاہ سے مقابلہ کرتا رہا تھا۔ سلطنت کے ہاتھوں سے قندھار کا صوبہ اس کے زمانے میں نکل گیا جس کو کہ ایرانیوں نے محاصرہ ڈال کر فتح کر لیا تھا۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد شہریار نے تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔ وہ قید کر لیا گیا اور اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں، اور شاہ جہاں سلطنت کے معاملے میں اپنے سب رقیبوں کو اپنے خسر آصف خاں کی مدد سے

ٹھکانے لگا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ آصف خاں نے شاہی خاندان کے سب شہزادوں کو چن چن کر بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ شاہ جہاں کا اصلی نام شہزادہ خرم تھا شاہ کا لقب اسے باپ نے اس وقت دیا تھا جب وہ دکن کے مسلمان بادشاہوں سے لڑا تھا۔ ۱۶۲۸ء میں تخت پر بیٹھتے ہی شاہ جہاں کو بندیلہ سردار کی بغاوت کا مقابلہ کرنا پڑا جسے کہ دبا دیا گیا۔ ۱۶۲۹ء میں دکن کے گورنر خان جہاں لودھی نے بغاوت کی اور اس سے لڑ کر شاہ جہاں نے اسے شکست دی۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا سر کاٹ لیا گیا۔

اکبر نے خاندیش (۱۵۹۹ء) اور احمد نگر (۱۶۰۰ء) کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملایا تھا۔ لیکن احمد نگر پورے طور پر اس کے تسلط میں کسی وقت میں بھی نہ آیا۔ جہانگیر کے عہد میں بھی حالات میں کوئی ترقی ملک عنبر کی مدافعت کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ شاہ جہاں کو جو فتح حاصل ہوئی تھی اس کی عمر چند روزہ ہی تھی کیوں کہ دکن کے سلطان پورے طور پر مغلوب نہ ہوئے تھے۔ احمد نگر کی سلطنت قطعی طور پر ۱۶۳۳ء میں ختم ہوئی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ غیر مفتوح رہے۔ بیجاپور نے احمد نگر کی سلطنت کو جو مدد دی تھی اس وجہ سے، اور اس وجہ سے بھی کہ شاہ جی نے ایک نظام شاہی لڑکے کو احمد نگر کا بادشاہ بنا کر کھڑا کر دیا تھا، شاہ جہاں کا غصہ بہت بھڑک گیا۔ اس نے اپنے فوجی سردار انہیں سزا دینے کے لئے بھیجے، اور گولکنڈہ کے بادشاہ کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ بیجاپور نے بھی شہنشاہ کی بالادستی تسلیم کر لی۔ اس کے بعد اورنگ زیب کو دکن میں نائب السلطنت مقرر کر دیا گیا۔ یہ امن دیر تک قائم نہ رہ سکا اور چند ہی سال کے بعد پھر جنگی کارروائیوں کی ضرورت پڑ گئی۔ بیدر کو فتح کر لیا گیا۔ بیجاپوریوں کو گلبرگہ کے مقام پر شکست ہوئی اور ۱۶۵۸ء میں کلیانی کا قلعہ محاصرہ ڈالنے

سے کے بعد فتح کر لیا گیا۔ سیاسی اسباب کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ جنوب کے دونوں بادشاہ شیعہ تھے اور سنی بادشاہ کے لئے ان کے مغلوب کرنے کا یہ بھی ایک سبب بن گئی۔

قندہار کو ایرانی جہانگیر کے زمانے ہی میں فتح کر چکے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں اسے واپس لینے کی بار بار کوشش کی گئی۔ ایک مرتبہ ۱۶۳۹ء میں ایسا ہوا بھی کہ وہ واپس مل گیا کیونکہ علی مردان پر شاہ ایران کو کچھ شک ہو گیا تھا۔ اس لئے علی مردان نے اس خوف سے کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہ کیا جائے۔ دہلی کے بادشاہ کو اطلاع کر دی اور اس کی فوجیں گئیں اور قندہار پر بہ آسانی قبضہ کر لیا ایرانیوں نے اسے گوارا نہ کیا اور ۱۶۴۸ء میں پھر اسے فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ شہنشاہ دہلی کی طرف سے کئی مرتبہ مہم بھیجی گئی اور قندہار کا محاصرہ بھی کر لیا گیا۔ لیکن بالآخر بارہ کروڑ روپئے اس مہم پر برباد کر کے دہلی کی فوجیں ناکام واپس آئیں۔

شاہ جہاں نے بلخ اور بدخشاں فتح کرنے کی بھی کوشش کی۔ شہزادہ مراد کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیجی گئی اور مراد کو یہ موقع بھی مل گیا کہ وہاں بخارا کے بادشاہ نذر محمد خاں اور اس کے باغی بیٹے میں جنگ ہو رہی تھی اس لئے مراد کی بالکل مدافعت نہ ہوئی اور وہ بلا تکلف ۱۶۴۶ء میں بلخ میں داخل ہو گیا، کیونکہ نذر محمد پہلے ہی وہاں سے بھاگ چکا تھا مگر مراد اسے چھوڑ کر ہندستان واپس آ گیا۔ اور پھر ایک دوسری فوج اورنگ زیب کی سرکردگی میں بھیجی گئی۔ شروع میں توجہ کر کوئی لڑائی ہوئی نہیں لیکن آخر میں مغلوں اور راجپوتوں کے سخت حملے کی تاب نہ لا کر ایرانی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اورنگ زیب فاتحانہ بلخ میں داخل ہوا اور راجپوت سردار مادھو سنگھ ہڈا کو بلخ کا حکمراں بنا دیا گیا

اورنگ زیب بلخ سے اور آگے بڑھ گیا لیکن بہت سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ اور اسے مجبوراً لوٹنا پڑا۔ واپسی کے سفر میں اس کی فوج بڑی مصیبت میں پھنس گئی اور جن راجپوتوں کو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ کھانا اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے سب مر گئے۔ اس مہم کا انجام بھی خراب ہی ہوا۔ اور اس پر تقریباً چار کروڑ روپے ضائع ہوئے۔

ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہاں بیمار پڑا اور اس کے مرجانے کی افواہ اڑ گئی۔ اس کی وجہ سے عوام میں بے چینی اور بدامنی پھیل گئی اور جانشینی کے لئے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ کس طرح اورنگ زیب نے اپنے حقیقی بھائیوں دارا، شجاع، اور مراد کے خون میں پیر کر تختِ سلطنت تک اپنا راستہ نکالا تھا۔ یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ کس طرح اورنگ زیب کو بیجاپور اور گولکنڈہ میں مدتوں تک لڑائی جاری رکھنی پڑی تھی جو بالآخر فتح ہو گئے اور ڈھائی سو برس سے بھی زیادہ کی تلاطم خیز زندگی کے بعد دہلی کی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔

اگر اورنگ زیب نے اپنی فوج میں ہندو سپہ سالار رکھے تھے تو ادھر اس کے حریف سیواجی نے بھی مسلمان سرداروں کے زیر حکم اپنی فوج دے رکھی تھی۔ ان میں سے بعض بہت ذمہ داری کے عہدوں پر ممتاز تھے مثلاً سیدی ہلال اور نور خاں۔ سیواجی کی بحری فوج میں بھی کم از کم تین مسلمان امیر البحر موجود تھے۔ سیدی سنبل، سیدی مصری، اور دولت خاں۔

میں نے ذرا طوالت کے ساتھ ان تاریخی واقعات کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا ہے کہ مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندستان میں آکر سوائے آپس میں لڑنے مرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ حقیقت بھی نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں رہ کر بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ انہوں نے ہندستان کو ایک مجتمع اور مضبوط سلطنت بنا دیا اور اسے ترقی اور شان کی معراج پر پہنچا دیا۔ انہوں نے

علم و فن کی سرپرستی کی، اور ایک مدت دراز کی کوششوں سے اسے ایک قومی ریاست بنا دیا۔ میں نے جو تاریخی حوالے دئے ہیں ان کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں نے مسلمانوں سے لڑائیاں کی ہیں اور جتنی لڑائیاں ہندوؤں کے خلاف لڑیں ان سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ اور یہ تاریخ کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالنا ہوگا، اور غلط ہوگا اگر ہم یہ خیال کریں جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال بھی کیا ہے کہ مسلمان اپنے چھ سو سال سے زیادہ کے دورِ حکومت میں مسلسل ہندوؤں ہی سے لڑتے اور ان پر مظالم کرتے رہے ہیں جس کی وجہ سے ہندوؤں کے دل میں نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی ہے، اور اس نفرت و عداوت کے اثرات نہ اب تک مٹے ہیں اور نہ آئندہ مٹ سکتے ہیں۔

یہ تو ابھی چند ہی روز کی بات ہے کہ ہندستانی سپاہی برطانوی سلطنت کی لڑائیاں لڑنے کے لئے چین، ملایا اور برما میں مشرق کی طرف اور عرب، ایران، افغانستان، ترکی، ساری نیشیا، طرابلس۔ اور خود یورپ میں مغرب کی جانب بھیجے گئے تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے ترکوں کے خلاف جنگ کی ہے۔ اور ان کی سلطنت کی تباہی کا باعث ہوئے ہیں۔ یہ چیز کبھی ان کے راستے میں حائل نہ ہوئی کہ بعض وہ ممالک کہ جن کے خلاف انہیں لڑنا پڑا۔ مسلمانوں کے ملک تھے۔ اور یہ جو کچھ ہوا اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ ہندستان سے باہر کے مسلمانوں کی تاریخ ایسی جنگوں سے بھری پڑی ہے جو مسلمانوں سے ہوئی ہیں اور ایک مسلمان بادشاہ نے دوسرے مسلمان بادشاہ سے جنگ کر کے اسے شکست دی ہے اور اس کا ملک فتح کیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کے لئے مسلمان کا قتل ممنوع قرار دیا ہے، اور ان کی زندگی میں بعض اوقات اگر کسی شخص نے میدانِ جنگ میں بھی یہ کہہ دیا کہ میں

مسلمان ہوں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ایک ایسا شخص جو اسلام کا اعتراف کرتا ہی لیکن اس کے سچے اور ایمان دار ہونے میں شبہ ہے اس بات کا مستحق ہی کہ لڑائی میں اس کی جان بخشدی جائے یا اس کا مستوجب ہی کہ اور دشمنوں کی طرح اسے بھی قتل کیا جائے تو رسول اللہؐ کا فیصلہ یہی ہوا ہی کہ جو شخص بھی اسلام کا معترف ہے اس کو نہ مارا جائے اور اس کی جان بخش دی جائے۔ لیکن آپ کی وفات کے فوراً بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مسلمان اس ممانعت کو بھول گئے۔ حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے بھی اس امتناعی حکم کو فراموش کر دیا کہ جن کا رسول اللہؐ سے قریبی تعلق تھا یا ان لوگوں سے قریبی تعلق تھا جو رسول اللہؐ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ حضرت عثمان صرف تیسرے خلیفہ ہی نہ تھے بلکہ اس سبب سے کہ رسول اللہؐ کی دو لڑکیاں پے درپے آپ کے عقد میں آئی تھیں۔ رسول اللہؐ کے قریبی عزیز بھی تھے، اُن کو باغی مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ حضرت علی جو کہ آپ کے چچیرے بھائی، اور آپ کے داماد، اور مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے ان کی جنگ حضرت عائشہؓ سے ہوئی جو کہ رسول اللہؐ کی بیوہ تھیں، اور وہ بھی حضرت عثمانؓ ہی کی طرح مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ حضرت علیؓ کے بیٹوں کے قاتل بھی وہ مسلمان ہی تھے جو یزید کو جو کہ بنی امیہ تھا خلیفہ تسلیم کر چکے تھے جبکہ رسول اللہؐ کی وفات کے چند ہی روز بعد یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ لوگ بھی جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں (حضرت علیؓ سب سے پہلے نوجوان تھے جو پیغمبرؐ صاحب پر ایمان لائے) داخل تھے اور مدت العمر آپ کی صحبت سے فیضیاب رہے تھے وہ بھی باہم جنگوں میں پھنس گئے تو پھر اس بات کے سمجھنے میں کیا دقت ہوسکتی ہی کہ بعد کے زمانے کے مسلمان مسلمانوں سے لڑتے رہے ہیں۔

مسلمانوں کی مسلمانوں سے بعد کے زمانے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں تو یہ یقینی امر ہے اگر شاید بالکل ابتدائی زمانے کی لڑائیوں میں یہ یقینی نہ بھی ہو، کہ ان باہمی آویزشوں میں اسلام یا تبلیغ اسلام کو کوئی دخل نہ تھا، اور اسی طرح ہندستان میں جو جنگیں ہوئیں وہ بھی مذہب کے لئے نہ تھیں۔ ملک کی فتح اور اپنی قوت کے استحکام کے بعد ہر فاتح۔ ہر بادشاہ، ہر شہنشاہ کی کوشش یہی ہوئی ہے کہ ملک میں اپنی سمجھ کے مطابق بہترین انتظامات کرے اور ملک اور ملک کے باشندوں کی حفاظت کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کا اثر نظم و نسق اور رعایا کی زندگیوں پر ضرور پڑتا تھا لیکن یہ چیز اس سے بالکل مختلف ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ان دنیادار بادشاہوں کا خواہ وہ بیرونِ ہند کے ہوں یا ہند کے، مقصد اسلام کی تبلیغ تھی۔ ہندستان میں تو خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں نے بلکہ عام طور پر تمام مسلمانوں نے ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے جزیرے سے بنا لئے تھے جو ترقی کرتے رہے اور برابر اپنی وسعت بڑھاتے ہی رہتے تھے۔ جو غیر ملکی حملہ آور فاتح بن کر آتے تھے اور یہاں آباد ہو جاتے تھے ان کی تعداد یقینی طور پر غیر مسلموں کی بہ نسبت بہت کم ہوتی تھی۔ آج مسلمانوں کی جو آبادی ہے اس میں حصۂ غالب ان ہندستانیوں کا ہے جنھوں نے اسلام کو مذہب کے طور پر قبول کر لیا تھا اور ان لوگوں کی اولاد کہ جو ضرور ہندو ہوں گے۔

جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جنگی اور فوجی معاملات میں ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے پر اتنا اعتماد اور ہمدردی تھی تو یہ قیاس کر لینا بالکل مطابقِ عقل ہوگا کہ شہری انتظامات میں، اور لوگوں کی زندگی کے اور تمام شعبوں میں تو اور بھی زیادہ یگانگت اور ہم آہنگی ہوگی، اور یہ صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ اس

کی سند میں تاریخی ثبوت موجود ہیں۔

ہندوؤں کو ملازمتیں دینا ان کی حکومت ضروری سمجھتی تھی۔ محمود غزنوی کی فوج میں بہ کثرت ہندو فوج تھی کہ جو اس کی طرف سے وسط ایشیا کے میدانوں میں جا کر لڑی، اور اس کے ہندو سپہ سالار تلک نے اس بغاوت کو فرو کیا جو مجموعہ کے ایک مسلمان سالارِ فوج نیا لتگین نے کی تھی۔ جبکہ قطب الدین ایبک نے ہندستان میں رہنے کا ارادہ کر لیا تو اس کے پاس اس کے سوا چارۂ کار ہی نہ تھا کہ انہی ہندو عہدہ داروں کو شہری خدمات پر بحال رکھے جو ملک کے انتظامات سے واقف و آگاہ تھے کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تمام انتظامات حتیٰ کہ مالیات کی وصول یابی بھی، سب گڑبڑ اور ابتر ہو جاتے۔ مسلمان اپنے ہمراہ باہر سے کاریگر اور محرر، اور محاسب نہیں لائے تھے۔ ان کے لئے عمارتیں ہندوؤں نے بنائیں اور اپنے قدیمی طرزِ تعمیر کو نئے حالات کے مطابق بنا لیا، ان کے لئے سکے ہندو سنار ڈھالتے تھے، اور ان کے حسابات ہندو محاسب رکھتے تھے۔ برہمن قانون داں بادشاہ کو ہندو قانون بتاتا تھا، اور برہمن نجومی ہی ان کی مدد ان کی عام تقریبوں کی انجام دہی میں کرتا تھا۔[1] ابراہیم عادل شاہ اوّل کے عہدِ حکومت کا ایک قابلِ غور واقعہ یہ ہے کہ تمام سرکاری حسابات بجائے فارسی زبان کے ہندی میں رکھے جاتے تھے اور بہ کثرت برہمن اس حساب کتاب کی خدمت پر مامور تھے چنانچہ انہوں نے چند ہی روز میں حکومت کے اندر اپنا بڑا اثر قائم کر لیا۔ یوسف عادل شاہ کے عہد میں ہندوؤں کو مالیات کے محکمے میں بھی کافی اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔[2]

---

[1] تارا چند ۱۳۶ - ۱۳۷

[2] این، این لاّ صفحہ ۹۴

سلطان محمد تغلق کے زمانے میں بھی بہ کثرت ہندو ملازم تھے۔ اس کے مالیات کے محکمے میں ایک ہندو رتن نامی ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھا۔ اکبر کے مشہور وزیر مال راجہ ٹوڈرمل نے نظم و نسق سلطنت میں عظیم الشان تبدیلیاں کی تھیں اور اس کا شمار دربار کے سب سے اونچے درجے کے امرا میں ہوتا تھا۔ اورنگ زیب کا وزیر مالیات بھی رگھناتھ نامی ایک ہندو تھا۔[5]

آج بھی دیسی ریاستوں میں ہندو اور مسلمانوں کو ریاست کے اعلیٰ عہدے بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، دئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد کی حیدرآباد میں اور مرزا سر محمد اسمٰعیل کی میسور اور جے پور میں مثال دینا اس کے ثبوت میں کافی ہوگا۔

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش آزادی تھی، اور دونوں بہادر شاہ کے دامنوں کو پٹ گئے تھے جو کہ اس وقت دہلی کے نام نہاد بادشاہ تھے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہوجاتی تو یقینی بہادر شاہ کی سلطنت قائم ہوتی اسی طرح جس طرح کہ بصورت ناکامی انہی کو قید اور جلاوطن کرکے ہندستان کے مغل بادشاہوں کے خاندان کو بالکل تباہ و برباد کردیا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بلوے کے فوراً بعد کے چند سال حکومت برطانیہ کے ہاتھوں مسلمانوں پر بڑی مصیبت کے گذرے۔ مسلمان علما نے حق یہ ہے کہ کسی زمانے میں بھی انگریزی راج کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ مسلمانوں پر ان کے طویل تاریخی پس منظر کی مناسبت سے انگریزی مداخلت کا کہ جو باہر سے آئے تھے بہت زیادہ اثر پڑا۔ اور ان میں باز اثر یا ردِ عمل بھی زیادہ واقع ہوا۔ یہی باہر کا بیرونی دباؤ سب سے

---

[5] مہتہ و پٹوردھن صفحہ 19

بڑا تنہا عنصر ہے جو قوموں کا ارتقا عمل میں لاتا ہے۔ جولین ہکسلے کا یہ قول اس سے پیشتر بھی نقل کیا جا چکا ہے[۵] اور یہ امر ذرا بھی تعجب خیز نہیں ہے کہ وہ سب مل کر ہندستانی قوم بنانے کے لئے ایک ہو گئے ہیں۔ مسلمان ہندوؤں کی بہ نسبت اس امر کا اعتراف کرنے میں کچھ تیب پیچھے نہیں رہے ہیں کہ ہندستان میں ایک واحد ہندستانی قوم کا وجود ہے باوجودیکہ ہندستان کے اندر کئی مختلف مذاہب ہیں اور ان میں سے دو تو بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پیروؤں کی تعداد ملک کی آبادی کا بزرگ ترین حصہ ہے۔ سر سید احمد خاں جن کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو کانگریس سے علیحدہ رکھا، ان کا بھی شروع زمانے میں یہی عقیدہ تھا ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوشیزہ کی دو آنکھیں ہیں اور تم دوسری کو نقصان پہنچائے بغیر ایک آنکھ کو صدمہ نہیں پہنچا سکتے۔ ان مسلمانوں کے تقریری اور تحریری مقولے کہ جو کانگریس سے خود واسطہ اور تعلق رکھتے ہیں، حوالے میں لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

میں اس "دو قومی" نظرئے کی بحث کو چند مشہور اور ممتاز مسلمانوں کی کتابوں سے اقتباس کر کے ختم کروں گا۔ سب سے پہلے تو میں سر سید احمد خاں کی تقریروں سے دو اقتباس نقل کروں گا، اور پھر دو زندہ ممتاز مسلمانوں کی کتابوں سے اقتباس پر اس باب کو ختم کر دوں گا۔

۱۸۸۵ء میں گورداسپور کے ایک مجمع کے سامنے سر سید نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا:-

---

[۵] جولین ہکسلے (Julian Huxley) کی کتاب "ریس ان یورپ" (Race in Europe) صفحہ ۳

"قدیم ترین زمانے سے لفظ "قوم" کے معنی ایک ملک کے باشندے ہیں اگرچہ وہ اپنی بعض خصوصیتوں میں جو کہ ہر ایک کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں مختلف بھی ہوں۔ ہندو اور مسلمان بھائیو، کیا تم ہندستان کے علاوہ کسی اور ملک میں آباد ہو؟ کیا تم ایک ہی ملک کے اندر نہیں رہتے؟ کیا تم اسی ایک زمین پر جلائے اور دفن نہیں کئے جاتے؟ کیا تم اسی ایک زمین پر نہیں چلتے پھرتے اور اسی ایک زمین کی پیداوار پر گذر بسر نہیں کرتے؟ یاد رکھو کہ یہ الفاظ ہندو اور مسلمان صرف مذہبی اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں، ورنہ تمام آدمی خواہ وہ ہندو ہوں، یا مسلمان، یا عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں سب ایک اور صرف ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ تمام مختلف فرقے صرف ایک ہی قوم کہلا سکتے ہیں اور ان کو ملک کی فلاح اور بہبود کی خاطر جو کہ سب کا مشترک ملک ہے مل کر ایک ہو جانا چاہیئے۔" [۱]

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے یہی بات لاہور میں کہی ہے:-

"میں لفظ قوم میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو شامل کرتا ہوں کیونکہ یہی ایک معنی ہیں جن سے میں اس لفظ کی تشریح کر سکتا ہوں۔ میرے لیئے یہ بات کچھ بھی قابلِ غور نہیں ہے کہ ان کا مذہب کیا ہے کیونکہ مذہب ایسی چیز نہیں جو نظر آسکے۔ جو چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک ہی زمین پر بستے ہیں، ایک ہی حکومت کے زیر حکم ہیں، ہماری

---

[۱] "پاکستان اگزامنڈ" (**Pakistan Examined**) کے صفحہ ۱۵ پر رضا الکریم صاحب نے اقتباس دیا ہے۔

راحتوں کے سرچشمے بھی ایک ہیں اور قحط کی مصیبتیں بھی ہم ساتھ ساتھ اور یکساں جھیلتے ہیں۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں نسلوں کو جو ہندستان میں رہتی ہیں ایک ہی لفظ "ہندو" سے یاد کرتا ہوں جس کے معنی "ہندستان میں رہنے والا" ہیں۔ میں جب تک بھی مجلس مقننہ میں رہا ہمیشہ اس قوم کی بہتری کی فکروں میں لگا رہا۔"

(انڈین نیشن بلڈرس - Indian Nation Builders) سر سید احمد خاں صفحہ ۱۴۱، ۴۲۔)

شری یت اتولانند چکرورتی کی کتاب "ہنڈوز اینڈ مسلمانس آف انڈیا" (Hindus and Muselmans of India) کے مقدمے میں سر شفاعت احمد خاں صاحب جو کہ تاریخ کے مشہور عالم ہیں، ہندستان کی سماجی اور تہذیبی ترقی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:-

"تقریباً ہماری تمام قومی سرگرمیوں کے دائرۂ عمل میں دونوں فرقوں کے درمیان اس سے زیادہ یگانگت اور یک جہتی تھی کہ جتنی عام طور پر خیال کی جاتی ہے۔ ہندستانی تہذیب کی تاریخ دونوں فرقوں میں اور نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی مسلسل تبادلۂ خیالات اور جذبات کی ہم آہنگی کی شہادت دیتی ہے، اور ہندستانی زبانوں کی مستند تاریخ ایک ایسی قومی روح کے پیدا ہونے کی خبر دیتی ہے کہ جو ایشیا کی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی فہم و ادراک کہ جس نے عوام و خواص دونوں کے مذاق کو صحیح اور عقل کو پاکیزہ بنا دیا، پوری قوم میں ساری ہو گیا ہے اور اس نے پوری قوم کو شائستہ و مہذب بنا دیا ہے۔ ہمارے آپس کے سیاسی

اختلافات خواہ کچھ بھی ہوں، اور میں ہرگز انہیں چھوٹا کرکے دکھاؤں گا بھی نہیں۔ ان اختلافات کے باوجود یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ ان دونوں کی فہم و فراست، اور ان کی زندگی کی روایتوں، ان کی عادتوں، اور ان کے دائرۂ خیال کی ترکیب یا مزاج میں ایک ایسی طاقت اور اتحاد کی روایت ہے جسے تقریباً ایک ہزار سال تک بھٹی میں تپ تپ کر اور پھر سردی پا پا کر فولادی قوت حاصل ہو گئی ہے اور اب وہ نہ مٹائی جا سکتی ہے اور نہ فنا ہو سکتی ہے۔[۱] بقول سر شفاعت کے "جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ نظر کی کمزوری ہے کہ انہیں سماجی واقعات عجیبہ چھوٹے ہو کر صرف سیاسی واقعات نظر آتے ہیں، اور جن آنکھوں میں یہ بیماری ہے کہ ایک قومی جسم کے دکھ اور مرض کو صرف سیاسی خرابی محسوس کرتی ہیں ان کا علاج اس طریق پر کرنا چاہیئے کہ انہیں ہندو مسلم متحدہ تہذیب کا گہرا اور بہ کثرت مطالعہ کرایا جائے، اور ان فنون سے ان کی نگاہوں کو آشنا کرایا جائے کہ جنہوں نے ہمارے شاندار زمانۂ ماضی میں ہندوستانی تخیل اور ہندوستانی خواہشات کو ڈھالا ہے۔"[۲]

سر سلطان احمد صاحب نے بھی اس سے کچھ کم زور کے ساتھ اپنی رائے

---

[۱] رولانڈ جکر ورتی کی کتاب ہنڈوز اینڈ مسلمانس آف انڈیا" (Hindus and Musalmans of India) صفحات ابتدائی ۱۹-۲۰۔

[۲] اسی کتاب کا صفحہ ابتدائی ۱۶۔

کا اظہار نہیں کیا ہے:۔ اس زمانے کے ہندو مسلم اختلافات سے اندیشہ ہے کہ وہ دونوں فرقوں کی اس تاریخی رفاقت کو زائل نہ کردیں جو مغل بادشاہوں کے زمانۂ حکومت سے شروع ہو کر صدیوں تک باقی رہی ہے۔ اس بات کا بہت کم اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندستان کے اتحاد کو توڑنے کے یہ معنی ہوں گے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ جو ایک تعمیری جزو ہے اسے مٹا دیا جائے۔ آج کل کے ہندستانی یقینی طور پر اپنے باپ دادا کی نسبت زیادہ علم رکھتے ہیں لیکن ان کے خیالات کی تصویر اس بڑی عظیم الشان تصویر کے سامنے کچھ دب کر رہ جاتی ہے جس پر کہ آرین عرب اتحاد کا تخیل منقوش ہے۔ کسی قدر پچھلے زمانے کے ہندستانی لیڈر اور ہندستانی اہل الرائے برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ ان دونوں مذہبوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کردیں۔ شہزادہ دارا شکوہ نے ان کو تشبیہ ایسے دو دریاؤں سے دی ہے جو پہلو بہ پہلو بہ رہے ہیں اور مجمع البحرین ان کا نام رکھا ہے۔ کبیر اور نانک نے بھی یہی کوشش کی کہ انھیں آپس میں مخلوط کردیں اور اپنی دعاؤں میں "اللہ کریم اور رام" کے نام داخل کردئے۔ ہندو اور مسلمان استادوں کو ہدایت تھی کہ ایسے فن اور ایسے ہنر پیدا کریں جو دونوں میں مشترک ہوں اور جو روحوں پر اثر کرکے ان ضرورتوں کو پورا کردیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کردینے کے لئے ضروری تھیں۔ خوشی اور حسن کے متعلق مشترک تخیل پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن اس زمانے کے ہندستانی سرے سے اس عمارت ہی کو ڈھانے چلے ہیں جو ان کے لئے تاریخ کے ہاتھوں نے تیار کی ہے۔ اس تاریخ کی خوبیوں کا اندازہ کرنے سے چونکہ وہ قاصر ہیں۔ اس لئے اسے برا کہنے لگے ہیں۔

"یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اتنے بہت سے نقطہ ہائے اتحاد ہندو مسلمانوں کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی ہندو مسلم اتحاد برباد ہو جائے۔ ہمارا فرض تو

یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ان نقطوں کو اتحاد کی بنیاد میں وسیع تر کرنے کے لئے استعمال کرتے۔ ہمیں ورثے میں صرف ایک مشترک موسیقی اور ادب اور فن نقاشی اور فن تعمیر کے خزانے ہی نہیں ملے تھے، بلکہ ایک مشترکہ سیاسی قسمت بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوش بدوش بہت سی لڑائیاں کرنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ سماجی زندگی میں بھی دونوں فرقوں کی روایتیں اور رسمیں ایک دوسرے کے ساتھ گندھ گئی تھیں۔ زندگی کے مشترک طریقے تو اس قدر ابتدا میں جیسے کہ بابر کا زمانہ تھا پیدا ہو گئے تھے جس نے ازراہِ خوش طبعی انہیں ہندی طریقوں کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ ان طریقوں میں ہندو اور مسلمان دونوں بالکل مل گئے تھے۔ اس کے بعد اردو زبان لشکر کی زبان کی حیثیت سے پیدا ہوئی۔ مذہب کے معاملات میں بھی جو کہ اس زمانے میں دونوں کو سب سے زیادہ عزیز چیز تھا، دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب پر اثر ڈالا ہے۔ مسلمانوں نے عام ہندوؤں کے مذہب کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ اور خود ان کے مذہب نے بھی ہندو اثر کے ماتحت ہندستانی شکل اختیار کر لی۔ اس تبدیلی کو ان کے ضرورت سے زیادہ کٹر مسلمانوں نے محسوس کیا ہے۔

"ہندستان میں آکر مسلمان اسی زمین کے فرزند بن گئے تھے۔ زندگی کا یہ راستہ ان کے لئے اسی تاریخ سے ناگزیر ہو گیا تھا کہ جس دن قطب الدین نے دہلی کی سلطنت کو غزنوی سلطنت سے علیحدہ کر لیا۔ مسلمان بادشاہ کو صاف اور واضح الفاظ میں یہ حکم امتناعی ملا ہوا تھا کہ وہ اپنی رعایا کے فرقوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھے کیوں کہ اسے حکم تھا کہ وہ تمام مذہبی فرقوں کو ایک نگاہ سے دیکھے اور ایسا نہ ہو کہ ایک فرقے سے محبت اور دوسرے فرقے سے عداوت اس کے دل میں راہ پائے جب ہم بابر کی سوانح عمری کا ابوالفضل کی آئین اکبری سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ معلوم کرنا بہت دلچسپی کا باعث ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ہندستان کی محبت برابر ترقی کرتی گئی ہے۔ مغل سلطنت کا بانی شکایت کرتا ہے کہ "ہندوستان ایک ایسا ملک ہے

جس میں بہت ہی کم خوشیاں ہیں کہ جو اسے دل آویز بنائیں" لیکن نو وارد بابر کا زمانہ اکبر تک پہنچتے پہنچتے بدل جاتا ہے اور اس کے ہندستان کے متعلق خیالات بادر ہوا ثابت ہوتے ہیں۔ اکبر کا مورخ ہندستان کے "حسن و خوبی" سے متاثر ہو کر اپنی گزشتہ بے راہ روی کی معذرت اس طرح کرتا ہے کہ "وطن کی محبت" سے مجبور ہو کر وہ ایسا لکھ گیا تھا۔[۱]

[۱] سر سلطان احمد کی کتاب "اے ٹریٹی بٹوین انڈیا اینڈ دی یونائیٹیڈ کنگڈم" صفحہ ۶۱
(A Treaty Between India and the United Kingdom)

حصہ دوم

فرقہ وارانہ مثلث

۶۔ تمہید

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے ہندستان کے ساتھ طویل تعلق کے زمانے میں کس طرح مسلمان بادشاہوں، مسلمان ماہرین فن، مسلمان فقرا، اور اسی طرح دوسرے سب لوگوں نے لگاتار اس بات کی کوششیں کیں کہ جس حد تک بھی ممکن ہو ہندو تہذیب کو اپنا لیں۔ اور اس کے جواب میں بالکل یہی کوششیں ہندوؤں کی جانب سے بھی بہت بڑی حد تک عمل میں آئیں اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہوکر ایک نہیں ہوئے تھے پھر بھی مشترک دلچسپیوں کے اور باہمی میل جول کے مواقع بہت بڑھ گئے تھے اور کچھ عرصہ گذرنے پر وہ چیز پیدا ہوگئی تھی کہ جسے ہندستانی تہذیب کا نام دیا جاسکے۔ سیاسیات کی دنیا میں زمانۂ حال کی اصطلاح کے مطابق ان حالات سے ایک قوم کا وجود میں آجانا لازمی تھا، اور ایسا ہو بھی گیا تھا بالخصوص اس زمانے میں کہ جب برطانوی حکومت اس ملک میں قائم ہوگئی اور ہندو اور مسلمان دونوں اس حکومت کی رعایا بن گئے۔ ہم نے معتبر اور مستند مسلمانوں کی رائیں یہ ثابت کرنے کے لئے نقل کردی ہیں کہ مسلمان اور ہندو دونوں ہندو مسلمانوں کو ایک قوم خیال کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے نمائندے اتنے ہی زور کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ اور جداگانہ ایک قوم ہیں۔ اس عجیب صورتِ حالات کا سبب آخر کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے کسی قدر تاریخی واقعات کی چھان بین کرنی پڑے گی۔

مسلمان فاتحین کا طرزِ عمل فی الجملہ رواداری پر مبنی تھا، اور باوجود اس کے کہ گاہے ماہے ان میں سے بعض کی مذہبی سرگرمیاں غیر مناسب حد تک ظاہر ہوئی ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شروع ہی سے ان کی یہ کوشش رہی کہ ہندوؤں کے ساتھ منصفانہ

برتاؤ کریں۔ شروع کے زمانے کی ایک مثال لکھی جاتی ہے۔ محمد بن قاسم نے جب برہمن آباد پر قبضہ کیا تو وہاں کے لوگوں نے اس سے درخواست کی کہ انہیں اپنے طریق پر پوجا کرنے کی اجازت دی جائے۔ محمد بن قاسم نے سب حالات لکھ کر حجاج کو بھیجے کہ جو عراق میں حاکم تھا اور وہاں سے یہ جواب ملا: "چونکہ وہ (ہندو) اطاعت قبول کر چکے ہیں اور خلیفہ کو محاصل ادا کرنے پر راضی ہیں تو ایسی صورت میں ان سے کوئی اور مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہماری پناہ میں ہیں اور ہم کسی طرح بھی ان کی جان اور ان کے مال کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکتے۔ انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ اپنے دیوتاؤں کی پوجا کریں۔ کسی شخص کو مذہبی فرائض کی ادائیگی سے روکنا نہ چاہیے۔ وہ اپنے گھروں کے اندر جس طرح بھی وہ چاہیں رہ سکتے ہیں۔"[۱] یہ حکم پیغمبر صاحب کی تعلیم کے بالکل مطابق تھا جس پر ابتدائی زمانے کے خلفاء اسلام کا عملدرآمد تھا جو کہ ان غیر مسلموں کے ساتھ کہ جنہوں نے اطاعت قبول کر لی اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے بالکل یہی برتاؤ کرتے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کو اپنی ایک آزادانہ روش اختیار کرنے میں بہت زیادہ عرصہ نہیں لگا، اور اس سے کچھ واسطہ نہ رہا کہ اسلام کے مذہبی احکام کیا ہیں اور اسی طرح انھوں نے حکومت کو مذہب کی گرفت سے بالکل آزاد کر لیا۔ علاء الدین خلجی جس کی سلطنت پورے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اس بات کا مخالف تھا کہ علماء امور سلطنت میں دخل دیں اور اس نے اعلان کر دیا کہ ملک کا قانون صرف بادشاہ کی مرضی کا نام ہے اور اسے پیغمبر صاحب کے احکام سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے سزا کے متعلق بادشاہی اختیارات خصوصی کو جائز قرار دیا اور بے ایمان اور بد چلن

---

[۱] ایشوری پرشاد کی کتاب "اے شورٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا" (A Short History of Muslim Rule in India) صفحہ ۴۰

افسروں کے سرقلم کرا دینے کو عین انصاف سمجھا درحالیکہ قاضی شہر نے ایسے قتل کو خلاف قانون قرار دیا ہو۔ اس نے قاضی کو اپنا شاہی اصول واضح الفاظ میں اس طرح سمجھا دیا کہ "ایسی بغاوتوں کو روکنے کے لئے کہ جن میں ہزاروں انسان تباہ و برباد ہوتے ہیں میں جو احکام بھی سلطنت اور رعایا کے لئے مفید ہوتے ہیں صادر کرتا ہوں۔ لوگ بے پروا ہیں، بے ادب ہیں، اور میرے حکموں کی نافرمانی کرتے ہیں۔ مجھے اس وقت ان کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے سختی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اس سے کچھ مطلب نہیں ہے کہ یہ کارروائی مطابق قانون ہے یا خلاف قانون، میں تو جو کچھ بھی سلطنت کی بہبود کے لئے ضروری اور ناگہانی طور پر پیدا ہونے والے حالات کے لئے لازمی سمجھتا ہوں وہی حکم دیتا ہوں، اور اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں کہ قیامت کے دن مجھ پر کیا گزرے گی[۵۲] فیاض طبع خود مختار بادشاہوں نے ہمیشہ ایسا ہی دعویٰ کیا ہے، اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے بادشاہ کے کاموں میں کہ جس کی رعایا میں مختلف مذہبوں اور مختلف رواجوں کے پیرو آدمی شامل ہوں۔ بادشاہ کی حیثیت سے اور کسی خاص مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے فرق ہوتا ہے

بابر نے اپنی اولاد کے لئے جو امتناعی حکم چھوڑا وہ اسی کتاب میں پیشتر دیا جا چکا ہے اس پر اس کے جانشین برابر عمل پیرا رہے۔ اور اس کا نتیجہ سلطنت کی توسیع کی صورت میں نکلا۔ ان احکام کی طرف سے بے التفاتی نے وہ صورتیں پیدا کر دیں جو بالآخر اس کی بربادی کا باعث ثابت ہوئیں۔ غیر ملک کے لوگوں نے بھی اس احترام کو محسوس کیا ہے جو ہندوؤں کے جذبات کے متعلق مسلمان ملحوظ رکھتے تھے عید کے موقع پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گائیں قربان نہیں ہوا کرتی تھیں کیونکہ ہمیں

---

[۵۲] الشوری پرشاد صفحہ ۱۲۶

بتایا گیا کہ اس دن (عید) جو مسلمان بھی صاحب استطاعت ہو وہ اپنے گھر میں بکرے کی قربانی کرے گا اور تہوار منائے گا۔[۵] پھر کیا تعجب ہے کہ دونوں فرقے ساتھ ساتھ دوستانہ تعلقات کے ساتھ رہتے تھے۔ اگرچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دونوں مل کر ایک دوسرے کے اندر جذب ہو گئے ہوں۔

مسٹر ایف کے درانی نے ان حالات کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور میرے لئے یہی مناسب ہے کہ ایک کافی لمبا اقتباس ان کی کتاب سے پیش کردوں۔

"قدیم ہندو ایک قوم نہ تھے وہ صرف ایک قبیلہ یا محض ایک گروہ تھے۔ "ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی حیثیت کچھ اس سے بہتر نہ تھی۔ اسلام اپنے بانی کے زمانے میں ضرور ایک ریاست بن گیا تھا۔ اس کے اندر ایک واضح سیاسی فلسفہ موجود ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اسلام ایک سیاسی فلسفہ ہی ہے۔ .... اسلامی ریاست ایک جمہوریت ہوتی ہے جس کے قیام و استحکام کا ہر مسلمان فرد ذمہ دار ہے۔ لا اسلام الا بالجماعۃ بغیر ایک منظم جماعت کے اسلام نہیں ہوتا۔ یہ فاروق اعظم حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے۔ بدقسمتی سے اسلامی ریاست بہت دنوں تک باقی نہ رہی۔ بنوامیہ، اور بنو عباسیہ نے اسے تباہ کر دیا، اور اسے ملک یا خود مختار شخصی سلطنت بنا کر رکھ دیا جو باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملنے لگی۔[۶]"

---

[۵] پیلسارٹ (Pelsaert) کے حوالے سے ایشوری پرشاد نے لکھا ہے۔ صفحہ ۱۲۶۔

[۶] ایف کے۔ خان درانی کی کتاب دی مینگ آف پاکستان" (The Meaning of Pakistan) صفحہ ۲۴، ۲۵

جس زمانے میں مسلمانوں نے ہندستان کو فتح کیا ہے. مذہب اور ریاست کی بے تعلقی دنیا بھر کے مسلمانوں کا مسلّمہ اعتقاد بن چکی تھی جن لوگوں نے ہندستان کو فتح کیا وہ مسلم ریاست کی فوج نہ تھے بلکہ ایک خودمختار فرماں روا کے تنخواہ پانے والے سپاہی تھے جو حکومت انھوں نے ہندستان میں قائم کی وہ بھی اسلامی ریاست نہ تھی، بلکہ ملک کی فتح، ملک پر قبضہ کا قائم رکھنا، ملک سے ناجائز فائدے اٹھانا. غرض کہ جو کچھ بھی انھوں نے کیا سب کچھ ایک شخصی خودمختار حکمراں اور اس کے درباریوں کے لئے کیا ہندستان کے اندر مسلمانوں کی سلطنت صرف اس معنیٰ میں مسلمان سلطنت تھی کہ جس شخص کے سر پر حکومت کا تاج تھا وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا اپنی حکومت کے تمام طویل و دراز زمانے میں مسلمانوں کے اندر کبھی قومیت کا احساس نہ پیدا ہوا. شاہی حکمتِ عملی ہمیشہ اس کی مخالف رہی کہ یہ احساس ان میں پیدا نہ ہو۔[۵۱]

"اس طرح ہمیں دو فرقے ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے اور یکساں طور پر ایک شاہی خودمختار کی غلامی کرتے ہوئے ملتے ہیں اور جو دونوں کے دونوں قومی احساس اور قومی جذبات سے بالکل عاری ہیں۔۔۔۔۔"[۵۲]

"ہندو مسلمان دونوں کے مذہبی معتقدات، مذہبی خیالات، اور مذہبی مشاغل کے باہم ناقابل آمیزش ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود دونوں کے مذہبی معتقدات میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے کہ جس کی بدولت وہ

---

[۵۱] درانی صفحہ ۳۵-۳۶

[۵۲] " " ۳۶-۳۷

صدیوں تک دوستانہ تعلقات کے ساتھ دوش بدوش رہے۔ وہ چیز کچھ ایسی ہے کہ اگر آج بھی وہ ان تمام تعلیمات کو جو انھوں نے انگریزی حکومت کی بدولت حاصل کی ہیں۔ اور ان تمام مصیبتوں کو جو اس حکومت کے دور میں انھیں اٹھانی پڑی ہیں اپنے دلوں سے بالکل دھو سکیں، اور اگر آج بھی وہی پرانی مذہبی ذہنیت ان کو واپس مل سکے جو ایک صدی پیشتر تک ان کے آبا و اجداد کے دماغوں پر طاری تھی : تو آج پھر وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ اچھے پڑوسیوں کی طرح ایک ہی ریاست کے شہری بن کر خوشگوار تعلقات کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ روح رواداری کی روح ہے جو دونوں مذہبوں کے اندر طاری و ساری ہے"۔[۱]

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی ضرب المثل بالکل پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے، اور اس مثل پر دنیا بھر کے فاتحوں کا ہر زمانے اور ہر ملک میں عملدرآمد رہا ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کسی ملک پر بدیشی قبضہ جائز ہے تو پھر اگر بدیشی حکمراں اس اصول کو اختیار کرے تو اس پر کوئی خاص الزام عائد نہیں ہوتا۔ اس لیے انگریزوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے اگر وہ اپنے آپ کو دوسرے فاتحین کے درجے سے بلند نہ کر سکے اور انھوں نے بھی "ماؤنٹ اسٹیوارٹ الفنسٹن" (Mountstuart Elphinstone) کی اس نصیحت پر عمل کیا کہ رومن قوم کا اصول "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" تھا وہی ہمارا بھی اصول ہونا چاہیئے۔ ناگوار صرف یہ چیز گذرتی ہے کہ ہندستان میں انگریز جو کچھ بھی کرتے ہیں اسے ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل بہت ہی بلند نصب العین کے

---

[۱] درانی صفحہ ۳۶ - ۳۷

ماتحت اور خالصتاً خدمت خلق کے لئے ہے۔

موجودہ زمانے کے بظاہر صلح ناپذیر اختلافات جو ہندو مسلمانوں میں رونما ہو گئے ہیں بہت بڑی حد تک پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی حکمت عملی پر عمداً عمل کرنے کا نتیجہ ہیں۔ یہ حکمت عملی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے ہی سے شروع ہو گئی تھی جبکہ انگریز ہندستان پر اپنی حکومت کو جمانے کی فکر دل میں لگے ہوئے تھے، اور اسی حکمت عملی کی جھلک ان بیانات میں بھی نظر آ رہی ہے جو کہ چند ہی روز پہلے اس زمانے کو وزیر ہند مسٹر ایل، ایس، امیرے نے یا بعض دیگر سلطنت ہند کے بڑے بڑے عہدہ دار انگریزوں نے دئیے ہیں۔ یہ چیز ہے کہ جو اس پرانی ہندو مسلم ذہنیت کو پھر پیدا ہونے سے روکے ہوئے ہے جو اگر ہو جائے تو ہندو مسلمان پھر خوشگوار تعلقات کے ساتھ ساتھ اچھے پڑوسیوں کی طرح اور ایک ہی ریاست کے شہریوں کی طرح مل جل کر رہ سکتے ہیں۔

ہندستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ اس لئے صرف ہندو مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے جو کہ اسے باہمی رضامندی سے آج طے کر سکتے ہیں اگر وہ چاہیں۔ یہاں ایک تیسرا فریق بھی موجود ہے اور بعض امور کے لحاظ سے وہی سب سے اہم فریق ہے اور یہ فریق ثالث برطانوی حکومت ہے۔ گویا اس میں ایک فرقہ وارانہ مثلث موجود ہے۔ اور اس کا نام بہت ہی موزوں اور صحیح رکھا گیا ہے۔ اس مثلث کی ساقیں (بازوؤں کے خطوط) تو ہندو اور مسلمان ہیں، اور اس کا قاعدہ (نیچے کا خط جس پر دونوں ساقیں کھڑی ہوتی ہیں اور آگے جا کر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں) برطانوی حکومت ہے۔ یہ قاعدہ کا خط جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے اسی قدر مثلث کی ساقوں کا باہمی فصل بھی بڑھتا جاتا ہے۔

(۷) "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" اور ایسٹ انڈیا کمپنی

جس زمانے میں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندستان کے اندر سلطنت کی بنیادیں رکھ رہی تھی وہ زمانہ تھا کہ جن لوگوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں وہ آپس کی جنگوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ جو گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مقرر تھے ان کی بنیادی حکمت عملی یہ تھی کہ ان لڑائی جھگڑوں سے فائدہ اٹھائیں، اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ہندستانی انگریزوں کے خلاف باہم متحد نہ ہو جائیں۔ کمپنی کے افسروں کا یہ ایک مقصد تھا کہ مرہٹوں میں اور نظام میں، اور کرناٹک کے نواب میں باہم اتحاد نہ ہونے پائے۔ اور بعد میں حیدرآباد اور ٹیپو سلطان کے متعلق بھی یہی احتیاط مدنظر ہو گئی۔ ڈبلیو، ایم، ٹارنیس (W. A. Torrens) نے لکھا ہے کہ

"یہ بالکل صحیح ہے جیسا کہ "مالکم" (Melcolm) نے لکھا ہے کہ ہندستان کبھی مغلوب نہ ہو سکتا تھا اگر خود اس کے فرزندوں کی مدد ہمیں نہ حاصل ہوتی۔" شروع شروع میں نظام ارکاٹ کے اور ارکاٹ نظام کے خلاف لڑے، بعد میں مرہٹے مسلمانوں کے اور افغانی مرہٹوں کے مخالف ہو گئے۔[1] مرہٹوں کے آپس کے اختلافات بھی بڑی حد تک مرہٹہ دربار میں انگریزوں کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔ مرہٹوں کی تاریخ میں دو مرکزی ہستیاں ایسی گذری ہیں جن کے دامنوں سے

---

[1] ڈبلیو، ایم، ٹارنیس کی کتاب "ایمپائر ان ایشیا" (Empire in Asia) صفحہ ۱۹۔

مرہٹہ عروج اور زوال پلٹے ہوئے نظر آسکتے ہیں۔ سیواجی کی بہادری اور عقلمندی نے مرہٹہ سلطنت کی بنیاد ڈالی، اور رگھوناتھ راؤ کی عاقبت نااندیشی اور سازش نے سلطنت کو ڈبو دیا"۔[1]

گرانٹ ڈف (Grant Duff) نے لکھا ہے کہ "مسٹر موسٹن (Mr. Mostin) کو حکومت بمبئی نے اس غرض سے پونا بھیجا تھا کہ خانگی یا اور دوسری قسم کے اختلافات ہر ممکن کوشش کے ذریعہ سے پھیلائیں تاکہ مرہٹے حیدر یا نظام علی کے ساتھ نہ ملنے پائیں"۔[2] اس نے رگھوبا کی مدد کی جو اس سبب سے اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔ اس نے مرہٹوں کو نظام اور حیدر علی سے لڑنے کے لئے ابھارا حالاں کہ اس جنگ سے مرہٹوں کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا نانا فرنویس نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ رگھوبا حکومت بمبئی کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور انگریزوں کا آلۂ کار بن گیا ہے، اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر رگھوبا ہی پیشوا رہا تو مرہٹہ سلطنت کی تباہی دور نہیں ہے۔ رگھوبا کو جب یہ نظر آیا کہ نانا فرنویس اور دوسرے وزرائے سلطنت اس کے مخالف ہو گئے ہیں تو وہ گجرات کو بھاگ گیا اور وہاں پہنچ کر بمبئی کے پریزیڈنٹ اور کونسل سے مدد مانگی۔ یہ سب تو اس کام کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے تاکہ اس طرح مرہٹوں کی سلطنت کو کمزور کیا جا سکے۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے مغربی ساحل پر مراعات مل سکیں بالخصوص سلسٹ اور بسین

---

[1] بی، ڈی باسو کی کتاب رائز آف کرسچین پاوران انڈیا" (Rise of Christian Power in India) صفحہ ۲۰۹۔

[2] گرانٹ ڈف کی کتاب ہسٹری آف دی مرہٹاز" (History of the Marahtas) صفحہ ۳۴۰۔

کے جزیروں اور جزیرہ نما کی کمپنی کو حوالگی۔

اس حکمت عملی میں ہندو مسلمان کا کوئی امتیاز بر بنائے مذہب نہ تھا اور مسلمانوں کو اسی طرح مسلمانوں کے خلاف لڑا دیا جاتا تھا جیسا کہ ہندوؤں کے خلاف اور اسی طرح ہندوؤں کو ہندوؤں کے خلاف کھڑا کر دیا جاتا تھا جیسا کہ مسلمانوں کے خلاف۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان بادشاہوں میں سے ہر ایک کو دوسروں کی مدد سے شکست دے کر دبا دیا جائے۔ اور پھر جب دوسروں کی باری آئے تو انہیں بھی اسی طرح زیر کیا جائے۔ اس طریقِ کار کی ایک بہت اچھی مثال اس برتاؤ میں ملتی ہے جو وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings) کے عہد حکومت میں روہیلوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ روہیلے جس علاقے پر قابض تھے اس کی سرحد اودھ کے نواب وزیر کی قلمرو سے ملتی تھی۔ ان پر ان کے اپنے مقامی سرداروں کی حکومت ہوتی تھی اور انھیں بہت سی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ آزادی حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ دولت مند اور خوش حال ہو گئے تھے۔ روہیلے سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کی طرح برابر زمانۂ امن کے علوم و فنون کو ترقی دیتے رہے تھے۔ ان کا ملک اودھ کے اور اس علاقے کے درمیان واقع تھا کہ جہاں تک مرہٹے فتح کرتے کرتے جا پہنچے تھے، اور جس وقت مرہٹوں نے نواب وزیر کے علاقے پر حملہ کرنا چاہا اور روہیلوں کو بعض بہت ہی فائدہ رساں مراعات کی پیش کش اس شرط کی کہ وہ مرہٹہ فوج کو اپنے ملک میں سے گذر جانے دیں تو روہیلوں نے صاف انکار کر دیا اور مرہٹوں کی دست برد اور حملے کی مصیبت مول لے لی۔ روہیلوں نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کے ایما پر وہ نواب وزیر سے باہمی دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے اور انگریز ہی اس معاہدے کے ضامن بنے تھے۔ جب اس طریقہ پر مرہٹوں کے

حملوں کا طوفان بپا کر دیا گیا تو اب نواب وزیر، اور گورنر جنرل کے مابین یہ سازش ہوئی کہ کسی طرح روہیلوں کا علاقہ اودھ کی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ گورنر جنرل ہیسٹنگس نے وزیر کو یہ ترغیب دی کہ اس کے علاقے میں جو امدادی فوج اس عذر پر مقیم ہو کر بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کرے گی اسے اس کام پر لگایا جائے اور اس میں صرف انگریز افسر ہوں کہ جن کی ماتحتی میں وہ کام کرے اور اس کے معاوضے میں نواب وزیر ایک مقررہ رقم ادا کرے جس سے کمپنی کو مالی منافع ہو۔ کمپنی کو منافع حاصل ہونے کی غرض سے روہیلکھنڈ کا علاقہ اس طرح سے فروخت کیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے ایک پوشیدہ معاہدہ اودھ کے صوبہ دار اور ہندستان کے گورنر جنرل کے درمیان ضبط تحریر میں آیا جس کی رو سے کمپنی نے یہ اقرار کیا کہ جب کبھی کوئی مناسب بہانہ ہاتھ آ جائے یا پیدا کیا جا سکے تو روہیلوں کو کچل کر ان کا علاقہ نواب وزیر کے علاقے میں شامل کر دے گی اور اس کے صلے میں نواب وزیر چالیس لاکھ روپے اور اس فوج کا تمام خرچ جو اس کام پر لگائی جائے گی ادا کرے گا۔[1] اس قسم کے بہانے فوراً تلاش کر لئے گئے اور روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا گیا۔ اور روہیلوں کو بہادرانہ مدافعت کے بعد شکست کھانی پڑی۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی فاتحانہ حقوق کا اتنا بے رحمانہ اور خلاف انسانیت استعمال نہیں ہوا ہے، اور اگر شاید ہوا بھی ہوگا تو شاذ و نادر ہی ہوا ہوگا۔ ایک ایک آدمی جو اپنے آپ کو روہیلہ کہتا تھا چن چن کر یا تو قتل کر دیا گیا یا مجبور کیا گیا کہ کہیں بھاگ کر پناہ لے۔ لیکن یہ تمام مظالم عہدنامے کی شرائط کی حد سے نہیں گزرے تھے کیونکہ ہیسٹنگس کے اپنے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شرطوں میں یہ بات خاص طور سے شامل تھی کہ "روہیلوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے" یہ ہیسٹنگس کے اپنے الفاظ ہیں۔[2] ٹارنس کا بیان ہے کہ ہیسٹنگس نے بیس ہزار پونڈ

---

[1] ڈبلیو ایم، ٹارنس (W. M. Torrens) کی کتاب "دی ایمپائر آف ایشیا" (The Empire of Asia) سے ماخوذ صفحہ ۱۰۰-۱۰۱۔

[2] ڈبلیو ایم، ٹارنس صفحہ ۱۰۲ W. M. Torrens

اس عہدنامے پر دستخط کرنے کے صلے میں اپنی جیب میں داخل کیے، اور کمپنی کے سرکاری خزانے میں چار لاکھ پونڈ کا اضافہ ہوگیا۔

اس کے چند ہی روز کے بعد نواب وزیر کی بھی باری آگئی۔ کمپنی کو روپے کی اور ضرورت لاحق ہوئی۔ نواب نے افلاس کا عذر پیش کیا۔ خط وکتابت ہوتی رہی جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ ایک ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل نئی تدبیر ایسی سوچی گئی کہ کلکتہ کے خزانے میں روپے بھی پہنچ جائیں اور لکھنؤ خزانے میں بھی کمی نہ آئے۔ لارڈ میکالے نے لکھا ہے کہ وہ تدبیر صرف یہ تھی کہ گورنر جنرل اور نواب وزیر ایک تیسرے شخص کو لوٹنے میں باہم شریک ہو جائیں اور جس تیسری شخصیت کو لوٹنے کی تجویز کی گئی وہ ان میں سے ایک ڈاکو کی ماں تھی۔[۱] اس لوٹ کا شکار سابق نواب وزیر کی ماں اور بیوہ کو بنایا گیا جس کے قبضے میں خیال تھا کہ بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس لوٹ سے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ ہاتھ آئے۔

ہیسٹنگس نے اس بات کی مثال قائم کر دی تھی کہ امدادی فوجوں کے نام سے برطانوی سپاہیوں کی مستقل فوجیں ہندستان کے فرمارواؤں کو کرایہ پر دے دی جایا کریں، اور اس طرح وہ ذریعہ قائم ہو جاتا تھا جس سے کہ آہستہ آہستہ ان میں سے ہر ایک کی آزادی اور حاکمانہ اختیارات سلب ہوتے رہتے تھے۔ ہیسٹنگس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اودھ کے اندر اس قسم کی فوج رکھنے سے اس کا مقصد یہی تھا کہ دیسی حکومت کو کمزور کرکے اسے ایک ماتحت حکومت بنا لیا جائے اور بعد کے واقعات نے اچھی طرح واضح کر دیا کہ اس کے شریک جرم یعنی نواب وزیر نے خود کو معہ اپنے شکار کے ہیسٹنگس کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔[۲]

---

[۱] ڈبلیو ایم۔ ٹارنیس صفحہ ۱۱۶ [۲] ایضاً۔ صفحہ ۱۰۱۔

اس مثال کے بعد اب یہ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ اس برطانوی حکمت عملی کی مزید مثالیں پیش کی جائیں کہ کس طرح ایک ہندستانی فرماں روا کو بہکا اور بھڑکا کر دوسرے سے لڑایا جاتا تھا، اور پھر بالآخر باری باری سے ان دونوں کو خود شکست دے کر مغلوب کر لیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے اس حکمت عملی سے صرف ہندستان ہی میں کام نہیں نکالا ہے بلکہ دوسرے مقامات پر بھی اس سے کام لے کر اسی قسم کی تباہی پھیلائی ہے۔

انیسویں صدی کے شروع ہی میں ایسا ہو گیا تھا کہ نہ صرف مغلوں کی سلطنت پورے طور پر تباہ و برباد ہو چکی ہو بلکہ ایسی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں بھی کہ جو مغل سلطنت کے شکست و ریخت ہونے کی بدولت پیدا ہو گئی تھیں، یا تو پورے طور پر تباہ کر دی گئی تھیں، یا کم از کم ان کو اتنا کمزور کر دیا گیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے میدان بالکل صاف ہو جائے، اور پورے ہندستان پر بلا شرکت غیرے اس کی فرماں روائی کا ڈنکا بجے۔ معدودے چند دیسی حکومتیں اب بھی ایسی باقی تھیں کہ جو حقیقتاً یا صرف برائے نام خود مختار اور آزاد تھیں، اور ان کے ساتھ وہی حکمت عملی برتی گئی تا آنکہ ان کا وجود باقی نہ رہا۔ اس طرح انیسویں صدی کی ابتدائی چوتھائی صدی میں مرہٹوں کی سلطنت پورے طور پر ختم ہو چکی تھی۔ اور جن مرہٹہ راجاؤں کو تخت حکومت پر قائم رہنے دیا گیا تھا وہ سب جنگی باج گزار بن چکے تھے۔ اودھ کی سلطنت کو اب تک برائے نام آزادی حاصل تھی۔ لیکن اس میں اتنی جان نہ تھی کہ برطانیہ کے کسی حملے کا مقابلہ کر سکے۔ یہ حملہ چند ہی سال کے بعد نازل ہوا۔ اور اودھ کا بھی الحاق عمل میں آ گیا۔ ٹیپو سلطان اب سے پہلے ہی شکست کھا کر مارا جا چکا تھا اور اس کی سلطنت ملحق ہو چکی تھی۔ نظام دوست بن گئے تھے اور ان سے انگریزوں کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ سکھوں نے پنجاب اور شمال مغربی علاقے میں اپنی سلطنت

قائم کرلی تھی اور ان سے کچھ اندیشے باقی تھے۔ مغل بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ گیا تھا اور ملک کے کسی قابل لحاظ ٹکڑے پر اس کی حکومت باقی نہ تھی۔

(۸) وہابی تحریک

اگرچہ مسلمان اپنی ایک بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت کھو چکے تھے، لیکن اب بھی انھیں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا رہتا تھا کہ ان کے اندر سے کبھی کبھی پرجوش مذہبی لوگ اصلاح کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارا سیاسی زوال اسی بات کا نتیجہ ہے کہ ہم اسلام کی بلند سطح سے نیچے گر گئے ہیں اور وہ مسلمانوں کو ہدایت کرتے تھے کہ پھر صحیح معنی میں پابند اسلام بن جائیں اور یہ صدہا مختلف رسم و رواج جو اتنی مدت میں ہم نے اختیار کرلیے ہیں اور جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا ترک کردیں۔ شروع میں ایک اس قسم کے مصلح مولوی شریعت اللہ تھے جو بنگال میں ضلع فرید پور کے ایک موضع بہادر پور کے رہنے والے تھے۔ وہ تقریباً بیس سال تک عرب میں رہ کر آئے تھے اور اب واپسی پر انھوں نے ایک فرقے کی "فرائضی" فرقے کے نام سے بنا ڈالی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے دھودو میاں نے بہادر پور کو اپنا صدر مقام بنایا اور کسانوں میں اپنی اس اصلاحی تحریک کو چلاتے رہے جس میں صرف مذہبی ہی اصلاح شامل نہ تھی بلکہ کسانوں کو زمینداروں کے مظالم سے بچانا بھی مقصود تھا۔

کچھ عرصے کے بعد رائے بریلی کے مولوی سید احمد نے ایک تحریک شروع کی جس کی شاخیں تمام ہندستان میں پھیل گئیں اور انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں اس نے ملک میں بہت کچھ ہل چل مچادی۔ وہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے اور دہلی میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے علم اور پارسائی کے لئے انھوں نے بڑی شہرت حاصل کرلی تھی

اس زمانے کے بہت سے علمار نے انھیں اپنا پیشوا تسلیم کر لیا۔ اور انھوں نے سماجی برائیوں کے خلاف جیسے کہ شراب خواری اور زنا وغیرہ میں بہت زوردار تحریک چلائی۔ انہوں نے اپنے نائبوں اور مریدوں کو دور دور تک بھیجا مثلاً حیدر آباد، اور جنوبی ہندستان اور بنگال وغیرہ سکھوں کے خلاف جہاد کے بھی وہ مرکز بن گئے تھے جن کے متعلق یہ سننے میں آتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے ہیں، انھیں اپنے مذہبی فریضوں کے ادا کرنے سے روکتے ہیں اور ان کی عبادت گاہوں کی توہین کرتے ہیں۔ اس لئے مولوی سید احمد نے اعلان کر دیا کہ سکھوں کی ریاستیں دار الحرب ہیں اور ان کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ مرہٹوں نے بھی اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت سے پرہیز رکھا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی فریضے ادا کرنے کی آزادی دے رکھی تھی یہاں تک کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی مسلمان قاضی ہی کرتا تھا۔ مسلمان ان ریاستوں کو اور راجپوتوں کی ریاستوں کو بھی دار الاسلام خیال کرتے تھے۔ سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں اور ان کے مرید تمام ملک میں فوج کے لئے آدمی اور چندہ جمع کرنے کے لئے پھیل گئے سید صاحب کو جنگ کے متعلق بھی کچھ تجربہ تھا اور اس لئے اپنی فوج کی سپہ سالاری خود کی۔ انگریز حکام کو ان تمام باتوں کی پورے طور پر خبر تھی لیکن انھوں نے مداخلت نہ کی کیوں کہ جنگ کی تیاری سکھوں کے خلاف تھی کہ جن کے طاقت پکڑ جانے کو انگریزوں نے گوارا تو کر لیا تھا، لیکن ان کی طرف سے برابر اندیشے لاحق رہتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے ان تیاریوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"ان دنوں مسلمان علی الاعلان مسلمانوں سے سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لئے کہتے تھے۔ ہزارہا مسلمان، اور بے تعداد سامانِ جنگ جہاد کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ لیکن جب کمشنر اور مجسٹریٹ

کو اس کی اطلاع کی گئی تو انھوں نے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی۔ حکومت نے صاف الفاظ میں ان کو لکھ بھیجا کہ وہ ان تیاریوں میں کچھ دخل نہ دیں۔ دہلی کے ایک مہاجن نے جب مجاہدوں کا کچھ روپیہ غبن کرلیا تو دہلی کے کمشنر ولیم فریزر (William Fraser) نے ڈگری دلادی اور وہ روپیہ مجاہدین کے پاس سرحد پر بھجدیا۔[۵۱] محمد جعفر صاحب نے سوانح احمدیہ کے صفحے ۱۳۹ پر لکھا ہے کہ "اگر سرکار (انگریزی حکومت) سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ان کو کسی قسم کی کوئی مدد ہندستان سے نہ پہنچ سکتی تھی۔ لیکن ان دنوں برطانوی حکومت کا دلی منشا یہ تھا کہ سکھوں کی طاقت کو کم کیا جائے"[۵۲] نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی سید احمد اپنی فوج کو سندھ اور درۂ بولن کے راستے سے افغانستان میں لے گئے اور تب درۂ خیبر کے راستے سے ۱۸۲۴ء میں پنجاب پر حملہ کیا اور اپنی جنگ کبھی ہارتے اور کبھی جیتتے جاری رکھی تا آنکہ ۱۸۳۰ء میں پشاور کو فتح کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ سلطان محمد خاں جو سکھوں کی طرف سے پشاور کا گورنر تھا اس نے اطاعت قبول کرلی اور اسی کو اس عہدہ پر بحال رکھا گیا۔ مولوی مظہر علی کو وہاں کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اس طریقے پر انھوں نے سرحدی علاقے کے لوگوں کو مذہبی آزادی دلائی۔ لیکن سلطان محمد خاں گورنر اور مولوی مظہر علی کے درمیان پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ پشاور سے مولوی سید احمد کے واپس ہوتے ہی سلطان محمد نے قاضی مظہر علی کو سر دربار قتل کرادیا۔ مقامی لیڈروں سے سازش کرکے اس نے ان سب لوگوں کو مروا ڈالا جنھیں سید صاحب خود مقرر کرگئے تھے۔ ان حالات نے سید صاحب کو بہت ہی

۵۱ سر سید احمد خاں کے ایک مضمون مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۷۱ء سے ماخوذ کہ جس کا حوالہ مولوی طفیل احمد صاحب نے اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں دیا ہے۔ صفحہ ۱۰۲

۵۲ اپنی اسی کتاب میں طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے۔ صفحہ ۱۰۳۔

برہم کردیا اور انھوں نے ۱۸۳۰ء کے آخر میں اپنے چند مریدین کے ساتھ سرحد کا علاقہ ہی چھوڑ دیا اور ۱۸۳۱ء میں ایک جنگ میں پینتالیس سال کی عمر میں شہید ہوئے۔

اگرچہ ان کی وفات کے بعد ان کی فوج منتشر ہو چکی تھی لیکن مجاہدین نے سیتانا کے مقام پر جو کہ وادی سوات میں سرحد پر واقع ہے اپنا صدر مقام بنالیا۔ اور یہاں سے انھوں نے اپنی جنگ جاری رکھی اس مدد کے سہارے پر جو کہ انہیں ہندستان سے ملتی تھی۔ برطانوی حکومت ان سب حالات کی طرف سے دیدہ دانستہ آنا کانی کرتی رہی جب تک کہ پنجاب فتح نہ ہو گیا جیسا کہ سرولیم ہنٹر (**Sir William Hunter**) کی کتاب انڈین مسلمانس "**Indian Musalmans**" کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

> "انھوں نے اپنے پڑوسی ہندوؤں کو بہت کچھ قتل و غارت کیا قبل اس کے کہ ہم نے پنجاب کو ہندستان کے ساتھ ملحق کرلیا۔ وہ ہر سال برطانوی اضلاع سے پرجوش مجاہدین کو اپنی فوج کے لئے بھرتی کرلے جاتے تھے۔ ہم نے اپنی رعایا کے آدمیوں کو مذہبی دیوانوں کی فوج میں شامل ہونے سے روکنے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی جو کہ اپنا غصہ سکھوں پر اتارتے تھے۔ سکھ مختلف قبائل کا طرفہ مجموعہ تھے جو کبھی ہمارے دوست بن جاتے تھے۔ اور کبھی دشمن۔ ایک انگریز نے جس کی صوبۂ سرحد میں نیل کی کوٹھیاں تھیں مجھے بتایا کہ جو اچھے مسلمان اس کی ملازمت میں تھے ان سب کا یہ دستور تھا کہ اپنی مزدوری میں سے کچھ رقم بچا کر سیتانا کی چھاؤنی کے لئے رکھ دیتے تھے۔ اور جو زیادہ جوشیلے تھے وہ کبھی تھوڑے دنوں کے لئے اور کبھی زیادہ مدت کے لئے

اپنے دیوانے افسروں کے پاس جنگی خدمات انجام دینے کے لئے چلے جاتے تھے۔ جس طرح کہ اس نیل کی کوٹھی کے مالک کے ہندو ملازم تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد اس عذر پر چھٹی مانگتے تھے کہ انھیں باپ کا کریا کرم کرنا ہے بالکل اسی طرح مسلمان ناظر ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان چند مہینوں کی چھٹی لینے کے لئے یہ عذر پیش کرتے تھے کہ انھیں مجاہدوں کے کیمپ میں شامل ہونے کا مذہبی فریضہ انجام دینا ہے[۱]"

سر ولیم ہنٹر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"ہمارے پنجاب کو سلطنت میں ملا لینے کے بعد اس دیوانگی کا جوش جو اب تک سکھوں کے خلاف استعمال ہو رہا تھا اب ان کے جانشینوں کے خلاف استعمال ہونے لگا۔ ہندو اور انگریز دونوں سیتانا کی فوج کی نگاہ میں یکساں کافر تھے، اور جب ایسا تھا تو انہیں تلوار کے زور سے اکھیڑ کر پھینک دینا ضروری تھا۔ سکھوں کی سرحد پر جس بد نظمی کا ہم نے مزے لے کر نظارہ کیا تھا یا کم از کم اس کی جانب سے بے اتفاقی برتی تھی اب ایک تکلیف دہ وراثہ کی صورت میں وہ ہم پر نازل ہو گئی تھی[۲] ان کے متبعین

---

[۱] ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر (W. W. Hunter) کی کتاب "انڈین مسلمانس" (Indian Musalmans) سے طفیل احمد صاحب نے اقتباس کیا۔ صفحہ ۱۱۰۔

[۲] طفیل احمد صاحب کی کتاب میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب کا اقتباس صفحہ ۲۱-۲۲

ملک کے اس قدر دور دراز مقامات پر کہ جیسے بنگال میں راجشاہی بہار میں پٹنہ، اور پنجاب کی سرحد پر، بغاوت کی تلقین کرتے ہوئے ملے ان دیوانوں نے اس پوری مدت میں سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف ایک مزمن دشمنی کی صورت میں ابھارے رکھا۔ صرف ایک ہی واقعہ یہاں بہت سی داستانوں کا کام دے گا کہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان سرحد کی گڑبڑ نے ہمیں سولہ فوجی مہمیں بھیجنا پڑیں، اور اوسطاً ہر مہم پر ۳۳ ہزار باقاعدہ فوج بھیجی گئی اور ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیانی زمانے میں بیس مہمیں بھیجی گئیں جن میں سے ہر ایک میں ساٹھ ہزار باقاعدہ فوج اور ان کے علاوہ بے قاعدہ مددگار فوج اور پولیس نے شرکت کی۔"[1]

مجاہدوں کے کارناموں کی مزید تفصیلات غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ سید احمد بریلوی کے متبعین برابر مجاہدوں کی مدد کرتے رہے۔ ان کے دو خاص مرید مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی بھائی بھائی تھے۔ اور پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ پنجاب کی فتح کے بعد انگریزوں نے مجاہدوں کو ہندستان واپس جانے پر مجبور کیا اور مولوی ولایت علی معہ اپنے متبعین کے پٹنہ واپس آئے۔ انہیں یہ اقرار نامہ لکھنا پڑا کہ چند سال تک وہ سرحد کی طرف نہ جائیں گے، اس مدت کے ختم ہونے پر وہ اور ان کے بھائی دونوں اپنی املاک وجائداد فروخت کرکے ستانا کی طرف ہجرت کر گئے، اور ہجرت کی تحریک وجود میں

---

[1] طفیل احمد بحوالہ ہنٹر صفحہ ۲۴

آئی جو کہ کافی مدت تک چلتی رہی اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اسے اور بھی شہ مل گئی۔ جب انگریزوں نے سرحد پر ۱۸۶۳ء میں اپنی آگے بڑھنے کی حکمت عملی شروع کی تو یہ ضروری ہوا کہ سرحد کے باشندوں کا ہندستان کے باشندوں سے تمام تعلق قطع کر دیا جائے۔ اور ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء تک پانچ مقدمے بغاوت کے ہندستانیوں پر چلائے گئے جن میں سے بعض زیادہ ممتاز لوگ کہ جو ملزم قرار دئے گئے یا تو اسی پٹنہ کے خاندان کے تھے یا ان کے مریدین میں سے تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ان رشتہ داروں سے کہ جو سرحد پر تھے خط وکتابت جاری رکھی تھی اور ان کی مدد روپئے سے کی تھی۔ ان میں سے بعض کے لئے موت کی سزائیں تجویز ہوئی تھیں جو بعد کو حبسِ دوام اور جلاوطنی میں تبدیل کردی گئیں۔ لیکن قابل غور یہ بات ہے کہ ان لوگوں نے اس سے زیادہ یا اس سے بڑا کوئی کام نہ کیا تھا جس کام کو کہ برطانوی حکومت نہ صرف خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہی تھی بلکہ فی الحقیقت اس میں اس طرح مدد بھی دیتی تھی کہ مجاہدوں کے لئے ہُنڈیاں وصول کی جائیں اور ان کا روپیہ سرحد پر پہنچایا جائے۔ اس تحریک کا نام کہ جو سید احمد بریلوی نے شروع کی تھی اور ان کے بعد ان کے مقلدین نے عرصہ تک چلائی وہابی تحریک رکھا گیا ہے۔ سماجی اور مذہبی اصلاح کے متعلق وہابی جو تعلیم دیتے تھے اس میں جہاد کا اہم مسئلہ بھی داخل تھا۔ چونکہ ہندستان اب انگریزوں کے قبضے میں تھا جو مذہباً عیسائی تھے اس لئے وہ دارالحرب بن گیا تھا۔ جس کے خلاف جہاد ضروری ہے۔ اس فرقے کی تمام تعلیمات میں جہاد سب سے نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور ہر مسلمان کا فرض بتایا جاتا ہے[۵] اگر جہاد ممکن نہ ہو تو دوسرا فعل بدل کے طور پر ہجرت ہے۔

حکومت نے اس صورت حال کا مقابلہ جو وہابی تحریک نے پیدا کردی تھی دو طرح پر کیا۔

---

۵ طفیل احمد بحوالہ ہنٹر صفحہ ۶۴-۶۵

ایک طرف تو بڑے پیمانے پر مقدمے چلائے جن کی وجہ سے وہابیوں کی جماعت منتشر ہوگئی، اور دوسری طرف ان کی تعلیمات کے خلاف تبلیغ شروع کردی گئی۔ اور جہاد کی مخالفت میں فتوی حاصل کرکے تقسیم کئے گئے۔ سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ

"مجھے ہمیشہ اس واقعہ سے ناقابلِ بیان تکلیف پہنچتی رہی ہے کہ ہماری حیثیت ہندستان میں کچھ ایسی ہے کہ وہاں کے بہترین آدمی ہمارے طرفدار نہیں ہیں .... یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے کہ یہ پرانی دشمنی اب فرض کے درجے سے نکل گئی ہے۔"[۵]

غرض کہ پوری داستان شروع سے آخر تک "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول کی عملی تفسیر سے بھری پڑی ہے جس وقت تک کہ سکھ انگریزوں کے پہلو کا کانٹا تھے اس وقت تک مسلمانوں کی ہمت افزائی کی گئی کہ ان کے خلاف جہاد کریں۔ اور جب سکھوں کو شکست ہوگئی اور پنجاب فتح ہو چکا تو مجاہدین کا نام انگریزوں کے باغی رکھ دیا گیا۔ وہ گرفتار کر لئے گئے، ان پر مقدمے چلائے گئے اور انہیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں اور ان کی جماعتی شیرازہ بندی بکھیر دی گئی۔

(۹) سر سیّد احمد خاں کا اِبتدائی زمانہ

۱۸۵۷ء کا غدر ایسے اسباب کا نتیجہ تھا جو ایک بڑی لمبی مدّت سے جمع ہو رہے تھے اور اپنا اثر ڈال رہے تھے۔ کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ یہاں ان اسباب کی تشریح کی جائے کہ انہوں نے حالات کا رخ کس طرف کو کر دیا تھا۔ ایک بات بالکل

---

[۵] ہنٹر صفحہ ۱۴۴

یقینی ہی، وہ یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں شریک ہوئے اور دونوں دہلی کے بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ دونوں بے اندازہ مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ لیکن انگریزوں کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ساتھ زیادہ خصومت آمیز تھا کہ جن کے ہاتھوں سے انہوں نے ملک فتح کرکے چھینا تھا۔ لارڈ ایلن برو نے ۱۸۴۳ء میں لکھا تھا کہ

"مجھے یہ حد درجے کی بے وقوفی معلوم ہوتی ہی کہ جبکہ ہمیں آبادی کے دسویں حصے کی دشمنی کا یقین ہی تو پھر بھی ہم دس میں سے باقی نو حصوں کی پرجوش مدد حاصل نہ کریں جو کہ وفادار ہیں۔ میں اس اعتقاد کی طرف سے اپنی آنکھیں نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہی، اور اس لیئے ہماری صحیح حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ ہندوؤں سے مصالحت کریں۔"[1]

یہ حکمت عملی کچھ کامیاب ثابت نہ ہوئی کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اس میں حصہ لینے میں پیچھے نہ رہے، لیکن انگریزوں کا اعتبار ہندوؤں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس تلخ تجربے کے بعد بھی نہ ہٹا تھا جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہوگا:-

"لارڈ ایلن برو کے اس الزام کے علاوہ جو انہوں نے لارڈ کیننگ پر لگایا تھا، کلکتہ کے یورپین باشندوں نے بھی حکام بالا کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ لارڈ کیننگ کو واپس انگلستان بلا لیا جائے ان لوگوں نے جو الزام لارڈ کیننگ پر لگایا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے اس ملک کی نہ

---

[1] رتو لا نند چکرورتی نے اپنی کتاب "کال اٹ پالیٹکس" (Call it Politics) کے صفحہ ۴۵ پر حوالہ دیا ہی۔

پکار پر کوئی توجہ کی جو ہندستان کی یورپین جماعت نے غدر کے بعد بلند کی تھی ۔"

اس احتجاج کا اثر ہوا اور سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے کہ

"غدر کے بعد سے انگریز مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور صرف انہی کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ۔"

انتقام کے زبردست ہاتھ نے بہت سے ایسے خاندان کے خاندان تباہ و برباد کر دئے کہ جو اس سے پہلے دولت اور حکومت میں کھیل رہے تھے ۔ انہیں دبانے کی بالقصد ایک پالیسی حکومت کے تمام محکموں میں اختیار کر لی گئی ۔ مسلمان نہ صرف ملک کے انتظام کے اعلیٰ ترین شہری عہدوں پر ممتاز تھے ، بلکہ فوج میں ان کا تعلق اور بھی زیادہ نمایاں تھا ۔ اوّل الذکر اعزاز سے انہیں محروم کرنے کے لئے دو سبب جمع ہو گئے ۔ ایک تو برطانوی حکومت کی پالیسی ان کے خلاف کام کر رہی تھی ۔ دوسرے اس پالیسی کو مدد ان مسلمانوں کے طرزِ عمل سے مل گئی جو اپنے اس الم انگیز تجربے کے بعد اپنے گھروں کے اندر روٹھ کر بیٹھ رہے ، اور ایک عرصہ تک انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا کہ جو رائج کر دی گئی تھی اور جس کے بغیر حکومت کی ملازمتیں ملنا روز بروز دشوار تر ہوتا جا رہا تھا ۔

حکومت کی پالیسی میں ۱۸۷۰ء میں تبدیلی پیدا ہوئی بالخصوص سر ولیم ہنٹر کی اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد کہ جس کے حوالے اوپر دئے جا چکے ہیں ۔ وہ اپنی کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں :-

"مندرجہ بالا بابوں میں دو بڑی حقیقتیں ثابت کر دی گئیں ۔ ان میں سے ایک سرحد کے باغیوں کا مستقل جماؤ ہے اور دوسری ایک پرانی سازش ہے جو سلطنت کے اندر جاری ہے ۔ انگریزی حکومت ان باغیوں سے کوئی گفت و شنید نہیں کر سکتی ۔ جو ہتھیار رکھ کر سامنے آ گئے ہیں جو لوگ تلوار کا فیصلہ پسند کرتے ہیں انہیں تلوار ہی کے گھاٹ اتارنا چاہئے ۔

متعصب قوم تھی، اُن کی موجودہ روادارانہ حالت پر لے آئے ہیں۔"[۵۱]

مسلمانوں کے متعلق حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کا پیش رو یہی تھا علی گڈھ کی تعلیمی تجویز اسی پالیسی کا نتیجہ تھی علی گڈھ کالج کے انگریز پرنسپل پر الہام نازل ہوا کرتے تھے اور کالج ان سے پورا پورا مادّی فائدہ حاصل کرتا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر کی انگریزوں کی ہندستانی فوج ایک ایسی فوج تھی کہ جو حب وطن کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئی تھی اور اس میں ہندو مسلمان سکھ اور پوربیے سب ملے جلے تھے۔ اس فوج کی متحدہ کوشش نے جو ۱۸۵۷ء کے بلوے کی صورت میں ظاہر ہوئی، اور جو نتیجہ تھی اس متحدہ قومیت کے احساس کا کہ جو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں، اور اس کے بعد فوج میں جس پالیسی پر عمل کیا گیا وہ یہ تھی کہ اس اتحاد کو توڑ دیا جائے۔ سر جان لارنس نے لکھا کہ

> "غدر کے پیشتر کی فوج کے نقائص میں سب سے بڑا نقص، اور ایسا نقص کہ جس نے ہم پر سب سے زیادہ مہلک اثر کیا، بنگال کی فوج کا باہمی بھائی چارہ اور ہم جنسی تھی، اور اس کا علاج یہ ہے کہ اول تو ہندستانی فوج کے مقابلے میں گوروں کی فوج رکھی جائے اور دوسرے خود ہندستانی فوج کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے کا مدمقابل بنایا جائے۔"[۵۲]

---

۵۱ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "انڈین مسلمانس" کا صفحہ ۲۱۴۔
۵۲ مہتہ اور پٹوردھن کی کتاب۔ "دی کمیونل ٹرائی انیگل"
(The Communal Triangle)
صفحہ ۵۴۔

..........لیکن اپنی دشمنی اور نفرت میں مضبوط رہنے کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ بے چینی اور بے اطمینانی کے لئے کوئی جائز سبب تو موجود نہیں ہے.......... مگر حکومت ایسا صرف اس طرح کر سکتی ہے کہ اس پرانے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کرے جو برطانوی رعایا کے مسلمانوں کے دل پر لگ چکا ہے۔"[1]

اس کے بعد انہوں نے کافی تفصیل کے ساتھ وہ مصیبتیں گنائی ہیں جو مسلمانوں پر اور خصوصیت کے ساتھ بنگال کے مسلمانوں پر آئی تھیں، اور کس طرح برطانوی حکومت نے انہیں دبایا تھا۔ کس طرح ان کے ہاتھوں سے حکومت اور حیثیت جاتی رہی، کس طرح وہ افلاس کے گڑھے میں گر گئے۔ کس طرح وہ تعلیم سے محروم رہ گئے، اور کس طرح ان کے کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کے لئے اپنی حکومت سے انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں اور بالخصوص ان کے لئے تعلیم کا ایک ایسا نظام طلب کرتے ہیں جو ان کے مناسب حالات ہو، اور آخر میں یہ کہتے ہیں کہ:-

"اس طرح بالآخر ہم مسلمان نوجوانوں کو اپنی تجویز کے مطابق تعلیم دے سکیں گے۔ ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کئے بغیر، بلکہ خود ان کو ان کے مذہبی فرائض سکھانے کے دوران میں ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ مذہب کا خلوص اگرچہ کچھ کم ہو جائے لیکن اس سے مجنونانہ جوش دور ہو جائے۔ مسلمانوں کی آنے والی نسل بالکل انہی نقوشِ قدم پر چلتی ہوئی آگے بڑھے گی جو ہندوؤں کو جو کہ چند روز پہلے دنیا میں سب سے زیادہ

---

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "انڈین مسلمانس" صفحہ ۱۴۲، *Indian Musalmans of W. W. Hunter.*

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کی از سر نو تنظیم کی گئی اور اب قبیلوں، اور ذاتوں، اور فرقوں کے اختلافات پر اس کی بنیاد رکھی گئی، اور مختلف فرقوں اور ذاتوں کی ترتیب ایسی رکھی گئی کہ ہر جماعت کے دل میں فرقہ وارانہ جذبات برابر قائم رہیں، اور سب ایک دوسرے کی خصوصیات اور مخصوص اثرات کا مقابلہ کرکے توازن قائم رکھیں۔ چونکہ بنگال کی فوج نے کہ جس میں عام طور پر آج کل کے بہار اور صوبہ متحدہ کے لوگ بہ کثرت شامل تھے ۱۸۵۷ء کے غدر میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور چونکہ تازہ فتح کردہ پنجاب نے انگریزوں کی مدد کی تھی اس لئے اوّل الذکر کو آہستہ آہستہ فوج سے بالکل نکال دیا گیا۔ اور موخر الذکر کو فوج کے اندر روز افزوں فراوانی ملتی گئی۔ ڈاکٹر امبیدکر نے "ماڈرن ریویو" اخبار سے مسٹر چودھری کے ایک مضمون کا اقتباس کرکے ذیل کے نقشے میں وہ اعداد و شمار بہم پہنچائے جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندستانی فوج میں مختلف حصہ ہائے ہند کے باشندوں کا فی صدی تناسب کیا تھا:۔

سنہ	شمال مغربی ہندستان پنجاب۔ شمال مغربی سرحد اور کشمیر	نیپال گڑھوال اور کمایوں	شمال مشرقی ہندستان صوبۂ متحدہ اور بہار	جنوبی ہند	برما
۱۸۵۶ء	۱۰ سے کم	ناقابلِ لحاظ تعداد	۹۰	-	-
۱۸۵۸ء	۴۷	۶	۴۷	-	-
۱۸۸۳ء	۴۸	۱۷	۳۵	-	-
۱۸۹۳ء	۵۳	۲۴	۲۳	-	۰
۱۹۰۵ء	۴۷	۱۵	۲۲	۱۶	-
۱۹۱۹ء	۴۶	۱۴ر۸	۲۵ر۵	۱ر۲	۱۷
۱۹۳۹ء	۵۸ر۵	۲۲	۱۱	۵ر۵	۳

آج ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ بعض فرقے ہندستان میں ایسے ہیں کہ جو جنگ جو ہیں اور بعض غیر جنگ جو شمال مغربی ہندستان کی نسلیں اور فرقے جنگ جو شمار ہوتے ہیں، اور صوبۂ متحدہ اور بہار کے لوگ ایسے نہیں خیال کئے جاتے۔ شاید اس حقیقت کو بھلا دیا گیا ہے کہ جس فوج نے انگریزوں کے لئے پنجاب اور صوبہ سرحد کو فتح کیا تھا اس میں زیادہ تر صوبۂ متحدہ اور بہار ہی کے لوگ شامل تھے؛ اور ۱۸۵۷ء سے جس حکمت عملی پر بالقصد اور جان بوجھ کر عمل کیا گیا ہے اس نے ان لوگوں کو غیر جنگ جو بنا دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فوراً ہی یہ کارروائی شروع کر دی گئی تھی کہ صوبۂ متحدہ اور بہار کے باشندوں کو بہ کثرت فوج سے نکال دیا گیا تھا اور ان کی جگہ، سکھ، گورکھے، اور گڑھوالی بھرتی کر لئے گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سر سید احمد خاں نے بہت مصیبت جھیلی تھی اور باغیوں کے ہاتھوں پریشان ہوئے تھے اور انھوں نے باغیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد بھی کی تھی۔ ان کے دل پر اس بربادی کا بڑا اثر ہوا جو مسلمانوں کی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان انگریزوں سے ناواقفیت کی بنا پر ملازمتوں سے نکالے جا رہے ہیں وہ ایک قوم پرور شخص تھے اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قوم ہیں اور اس قوم کو وہ ہندو قوم کہا کرتے تھے کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں کا وطن ہندستان تھا۔ اس لئے اپنے ابتدائی زمانے میں ان کی تحریریں اور تقریریں ہمیشہ قوم پرورانہ رہیں اور ہندو اور مسلمان دونوں انہیں اپنا قومی لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ وہ بالکل جائز طور پر یہ خواہش رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی حالت میں ترقی ہو اور بالخصوص اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی آسانیاں مہیا کی جائیں۔ انہوں نے مختلف مقامات پر جہاں جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں گئے، اسکول قائم کرنے میں مدد دی اور ان میں سے بعض ابھی تک چل رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ انگریزی راج میں قوم کے لئے بھلائی ہے، اور اس حکومت میں جو نقائص ہیں انہیں حکام کو جتانے

کی ضرورت ہو تاکہ وہ خرابیاں دور کر دی جائیں۔ ان کے اس اعتقاد میں اس زمانے کے تمام لیڈر شریک تھے حتیٰ کہ وہ بھی کہ جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ نسل یا رنگ کی بنا پر یورپین اور ہندستانی میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے اور سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں یہ تفریق نہ برتی جانی چاہیئے۔ اور یہ امتیاز سماجی تعلقات اور سیاسی یا دستوری حقوق کے معاملات میں بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اسی بنا پر انہوں نے "البرٹ بل" کی وائسرائے کی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حمایت کی تھی۔ اور آگرے کے دربار کے موقع پر وہ صرف اس وجہ سے اٹھ کر باہر چلے آئے تھے کہ وہاں یورپین لوگوں کے لئے تو ڈائس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور ہندستانیوں کے لئے ڈائس سے نیچے۔ انہوں نے "سائنٹی فک سوسائٹی" (Scientific Society) کی بنیاد ڈالی تھی جس کے ممبر ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور جس میں مقالات پڑھے جاتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق" میں انہوں نے اس طرح لکھا ہے:۔

"کوئی قوم اس وقت تک قدر و منزلت نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ وہ حکمراں قوم کی برابری نہ حاصل کرلے، اور جب تک کہ وہ اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں اور ہندوؤں کی اس بات کے لئے عزت نہیں کر سکتیں کہ وہ محرری کی یا اور کسی ادنیٰ درجہ کی ملازمت پر متعین ہیں۔ اور بلکہ وہ حکومت بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جا سکتی کہ جو اپنی رعایا کی جائز عزت افزائی نہ کرے عزت اسی وقت ہمیں حاصل ہو سکے گی جب میرے ہم وطن انہی رتبوں اور عہدوں پر فائز ہوں گے کہ جیسے حکمراں قوم کو حاصل ہیں۔ حکومت نے سچے دل سے اور خلوص نیت کے ساتھ اپنی رعایا کو ہر ملک میں یہ حق دیا ہے کہ وہ اس برابری کے درجے کو پہنچیں۔ لیکن ہندستانیوں

کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ ہمیں عزم اور استقلال کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہیئے اور اس خوف سے کہ مبادا ہم پر کوئی مصیبت نازل ہو ہمیں قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیئے۔"[۵]

۱۸۵۳ء میں جبکہ "لوکل سیلف گورنمنٹ بل" (Local Self-Government Bill) کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہندستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں اس لئے یہ ضروری ہی کہ بورڈ کی کچھ نشستیں حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ پُر کی جائیں اور یہ طے پایا کہ ایک تہائی نشستیں اس طریقے پر پُر کرنی چاہئیں تاکہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کرکے کمی پوری کردے تاکہ جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخابات میں نہیں آئے ہیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہی کہ انھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کردی جائیں یا یہ انتخابات جداگانہ ہوا کریں۔ اور ظاہر ہی کہ وہ ایسا مطالبہ کربھی کس طرح سکتے تھے جب کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ہندو مسلمان مل کر ایک قوم ہیں۔ اور ان کا یہ اعتقاد ذیل کی سطروں سے جو کہ ان کی تحریرات کا اقتباس ہیں اچھی طرح ظاہر ہوتا ہی:-

> "لفظ قوم کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہی جو ایک ہی ملک میں رہتے ہوں .... یاد رکھیے کہ ہندو اور مسلمان مذہبی نام ہیں ورنہ ہندو اور مسلمان حتیٰ کہ عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں مل کر ایک متحدہ قوم بنانے میں شامل ہیں۔ جبکہ یہ تمام جماعتیں ایک ہی قوم ہیں تو پھر جو چیز بھی ملک کو نفع پہنچائے گی سب کو نفع پہنچانے والی

---

[۵] مولوی طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۸۱-۲۸۲

ہو گی .... اب وہ وقت گیا کہ جب صرف مذہب کے اختلاف کی بنا پر ملک کے باشندوں کو دو الگ الگ قومیں تصور کر لیا جاتا تھا۔"[۵۱]

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے یہ کہا ہے کہ

"جس طرح آرین لوگوں کو ہندو کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح اسی معنی میں مسلمان بھی ہندو یعنی ہندستان میں رہنے والے ہیں۔"[۵۲]

پنجاب کے ہندوؤں کو مخاطب کر کے انہوں نے کہا کہ

"اپنے لئے آپ نے لفظ ہندو جو استعمال کیا ہے میرے خیال میں وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میری رائے میں یہ مذہب کا نام نہیں ہے۔ ہندستان کا ہر باشندہ اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ لوگ مجھے ہندو نہیں سمجھتے حالانکہ میں بھی آپ کی طرح سے ہندستان کا باشندہ ہوں۔"[۵۳]

پھر کیا تعجب ہے کہ ہندو بھی انہیں اسی طرح اپنا لیڈر سمجھتے تھے کہ جتنا مسلمان پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ انہوں نے سر سریندر ناتھ کے اعزاز میں ایک جلسہ طلب کیا تھا جس میں ان سے سول سروس کے بیک وقت امتحانات ہونے کے متعلق تقریر کرائی تھی اور خود اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اور پھر کیا تعجب ہے کہ وہ بنگالیوں کے بڑے

---

۵۱ طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۸۳ ماخوذ از مجموعۂ لکچر سرسید احمد صفحہ ۱۶۷۔

۵۲ اسی کتاب کا صفحہ ۲۸۳ ماخوذ از "سرسید کے آخری مضامین" صفحہ ۵۵۔

۵۳ " " ۲۸۳ " "سفرنامہ پنجاب" سرسید احمد صفحہ ۱۳۹

مرلح تھے جنہوں نے متحدہ قومیت کی تحریک میں راستہ دکھانے کی خدمت انجام دی تھی۔

اب یہ ایک بہت ہی دل چسپ اور پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ایسی شخصیت کہ جس کے ایسے اعلیٰ خیالات تھے صرف چند سال گذرنے کے بعد مسلمانوں کو اس قومی تحریک سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دے جو کہ ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نام سے بروئے کار آئی اور جس میں سول سروس کے ایک انگریز ممبر مسٹر اے ' او ' ہیوم نے مدد دی تھی۔ اس کا جواب اس اثر کے اندر پوشیدہ ہے جو علی گڈھ کے ایم ' اے ' او کالج کے انگریز پرنسپلوں نے ڈالا تھا، اور اس کے بعد کے پندرہ بیس سالوں کی مسلمانوں کی سیاسیات کی تاریخ ایک ایسی تاریخ ہے جو ان دور اندیش اور چالاک انگریزوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے کہ جنہوں نے ایک ایسی خلیج کھودنی شروع کر دی کہ جو بعد میں عارضی وقفوں کے ساتھ برابر چوڑی ہی ہوتی چلی گئی۔

(۱۰) علی گڈھ کالج اور علی گڈھ کی سیاسیات کے انگریزی اصُول

جیسا کہ پیشتر ذکر آچکا ہے سر سید احمد خاں مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم دلانے کے بہت ہی مشتاق تھے اور انہوں نے ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول قائم کیا جو بعد میں ترقی پا کر اول محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ مسٹر بیک نامی ایک انگریز ۱۸۸۳ء میں اس کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۸۹۹ء میں اپنی زندگی کے خاتمہ تک برابر اسی عہدہ پر متمکن رہے۔ وہ بہت ہی مناسب اور صحیح وقت پر آئے تھے۔ اس انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ کہ جو ہندوؤں میں پھیل چکی تھی

آزادی اور جمہوریت کے خیالات بھی آئے تھے جو زبانوں پر بھی آنے لگے تھے۔ قومیت کی تحریک برابر ترقی کرتی جارہی تھی۔ انگریزوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ وقت آگیا ہے کہ اُن مسلمانوں کو کھینچ کر کے جو کل تک موردِ عتاب تھے اپنے دامنوں میں چھپا لیا جائے، تاکہ قومیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا جاسکے۔ مسٹر بیک نے اس حکمت عملی کو پادریوں کی سی سرگرمی کے ساتھ نافذ کردیا۔ "مسٹر بیک نے انتہائی جاں فشانی سے سرسید احمد کو قومیت کی تحریک سے کھینچنے کی کوشش کی، اور اس بات کی بھی کوشش کی کہ لبرل خیالات کے انگریزوں سے چھڑا کر انہیں قدامت پرست انگریزوں کی سیاست سے وابستہ کردیا جائے، اور ان کے دل میں اس بات کی خواہش اور جوش پیدا کردیا جائے کہ مسلمانوں اور حکومت کے درمیان مصالحت کرادیں۔ اپنے اس مقصد میں مسٹر بیک کو بڑی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی[۱]" انہوں نے شروع میں جو کام کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی ادارت پر اپنا قبضہ جما لیا جسے سرسید کئی سال سے نکال رہے تھے۔ ان سے پہلے علی گڑھ کالج میں جو انگریز پروفیسر رہے تھے ان کی رسم کے برخلاف مسٹر بیک نے آزادانہ طور پر مسلمان طلبہ کے ساتھ ملنا جلنا شروع کردیا، اور ان میں بہت ہر دل عزیز ہوگئے۔ دوسرے انگریز پروفیسروں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ہی کرنا شروع کی، اور کالج کے اندر مختلف کارروائیوں اور انتظامات شروع کرنے میں مدد دینے لگے۔ ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ضلع کے حکام نے بھی کالج کے کھیلوں اور دیگر کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی، یہاں تک کہ ۱۸۸۸ء میں صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر آکلینڈ کالون (Sir Auckland Colvin) نے کالج کے لڑکوں کی مثال انگلستان کی یونیورسٹیوں اور سرکاری

---

[۱] مہتہ اور پٹوردھن صفحہ ۵۸

اسکولوں کے طلبہ سے دی۔ سرسید احمد خاں انگریزی طرز معاشرت کے بڑے دلدادہ تھے اور انہوں نے لڑکوں میں ایک ایسا طرز رہنے سہنے کا رائج کیا کہ جس کے متعلق ان کے بعض رفقائے کار کا بھی یہ خیال تھا کہ ایک نسبتاً غریب ملک کے لئے وہ طرز ضرورت سے زیادہ بلند اور مہنگا تھا۔ لیکن اسی طرز زندگی کی بناء پر، نیز اس رسوخ کی بناء پر جو کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں کو حکومت میں حاصل تھا! اور پھر اس وجہ سے بھی کہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی واقع ہوگئی تھی علی گڈھ کالج کے طالب علموں کو سرکاری نوکریاں اور عہدے ملنے لگے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ ان تمام باتوں کا اثر سرسید احمد پر نہ ہوتا۔

"انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں نام کے ایڈیٹر سرسید تھے لیکن حقیقتاً اس کی ادارت پر قبضہ مسٹر بیک کا تھا۔ اس کی پالیسی میں بھی تغیر واقع ہوگیا۔ سرسید اس زمانے تک بنگالیوں کے بڑے مداح تھے

> "اس وقت تک سرسید کے دل پر بنگالیوں کی نیک نیتی کا بڑا اثر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بنگالیوں کی وجہ سے تعلیم میں بہت ترقی ہوئی ہے اور آزادی کے خیالات اور حب الوطنی کے جذبات ملک میں عام ہوئے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بنگالی ہندستانی فرقوں کا تاج سر ہیں اور مجھے بنگالیوں پر فخر و ناز ہے۔"[1]

اب مسٹر بیک نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں بنگالیوں کی اور ان کی تحریک کے خلاف ایڈیٹوریل مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ یہ مضامین سرسید احمد کی جانب منسوب کئے گئے کیونکہ پرچے کی ایڈیٹری میں انہی کا نام تھا، اور بنگالیوں نے سرسید پر اعتراضات

---

[1] طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۲۹۱۔

کی بھرمار کر دی۔ اس طریقہ پر بنگالیوں سے کھلم کھلا جھگڑا شروع ہو گیا۔[۵]

یہ وہ نازک وقت تھا کہ جب مسٹر بیک بنگالیوں سے خلاف فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں ہوا اور اس کے صدر مسٹر ڈبلیو، سی، بنرجی جو کہ بنگالی تھے منتخب ہوئے۔

کانگریس کے مقاصد میں کوئی بات بھی ایسی نہ تھی کہ جس پر کسی ہندستانی کو اعتراض ہو سکے۔ اپنے پہلے اجلاس میں کانگریس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر منتخب ہوا کریں اور صوبوں کی قانون ساز مجلسوں میں منتخب ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بھی ایسی مجلسیں قائم کی جائیں۔ سول سروس کا امتحان بیک وقت ہندستان اور انگلستان دونوں میں لیا جایا کرے، ملک کے فوجی اخراجات میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے، اور بالائی برما کا الحاق عمل میں نہ لایا جائے۔ ان میں سے دو تجویزیں یعنی سول سروس کے امتحان کے متعلق، اور کونسلوں کی توسیع کے متعلق ایسے معاملات سے تعلق رکھتی تھیں جن پر سر سریندر ناتھ بنرجی نے علی گڈھ کے ایک پبلک جلسہ میں زور دیا تھا جس کا انعقاد بھی سرسید نے کر دیا تھا اور صدارت بھی انہی نے کی تھی۔ ان چیزوں پر اینگلو انڈین طبقے کے اخبارات کی طرف سے مخالفت ہوئی تھی اور ان اخبارات میں مسٹر بیک کے مضامین نکلتے تھے۔ سرسید نے اس وقت تو کچھ نہ کہا لیکن دسمبر ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے موقع پر جس کا نام بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا انہوں نے کہا کہ مجھے ان لوگوں سے اتفاق رائے نہیں ہے جن کا یہ خیال ہے کہ مسلمان سیاسیات کی بحثوں میں الجھنے سے ترقی کریں گے، اور یہ کہ میرا تو یہ خیال ہے کہ ان کی ترقی کا بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ تعلیم ہے۔

---

[۵] طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۲۹۶۔

کانگریس کا دوسرا اجلاس مسٹر دادا بھائی نوروزجی کی صدارت میں کلکتہ کے مقام پر دسمبر ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ اس اجلاس نے اس قسم کی تجویزیں پاس کیں کہ مقدمات کا فیصلہ پنچائتیں کیا کریں، منصف اور مجسٹریٹ کے اختیارات الگ الگ کر دئے جائیں، اور ملک کے حفاظتی اغراض کے لئے رضا کاروں کی بھرتی کی جائے۔ کانگریس کے دو اولین اجلاسوں میں جو تجاویز پاس کی گئی تھیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی کہ جو کسی طریقے پر بھی مسلم مفاد کے خلاف ہے سر سید احمد خود سول سروس کے دونوں جگھوں پر امتحان ہونے کے حامی تھے۔ منصف اور مجسٹریٹ کے اختیارات کی علیحدگی بالکل وہی چیز تھی کہ جس پر مسلمانوں کی سلطنت کے زمانے میں عمل ہوتا تھا۔ ان دونوں کاموں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ایک کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں الگ الگ کیا گیا۔ اور پھر چند روز کے بعد ۱۸۵۸ء میں ملا دیا گیا۔ سر سید کچھ عرصہ پیشتر اس خیال کی بھی تائید کر چکے تھے کہ قانون ساز مجالس کے اندر منتخب عنصر میں اضافہ کیا جائے اور ان صوبوں میں جہاں ایسی مجلسیں نہیں ہیں قانون ساز مجالس قائم کی جائیں۔ ان سب باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی سبب موجود نہ تھا جس کی بنا پر سر سید احمد کانگریس کی مخالفت کرتے لیکن بعض انگریز افسر کانگریس کی تحریک کو ایک انقلابی تحریک خیال کرتے تھے، اور سر سید اپنے آپ کو اس خیال کے اثرات سے نہ بچا سکے جوان کے دل میں خاص طور پر مسٹر بیک نے ڈالا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم ابھی اس منزل پر نہیں پہنچی ہے کہ سیاسی تحریکوں میں ان کے حصہ لینے پر اعتبار کیا جا سکے، اور یہ کہ اگر وہ مشتغل ہو گئے تو ممکن ہے کہ پھر وہ اپنی بے اطمینانی کا اظہار اسی طریق پر کریں گے کہ جس طرح ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا، اور یہ کہ مسٹر بیک کو پورے طور پر یقین تھا کہ سیاسی تحریکات میں مسلمانوں کی شرکت ان کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔ مسٹر ہیوم نے سر سید کے نام ایک کھلا خط بھیجا تھا۔ جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سر سید کے جواب کے ساتھ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۷ء کے پرچے میں

شائع ہوا تھا۔

کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس کے مقام پر دسمبر ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اور اس کے صدر مسٹر بدرالدین طیب جی تھے اور اس اجلاس میں بہت سے مسلمان شریک ہوئے تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے افسروں نے اس وقت تک مخاصمانہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا چنانچہ مدراس کے گورنر نے کانگریس کے نمائندوں کو دعوت دی۔ اس اجلاس میں جو تجویزیں پاس ہوئیں وہ یہ تھیں کہ ہندستانیوں کو فوج میں کمیشن ملا کرے ہندستان میں ایک فوجی کالج قائم کیا جائے، قانون اسلحہ میں ترمیم کی جائے۔ ایکہزار روپیہ سالانہ سے کم کی آمدنی پر محصول نہ لیا جائے، اور صنعت وحرفت کی تعلیم کو رواج دیا جائے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی قریب قریب اسی زمانے میں لکھنؤ میں منعقد کیا گیا تھا، اور اس اجلاس کے بعد ایک عام جلسے میں سر سید احمد خاں نے کانگریس کی مخالفت میں اپنی پہلی تقریر کی تھی تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ سر سید جو کہ ہمیشہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین مساوات پر زور دیا کرتے تھے کس طرح اس قدر نیچے اتر آئے کہ یہ کہہ گذرے کہ قانون ساز مجلسوں کے ممبر انتخابات کے ذریعہ نہ بھیجے جانے چاہئیں کیونکہ اس صورت میں یہ ممکن ہو جائے گا کہ عام آدمی جو کہ اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں "میرے معزز دوست" کہہ کر وائسرائے خطاب کریں، جو اس قابل نہیں ہوتے کہ ڈیوک، اور ارل یا دوسرے شرفا کے ساتھ ایک ہی میز پر دعوتوں میں یا اجلاسوں کے موقع پر بیٹھیں، مجلس میں پہنچ سکیں گے اگرچہ انہوں نے بی اے یا ایم، اے کی ڈگریاں حاصل بھی کر لی ہوں اور سب طرح سے قابل بھی ہوں۔ اب اس صورت میں حکومت پر کیا الزام عائد ہو سکتا ہے اگر وہ ہمیشہ رئیسوں ہی کو کونسلوں کے لئے نامزد کیا کرتی ہے۔ انہوں نے ہندستان اور انگلستان دونوں جگہ سول سروس کے امتحان کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اگرچہ انگلستان میں امتحان دے کر اب بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ

ہر شخص خواہ وہ کسی امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا ایک معمولی درزی ہی کا لڑکا ہو سول سروس میں داخل ہو سکتا ہے! لیکن چونکہ یہاں ہندستان میں کسی کو اس کی ذات اور جماعت کا علم نہ ہوگا اس لئے لوگ اس کے حاکم ہو جانے پر اعتراض نہ کریں گے لیکن ہندستان کے شرفا ہرگز اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ اپنی ہی قوم کے نیچے طبقے کے لوگ ان پر حکومت کریں جن کی کہ اصلیت انہیں معلوم ہے۔

مسٹر بدرالدین طیب جی نے سرسید کو لکھا تھا کہ اگر مسلمان نمائندے کسی مسئلے پر کانگریس میں بحث کئے جانے کی مخالفت کریں گے تو کانگریس اس مسئلے کو ہاتھ میں نہ لے گی۔ سرسید احمد خاں نے جواب میں لکھ دیا کہ چونکہ کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے تو اس صورت میں کوئی بھی ایسا سیاسی مسئلہ نہیں ہو سکتا جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو ان حالات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مسٹر بیک نے سرسید احمد کو اچھی طرح بہکایا تھا، اور ان کے خیالات بدل دئے تھے۔ سر تھیوڈور مارسین (Sir Theodore Morrison) نے اگر اپنی علی گڈھ کالج کی تواریخ میں یہ لکھا ہے تو کیا تعجب ہے کہ سرسید کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سب مسلمانوں نے کانگریس سے قطع تعلق کر لیا اور اس بات کی مخالفت شروع کر دی کہ ہندستان میں نمائندہ جماعتوں کا قیام ہو۔ مارچ ۱۸۸۸ء میں سر آکلینڈ کالون (Sir Auckland Colvin) نے علی گڈھ کالج کا معائنہ کیا اور ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی اس میں کالج اور اس کے طلبہ کی ایسی پرجوش مدح سرائی کی کہ جیسی اب تک کسی نے نہ کی تھی۔ اس کے بعد اپریل میں سرسید احمد نے کانگریس کے خلاف اپنی دوسری تقریر میرٹھ میں کی۔ کانگریس کا ۱۸۸۸ء کا اجلاس الہ آباد میں ہونے والا تھا اور سر آکلینڈ کالون اور ان کی حکومت نے اس اجلاس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ پھر بھی ہو کر رہا۔ اتنے عرصے میں لارڈ ڈفرن بھی (Lord Dufferin) جنہوں نے کہ کانگریس کے قیام میں

مسٹر ہیوم کو مدد دی تھی کانگریس کے مخالف بن گئے تھے۔

اس درمیان میں گئو رکھشا کی تحریک چلی تھی، اور حکومت پرست مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر الہ آباد میں ایک جلسہ کیا جس میں نہ صرف گئو رکھشا تحریک کی مخالفت میں تجویز پاس کی گئی بلکہ مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کے خلاف بھی تجویز پاس ہوئی بعض لوگوں نے ایسے مسلمانوں کے خلاف جو کانگریس میں شریک ہوں فتویٰ شائع کر دیا۔ اس فتوے کے خلاف مولوی عبدالقادر لدھیانوی نے لدھیانہ، جالندھر، ہوشیار پور، کپور تھلہ، امرتسر، چھپرا، گجرات، جونپور، فیروز پور، قصور، منٹگمری، دہلی، رام پور، بریلی، مراد آباد، اور مدینہ منورہ اور بغداد کے علماء سے فتویٰ حاصل کر کے شائع کیا۔ جن علماء نے اس فتوے پر دستخط کئے تھے قریب قریب سب اس زمانے کے چوٹی کے علماء تھے۔ فتوے میں یہ مذکور تھا کہ دنیاوی معاملات میں مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگریس میں کام کریں۔ ان تمام حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف سرسید کی سی بڑی شخصیت کانگریس کی مخالف تھی وہاں بمبئی اور مدراس کے مسلمان مسٹر طیب جی اور علی محمد بھیم جی، اور رحمت اللہ سیانی کی سرکردگی میں کانگریس کے بھی حامی تھے۔ اور تمام مشہور علماء اسلام نے اس میں شرکت کو مسلمانوں کے لئے جائز قرار دے دیا تھا۔

اگست ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" (United Indian Patriotic Association) قائم ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوئے۔ اس انجمن کے مقاصد یہ تھے

(۱) پارلیمنٹ کے ممبروں اور انگلستان کے باشندوں کو اخبارات کے ذریعہ اس بات کی اطلاع دینا کہ ہندوستان کے تمام فرقے، شرفاء و امراء، اور راجا نواب کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں، نیز کانگریس کے شائع کردہ بیانات کی تردید کرنا۔

(۲) پارلیمنٹ اور باشندگانِ انگلستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُن انجمنوں

کی رائے سے باخبر رکھنا جو کانگریس کی مخالف تھیں۔

(۴) امن اور قانون کے برقرار رکھنے میں مدد دینا اور انگریزوں کی حکومت کو ہندستان میں تقویت پہنچانا اور کانگریس سے لوگوں کو علیحدہ کرنا۔ یہ تمام تجویز مسٹر بیک کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور ان کی اور سرسید کی سپردگی میں دے دی گئی تھی۔ اس انجمن کی ایک شاخ انگلستان میں مسٹر ماریسن کے مکان پر کھولی گئی جو مسٹر بیک کے انتقال پر علی گڑھ کالج کے پرنسپل بنے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ دیسی فرماں رواؤں کو انجمن کا مربی بنایا جائے۔ بہت سے ہندو اور مسلمان زمیندار اور بعض یوروپین اس انجمن میں شریک ہو گئے۔ راجا شیو پرشاد نے اودھ کے تعلقہ داروں کی انجمن میں تجویز پیش کی کہ ایک "انڈین لایل ایسوسی ایشن" (Indian Loyal Association) قائم کی جائے۔ اور "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کو اس کی شاخ بنا دیا جائے انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندستانی زبانوں میں ایسی تقریروں اور تحریروں کو روک دے جن سے خرابی پیدا ہونے کا اور بغاوت ہو جانے کا بہت بڑا اندیشہ ہو۔ مقصد اس تمام تگ و دو سے یہ تھا کہ کانگریس کو کسی طرح دبا دیا جائے حکومت کی اس تمام مخالفت، اور یونائیڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور راجا شیو پرشاد جیسے بزرگوں کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود الٰہ آباد کے کانگریس کے اجلاس میں ایک ہزار دو سو اڑتالیس نمایندوں نے شرکت کی درحالیکہ گذشتہ سال کے اجلاس میں شرکا کی تعداد صرف چھ سو سات تھی، اور پر لطف بات یہ تھی کہ اس اجلاس میں مسلمان نمایندوں نے یہ بتایا کہ ان کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ براہِ راست اس بات کا نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کے لیڈروں نے کانگریس کی مخالفت کی ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ الٰہ آباد کے کانگریس کے اجلاس میں جس کے خلاف اس قدر ہنگامہ بپا کیا گیا تھا صرف یہ تجاویز پاس کی گئی تھیں کہ شراب نوشی کا انسداد کیا جائے، تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے

دوامی تقرر مال گذاری کی توسیع کی جائے۔ اور نمک کا محصول موقوف کر دیا جائے۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں مسٹر براڈلا (Mr. Bradlaugh) نے پارلیمنٹ میں ایک تجویز پیش کی کہ ہندستان میں جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ مسٹر بیک نے اس کی مخالفت میں ایک محضر نامہ تیار کیا جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ جمہوری انتظامات ہندستان کے لئے غیر موزوں ہیں کیونکہ اس میں مختلف فرقے رہتے ہیں۔ انہوں نے اس محضر نامہ پر کالج کے طلبہ کی مدد سے بہت سے دستخط کرائے جو جتھے بنا بنا کر دستخط کرانے کے لئے مختلف مقامات پر بھیجے گئے تھے۔ اس قسم کا ایک جتھا خود مسٹر بیک کی سرکردگی میں دہلی گیا تھا۔ وہ خود جامع مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق طلبہ نے نماز کے لئے اندر جانے والے مسلمانوں سے یہ کہہ کر دستخط کرائے کہ ہندو گاؤکشی بند کرا رہے ہیں اور یہ عرضی اس لئے حکومت کو بھیجی جا رہی ہے کہ ان کی کوشش کارگر نہ ہو سکے۔ یہ بیان علی گڑھ کے کانفرنس گزٹ میں ولایت حسین صاحب کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ خیر کسی نہ کسی طرح بیس ہزار سات سو بینتیس دستخط اس طریقے پر کرا کے سنہ ۱۸۹۰ء میں وہ عرضی انگلستان بھیجی گئی تاکہ پارلیمنٹ میں پیش کی جا سکے۔"[۱]

"یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" مسلمانوں کے نام پر چند سال تک کانگریس کی مخالفت کرتی رہی لیکن سنہ ۱۸۹۳ء میں ایک نئی انجمن "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن" (Mohammadan Anglo Oriental Defence Association.) کے نام سے قائم کی گئی۔ اس انجمن کے مقاصد یہ تھے۔

(۱) مسلمانوں کے خیالات انگریزوں کے اور حکومت کے سامنے رکھنا اور ان کے

---

[۱] مولوی طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۳۱۱-۳۱۲

سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(ب) سیاسی تحریک کو مسلمانوں میں پھیلنے سے باز رکھنا۔

(ج) تمام ایسی تدابیر اختیار کرنا جن سے برطانوی حکومت کو استحکام پہنچے، اور امن و قانون کو قائم رکھنا اور لوگوں کے اندر وفادارانہ احساس پیدا کرنا۔ یہ بات واضح رہے کہ پہلے کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہندو مسلمانوں کی مشترکہ انجمن تھی۔ مسٹر بیک کو یہ بھی گوارا نہ ہو سکا کہ برطانوی حکومت کو تقویت دینے کے کام ہندو مسلمان مل کر کریں، اور اس لئے انہوں نے یہ ڈیفنس ایسوسی ایشن بنائی۔ جس میں کہ مسلمان دوسرے فرقوں سے علیحدہ کر لئے گئے لیکن رجعت پسند انگریزوں کے ساتھ ملا دئے گئے اور انجمن کا نام پھر بھی "ڈیفنس ایسوسی ایشن" رہا۔ یہ نام اس "اینگلو انڈین ڈیفنس ایسوسی ایشن" (Anglo-Indian Defence Association) سے لیا گیا تھا جو لارڈ رپن (Lord Rippen) کی مخالفت میں ۱۸۸۳ء میں قائم ہوئی تھی اور اپنا کام ختم کر کے ٹوٹ گئی تھی۔ مسٹر بیک اس نئی انجمن کے سکریٹری بنے۔

ایسوسی ایشن کے پہلے ہی اجلاس میں مسٹر بیک نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ اگرچہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے مسٹر براڈلا کے مسودۂ قانون کے خلاف عرضی پر دستخط کرانے میں کامیابی حاصل کی تھی، لیکن اس کے اندر دو نقص بہت ہی بڑے تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ انجمن تھی اور اس کے ساتھ بہت سی اور انجمنیں ملحق تھیں۔ دوسرے یہ کہ وہ کھلے اور عام اجلاس کیا کرتی تھی اور اس طرح عوام میں اس کی وجہ سے ہل چل مچ جاتی تھی۔ یہ ڈیفنس ایسوسی ایشن صرف مسلمانوں کی انجمن ہو گی جس میں ہندو شریک نہ ہو سکیں گے اور جو کھلے اجلاس کر کے عوام میں بے چینی پھیلنے کا باعث نہ بنے گی، اور نہ وہ اپنے ساتھ دوسری انجمنوں کا الحاق کرے گی۔

اس کی ایک مجلس منتظمہ ہوگی اور انجمن کے تمام کام اسی مجلس کے سپرد کر دئے جائیں گے اور عام ممبروں کے ہاتھوں میں نہ رکھے جائیں گے۔ مسٹر بیک کی اس تقریر کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔

"گذشتہ چند سال سے دو تحریکیں شروع ہوئی ہیں جو ملک کے اندر قوت پکڑتی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تو "نیشنل کانگریس" ہے اور دوسری گاؤکشی کی مخالفت کی تحریک ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی تو انگریزوں کے خلاف ہے؛ اور دوسری مسلمانوں کے خلاف۔ نیشنل کانگریس کا یہ مقصد ہے کہ انگریزوں کی حکومت کو جو سیاسی طاقت حاصل ہے وہ ہندوؤں کی بعض جماعتوں کو حاصل ہو جائے، حکمراں قوم کو کمزور کیا جائے، لوگوں کو ہتھیار مل جائیں فوج کی طاقت گھٹا دی جائے اور اس کا خرچ کم کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو ان مقاصد سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ گئو رکھشا کی تحریک کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکا جائے، اور انگریزوں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی خوراک کے لئے بھی گائیں ذبح نہ کرنے دی جائیں۔ گائے کا ذبیحہ روکنے کے لئے وہ اپنے مخالفین کا بائیکاٹ کرتے ہیں تاکہ انہیں بھوکا مار کر اطاعت پر مجبور کیا جا سکے۔ بمبئی اور اعظم گڈھ وغیرہ میں اس کی وجہ سے خونیں فسادات ہو چکے ہیں۔ ان دو تحریکوں کا نشانہ مسلمان اور انگریز بنا لئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اور انگریز دونوں ان کے خلاف متحد ہو جائیں، اور مل کر جمہوریت کے نظام کی مخالفت کریں جو کہ اس ملک کے لئے بالکل غیر موزوں ہے

اس لئے ہمیں سرکار سے وفاداری اور اتحادِ عمل کی تبلیغ برابر جاری رکھنی چاہیئے۔[۵]

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مسٹر بیک نے کس طرح ایک عرضداشت کوئی پانچ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں سے مسٹر براڈ لا کے مسودۂ قانون کی مخالفت میں بھجوائی تھی۔ اب انہوں نے مسلمانوں ہی سے دستخط کرا کے ایک عرضداشت اور بھجوائی جو سول سروس کے امتحانات ہندستان میں ہونے کے خلاف تھی۔ جب یہ خبر ملی کہ اس عرضی کی درخواست منظور کر لی گئی تو ڈیفنس ایسوسی ایشن نے شکریہ کا ایک ریزولیوشن پاس کیا اور اس میں یہ کہا کہ دونوں جگہ سول سروس کے امتحانات ہونے سے ہندستان کے اندر برطانوی حکومت کے قیام و استحکام کو نقصان پہنچے گا، اور حکومت کمزور ہو جائے گی، اور پھر جان اور مال کی حفاظت ناممکن ہو جائے گی جس پر کہ ہندستان کی اخلاقی اور مادی خوشحالی اور سرسبزی منحصر ہے۔

مسٹر بیک نے اپنی ترکیبوں سے اس بات کی بھی مخالفت کرائی کہ ہندستان میں مقابلے کے امتحانات کے ذریعہ ملازمتیں ملا کریں، اور یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان امتحانات میں کامیابی کی بجائے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری پر بھروسا کریں۔ ڈیفنس ایسوسی ایشن نے اپنا پروپیگنڈا انگلستان میں بھی جاری رکھا۔ جہاں مسٹر بیک نے خود ۱۸۹۵ء میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد ممکن ہے لیکن ہندو مسلمانوں کا اتحاد ممکن نہیں، اور یہ کہ ہندستان کے لئے پارلیمانی ادارے بالکل غیر موزوں ہیں۔ اگر ایسے ادارے قائم کئے گئے تو چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے وہ ہندوؤں سے مغلوب ہو جائیں گے جن کی کہ ملک میں اکثریت ہے۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے کبھی تو پیٹھ ٹھونک کر مسلمانوں کی ہمت افزائی کی تھی، اور کبھی انہیں یہ دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اطاعت سے سر پھرا

---

[۵] مولوی طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۲۱۵۔

اور ہندوؤں کی سی حرکتیں اختیار کرلیں تو ان کے حق میں نتیجہ خراب نکلے گا۔

اس زمانے میں برطانوی حکومت شمال مغربی سرحد پر اپنا قدم آگے بڑھانے کی
پر غور کر رہی تھی۔ اور فوجی اخراجات پر زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہتی تھی اور اسی کی کانگ
نے مخالفت کی تھی۔ مسٹر بیک نے اپنی ڈیفنس ایسوسی ایشن کی سالانہ رپورٹ میں ۹۶
میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت کے استحکام کے لیئے یہ ضروری تھا کہ بری اور بحر
دونوں قسم کی فوج کو قوی تر بنایا جائے، اور سر سید احمد نے خود اس مضمون کی ایک تج
ایسوسی ایشن میں پیش کی تھی کہ یہ ایسوسی ایشن ملک کے فوجی اخراجات میں تخفیف کرنے کے خلاف ہ
تجویز کو پیش کرتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ میری رائے میں گوروں کی فوج کی تعداد اس ملک
بہت تھوڑی ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ انہوں نے خود ایک موقع پر لارڈ ڈفرن سے کہا تھا کہ موجودہ فو
سرحد کی حفاظت کے لیئے کافی نہیں ہے۔[۵] اس کے بالمقابل کانگریس نے اس مضمون کی تجویز پاس
کہ کانگریس حکومت کی اس پالیسی کی مخالف ہے کہ سرحد میں قدم آگے بڑھایا جائے اور یہ مشو
کہ سرحدی قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کیئے جائیں اور سوات کی وادی کے متع
جو بیش قرار رقمیں صرف کی جا رہی ہیں وہ رد کی جائیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ کانگریس
سرحد پر اقدام کی پالیسی کی مخالفت کر رہی تھی جس کی وجہ سے سرحد کے باشندوں کی ہلاکت اور تباہی عمل میں آ رہی
جو کہ سب کے سب مسلمان تھے، اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن اس مقصد کے لیئے زیادہ فوج اور زیادہ روپے کا مطالب

یہ سب چیزیں ناممکن تھیں کہ بہت سے مسلمانوں کے دل میں ایک کریدنہ پیدا
"جو مختلف طاقتوں کے بیچ میں آ کر پسے جا رہے تھے۔ ایک طرف سر سید سے وفادار
خیالات کی طاقت تھی، اور دوسری طرف اپنے ہم مذہب مسلمانوں کے حقیقی معا
کے ساتھ وفاداری کا جذبہ تھا۔ اس حالت کا اندازہ نواب وقار الملک کی اس تحر

---

[۵] مولوی طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۳۳۰

ہوتا ہے جو انہوں نے چند روز بعد ۱۹۰۰ء میں لکھی تھی۔

"ان حالات کو دیکھ کر وہ لوگ بہت متفکر ہو گئے کہ جن کے دل میں اپنے فرقے کا درد تھا اور جا بجا باہم مشورے ہونے لگے۔ آخر کار کالج کے ٹرسٹیوں میں سے بعض لوگ سرسید کی تمام طاقت، اثر اور عظمت کے باوجود کہ جیسی عظمت اور جیسا اثر کہ اب مدتوں تک کسی شخص کو نہ حاصل ہوگا، اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں صرف اپنے فرقے کے مفاد کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، اور اس عظیم الشان لیڈر کا جو کچھ پاس و لحاظ ہے اسے بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ لاہور کے پیسہ اخبار میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کرایا جائے۔ یہ مضامین گمنام طور پر نہ بھیجے جائیں بلکہ ایسی شخصیتوں کے دستخط سے شائع کر دئے جائیں کہ جیسے نواب محسن الملک شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی، اور یہ احقر تھا۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون میں نے لکھا تھا اور لکھ کر نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولوی حالی صاحبان کے پاس بھیجدیا تھا کہ جو اس زمانے میں غالباً علی گڈھ میں قیام پذیر تھے، تاکہ وہ بھی اپنے دستخط کر دیں۔ ناگہاں مجھے سرسید کی وفات کی خبر ملی اور میں نے نواب محسن الملک کو فوراً تار دیا کہ وہ مضامین واپس بھیج دیں کیونکہ اب ان کی وفات کے بعد ہمارے دل میں ان کی جانب سے ان کی خوبیوں اور ان کی عظمت کے سوا اور کوئی خیال نہیں ہے چونکہ مضامین کے اس سلسلے کا خیال اس وقت ترک کر دیا گیا تھا، اور ان کے خلاف کوئی شکایت بھی اب زبانِ قلم پر نہ آسکتی تھی، اس لئے اتنے عرصہ کی کامل خاموشی کے بعد میں آج ان حالات کا انکشاف

محض کالج کی بہبود کے خیال سے کر رہا ہوں"۔[۵]

۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے بعد مسٹر بیک نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ بھی انتقال کر گئے۔

الہ آباد کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر آرتھر اسٹراجی نے ان کے انتقال پر یہ کہا تھا کہ وہ ان انگریزوں میں سے ایک تھے جو دنیا کے مختلف حصّوں میں برطانوی سلطنت کی تعمیر میں مصروف ہیں، اور وہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ایک سپاہی کی موت مرے۔

مسٹر بیک کے بعد مسٹر تھیوڈور ماریسن کالج کے پرنسپل ہوئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہی مسٹر ماریسن کے مکان پر انگلستان میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنائی گئی تھی، اور یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی کہ وہ مسٹر بیک کے جانشین ہوتے اور نہ صرف علی گڈھ کالج کی حیثیت سے بلکہ سیاسیات میں بھی ان کے نمائندہ کی حیثیت ان کی جگہ لیں۔ اس موقع پر بعض واقعات ایسے رونما ہوئے کہ جنہوں نے ہندوؤں سے مسلمانوں کی علیحدگی میں مدد دی جس کوشش میں کہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل لگے ہوئے تھے۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے ایک تجویز پیش کی جس کی وجہ سے صوبے میں اردو ناگری کی تحریک شروع ہوگئی۔ ہندوؤں نے حکومت کی اس تجویز کی تائید کی کہ عدالتوں کی کارروائی میں ناگری رسم الخط استعمال کیا جا سکتا ہے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ کئی سال سے ہندو اس بات کی تحریک کر رہے تھے کہ ناگری رسم الخط کی اجازت مل جائے لیکن سرسید کی

---

۵ وقار حیات کے صفحہ ۲۰۴ سے مولوی طفیل احمد صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۲۴ پر اقتباس کیا۔

مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہ ہوتی تھی۔ اسی ۱۹۰۰ء میں صوبے میں طاعون کی وبا پھیلی اور حکومت نے مریضوں کو علیحدہ رکھنے کی تدابیر پر عمل کیا جس کی وجہ سے بعض شہروں میں بلوے ہوگئے جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ اس قسم کا ایک بلوہ یکم اپریل ۱۹۰۰ء کو کانپور میں ہوا، اور اس کی وجہ سے حکومت کو سخت پریشانی اور دقت لاحق ہوئی، اور بس اس حادثے کے پندرہ ہی روز بعد ناگری رسم الخط کی عدالتوں اور سرکاری دفتروں کے لئے منظوری کی تجویز نافذ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ مئی ۱۹۰۰ء میں علی گڈھ میں نواب چھتاری کی صدارت میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا۔ نواب محسن الملک نے ایک زوردار تقریر کی اور ایک تجویز پاس کی گئی کہ جس میں حکومت سے اپنے اس ریزولیوشن کو واپس لینے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے جلسے کے صدر یعنی نواب چھتاری پر حکومت کا عتاب نازل ہوا اور انہوں نے صدارت سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد نواب محسن الملک اس کے صدر ہوئے اور انہوں نے اس کے متعلق کچھ تقریریں کیں۔ لفٹنٹ گورنر خود علی گڈھ گئے، کالج کے ٹرسٹیوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ نواب محسن الملک اپنے لئے دونوں عہدوں میں سے ایک پسند کرلیں، یا تو وہ اُردو کانفرنس کے صدر رہیں یا کالج کے سیکرٹری کا عہدہ قبول کرلیں، کیونکہ اگر وہ کالج کے سکرٹری رہے تو وہ کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے۔ نواب محسن الملک نے اس خیال سے کہ کالج کا کام زیادہ اہم ہے اردو کانفرنس کی صدارت ٹرسٹیوں کے زور دینے پر چھوڑ دی۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا کام یہ تھا کہ کانگریس کی مخالفت کریں اور ہندستان میں پارلیمنٹری حکومت کے رواج کی مخالفت کریں، اور سول سروس کے امتحانات ہندستان میں منعقد

ہونے کی مخالفت کریں، اور فوجی اخراجات کم کئے جانے کی مخالفت کریں اور نمک کے محصول کی موقوفی کے مخالفت کریں، اور قانون اسلحہ میں ترمیم کی مخالفت کریں اور اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کی مخالفت کیا کریں۔ لیکن ان تمام کاموں میں سے ایک بھی سیاسی نہیں خیال کیا جاتا تھا، اور ان سب کاموں کی اجازت صرف سرسیّد ہی کو نہ تھی بلکہ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک بھی یہی سب کچھ کرتے رہتے تھے، اور ان کاموں کی صرف اجازت ہی نہ تھی بلکہ ان کے چلانے کے لئے حکومت کی جانب سے ہمت افزائیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن نواب محسن الملک کو اتنی اجازت بھی نہ ملی کہ اردو کانفرنس کی صدارت کو بھی اپنی کالج کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت میں جاری رکھیں، اردو کانفرنس کا کام ایک سیاسی کام خیال کر لیا گیا تھا۔ اس کا سبب کسی بیان اور کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ سرسید اور مسٹر بیک کی کارگذاریاں حکومت کے حسبِ منشا اور حسبِ مراد تھیں، اور نواب محسن الملک کی کارگذاری اس طریقے پر اطمینان بخش نہ تھی۔

مسٹر مارِیسن نے اندازہ کیا کہ ناگری رسم الخط کے خلاف مسلمانوں میں جو تحریک پھیل گئی ہے اس کا دبانا ذرا دشوار ہوگا۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ ان کے لئے کسی قسم کی بھی سیاسی انجمن کو چلانا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے جمہوری طرز حکومت کے نقصان انہیں بتائے اور اپنے ایک خط میں جو کہ سنہ ۱۹۰۱ء کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شائع بھی ہوا تھا یہ لکھا کہ:۔

"جمہوری طرز حکومت کی بدولت اقلیت (مسلمان) کی حیثیت بالکل لکڑہاروں اور بہشتیوں کی سی رہ جائے گی"[۵]

انہوں نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ بھی مناسب نہیں

---

[۵] مولوی طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۳۴۹

کہ اپنی الگ ہی سیاسی انجمنیں بنائیں، کیونکہ ایسی انجمنوں میں بڑے آدمی تو حکومت کی ناراضی کے ڈر سے شریک ہوں گے نہیں اور اس سبب سے مسلمانوں کے اندر انتشار اور افتراق پھیل جائے گا۔ انہوں نے آخر میں کہا کہ۔

"اس لئے میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ سیاسی انجمن فائدے کی بجائے مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گی کیونکہ گذشتہ بیس پچیس سال سے حکومت ان کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کر رہی ہے۔ اگر کانگریس کے طرز پر انہوں نے بھی اپنی کوئی انجمن بنالی اور اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تو برطانوی پارلیمنٹ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے گی تو اس وقت مسلمانوں کو اتنے فائدے نہ پہنچیں گے جتنے کہ اس صورت میں پہنچ سکتے ہیں کہ وہ اپنی قسمت سر انتھنی میکڈونیل (Sir Anthony Macdonell) کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔"[۵۱]

انہوں نے یہ بھی کہا کہ سرکاری حکام اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے بھی سیاسی مطالبات کئے تو یہ ترجیحی برتاؤ بھی ختم ہو جائے گا انہوں نے یہ تجویز کی کہ مسلمان صرف اپنی ایک مشاورتی مجلس بنالیں جس کے دفتر میں قابل لوگ کام کریں، اور جس میں سیاسیات کی کتابیں موجود ہوں، اور اس مجلس کا کام صرف اتنا ہو کہ قانون ساز مجلس کے ممبروں کو مشورے دیا کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ بھی نصیحت کی کہ انہیں سیاسی مسائل کی بہ نسبت مالی اور اقتصادی مسائل کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیئے۔

اس تجویز پر بھی کبھی عمل نہ ہوا کیونکہ ضروری سرمایہ مہیا نہ کیا جا سکا اور مسلمانوں

---

۵۱ مولوی طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۳۵۰۔

کی تمام سیاسی تحریک مولوی طفیل احمد صاحب کے الفاظ میں کم سے کم کچھ دنوں کے لئے تو زیر زمین دفن کر دی گئی۔

حکومت نے اس پر تو اعتراض کیا تھا کہ کالج کا سیکرٹری ناگری اردو کے قضئے میں حصہ لے کیوں کہ وہ ایک سیاسی تحریک تھی، لیکن حکومت نے کالج کے طلبہ سے سیاسی خدمات لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اس زمانے میں روس اور انگلستان ایران کے معاملے میں باہم رقیب ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ایران پر دونوں کا دانت تھا اور دونوں ایران کی دوستی کے طالب تھے۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے سوچا کہ ایران کے کچھ نوجوانوں کو لا کر علی گڈھ کالج میں تعلیم دینا مفید ثابت ہوگا۔ مسٹر ماریسن نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک وفد ایران بھیجا جائے۔ جب نواب محسن الملک نے یہ اعتراض اٹھایا کہ کالج کے روپے سے اس وفد کا خرچ برداشت نہ کرنا چاہیئے تو مسٹر ماریسن نے اپنے پنجے ذرا سخت کر دئے اور انہیں دبنا پڑا۔ وفد ایران بھیجا گیا، اور شریف خاندانوں کے کچھ لڑکوں کو اس ملک سے لا کر علی گڈھ کالج کے طالب علموں میں داخل کر دیا گیا۔

سارے مسلمان اس بات کے لئے تیار نہ تھے کہ مسٹر ماریسن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں چنانچہ ۱۹۰۱ء میں نواب محسن الملک نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام محمڈن پولیٹیکل آرگنائیزیشن" (Mohammadan Political Organization) رکھا، اور اس کی کامیابی کے لئے سخت کوشش کی۔ اس انجمن کے مقاصد بالکل معتدل تھے لیکن اس کی کامیابی کی بھی کوششیں بارآور نہ ہوئیں کیوں کہ حکومت کے افسر اس سے کھٹکے ہوئے تھے۔ جس وقت تک خود حکومت کو اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اس وقت تک کسی طرح یہ ممکن نہ ہوا کہ مسلمانوں کی کوئی سیاسی انجمن بنے اور کامیابی

کے ساتھ چلائی جا سکے جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

(۱۱) جُداگانہ حلقۂ اِنتخاب کی ابتدا

بنگال وہ صوبہ تھا کہ جہاں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی۔ انگریزی تعلیم بھی اسی صوبے میں سب سے پہلے رواج پذیر ہوئی بنگال کے ہندوؤں نے فوراً اس سے نفع اٹھانا شروع کر دیا۔ مسلمان اس پالیسی کے زیرِ اثر جو کہ حکومت کی مسلمانوں کے متعلق اس زمانے میں تھی تعلیم سے پیچھے ہٹا دیئے گئے ہندوؤں نے حکومت کے اعلیٰ عہدے بھی ہر محکمے میں حاصل کیے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر بڑے بڑے مصلح، قانون داں، ماہرینِ طب " سائنس داں، مقرر، ادیب، اور اس قسم کے لوگ کہ جنہوں نے انگریزی ادب میں بڑی گہرائی تک غوطہ لگایا تھا پیدا ہوتے رہے جن کے دلوں میں برطانوی اداروں کی بالخصوص برطانیہ کے دستور اساسی کی بڑی وقعت تھی۔ ان لوگوں سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ انگریزی ملازمت کی سیڑھی کے نیچے کے ڈنڈوں پر پڑے رہنے سے مطمئن ہو جائیں گے۔ ان میں سے بہت سوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہندستان میں بھی برطانیہ کے نمونے پر ترقی پسند ادارے قائم کیے جائیں۔ انہوں نے اپنے اہلِ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں بہت کچھ بیداری پھیلائی اور انڈین نیشنل کانگریس بھی انہی کی کوششوں سے وجود میں آئی جس کے پہلے اجلاس کے صدر ایک بنگالی مسٹر ڈبلیو، سی، بنرجی ہی تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ تمام ترقی پسند آدمیوں کی نظروں میں ان کی عزت و وقعت قائم ہو جاتی، اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ سرسید بھی ایسے

لوگوں میں سے ایک تھے۔ لیکن اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر وہ انگریزی حکام کی نگاہوں میں مشتبہ ہو گئے جنہوں نے اپنی نفرت یا خوف کو جو بنگالیوں کی طرف سے ان کے دل میں پیدا ہو گیا تھا چھپانے کی بھی کوشش نہ کی۔ اپنی قابلیت، اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں انہماک کی بدولت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر انیتھنی میکڈونیل کو بھی انہوں نے اپنا مداح بنا لیا تھا جو ان کے اس کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے جو انہوں نے کلکتہ کی میونسپل کمیٹی میں میونسپل کمشنر کی حیثیت میں کیا تھا۔ لارڈ کرزن کی تحکم پسند شخصیت سے کیسے توقع ہو سکتی تھی کہ وہ بنگالیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکیں گے اس لئے انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ کلکتہ کی میونسپلٹی پر حملہ کر کے اس میں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد گھٹا دی۔ میونسپلٹی کا چیرمین بھی سرکاری افسر کو مقرر کر دیا گیا اور اس طرح میونسپلٹی سرکاری قبضہ اور اقتدار میں آ گئی۔ کلکتہ اگر ہندستان بھر کا نہیں تو کم سے کم شمالی اور مشرقی ہندستان کا تو سب سے بڑا شہر ضرور تھا اس لئے اس حملے سے ناراضی پھیلی۔ اس چیز نے لارڈ کرزن کو اور بھی برافروختہ کر دیا۔ اور دسمبر ۱۹۰۳ء میں انہوں نے ایک ایسی تجویز کی جھلکی دکھائی کہ جس کا مقصد چاٹگام اور ڈھاکہ کو بنگال سے الگ کر کے آسام کے دامن سے وابستہ کرنا تھا۔ اس کے خلاف سخت جوش پھیل گیا۔ حتیٰ کہ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں نے بھی اسے "وحشیانہ انتظام" کا لقب دیا۔ لارڈ کرزن نے ہندستان کی عام رائے سے ایک لڑائی مول لے لی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں انہوں نے جو ایڈریس پڑھا اس میں یہ کہہ گذرے کہ مشرقی لوگ عام طور پر سچائی کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ اس تقریر کے خلاف صدائے احتجاج ہر طرف سے بلند ہوئی۔ اس مسلسل احتجاج نے لارڈ کرزن کو بالکل ہی مشتعل کر دیا۔ وہ ڈھاکہ گئے اور وہاں مسلمانوں سے کہا کہ بنگالے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے جہاں یہ مقصود تھا کہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر پر

کام کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے جنہیں پورے صوبۂ بنگال کا تقسیم سے پہلے انتظام کرنا پڑتا تھا وہاں دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا صوبہ پیدا کر دیا جائے کہ جس میں ان کی آواز سب پر غالب ہو۔ اس تقریر سے بہت سے مسلمان پھسل گئے۔ خود نواب سلیم اللہ جو اس سے پیشتر تقسیم کے مخالف تھے۔ اب اسی تقسیم کے پرجوش حامی بن گئے لیکن ان کے بھائی خواجہ عتیق اللہ نے اپنے خیالات نہ بدلے اور برابر تقسیم کی مخالفت ہی کرتے رہے۔ مسٹر گرمکھ نہال سنگھ نے لکھا ہے کہ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ کی حمایت ان کو ایک لاکھ پونڈ کا قرضہ بہت معمولی سے سود پر دے کر حاصل کی گئی تھی۔[1]

تمام ہندوؤں اور بہت سے مسلمانوں کی جو مسٹر اے رسول اور خواجہ عتیق اللہ کی قیادت میں تھے، مخالفت کے باوجود بنگال کے دو حصے کر دئے گئے۔ سر ہنری کاٹن (Sir Henry Cotton) کے بقول "ان تدابیر کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے اندر جو اتحاد موجود ہے اسے بکھیر دیا جائے، اور اتحاد کا جو احساس پیدا ہو گیا ہے وہ زائل ہو جائے لارڈ کرزن کی یہ کوئی انتظامی تدبیر نہ تھی۔ یہ صرف لارڈ کرزن کی اس حکمت عملی کا ایک نمونہ تھی جو انہوں نے بڑھتی ہوئی طاقتوں کو کمزور کرنے اور اس سیاسی رجحان کو تباہ کرنے کے لئے اختیار کی تھی جو حب وطن کی جانب میلان رکھتا ہو۔" اخبار "اسٹیٹس مین" نے اس مقصد کو ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ "مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی ایک ایسی طاقت کی پرورش

---

[1] گرمکھ نہال سنگھ کی کتاب "لینڈ مارکس ان انڈین کانسٹی ٹیوشنل اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ" Land Marks in Indian Constitutional & National Developement صفحہ ۳۱۹

کی جائے جو امید ہی کہ ہندو فرقے کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکے گی۔[۵]"

لارڈ کرزن نے اپنے ورثے میں تقسیم بنگال کا سخت مختلف فیہ مسئلہ چھوڑا تھا جس میں کہ بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں کے آدمی بھی شریک ہو گئے! اکثر یہی دیکھا گیا ہی کہ چھوٹے دل کے آدمی جب کوئی ترکیب سوچتے ہیں تو الٹی پڑتی ہے یہی صورت ہندستان میں بھی رونما ہوئی - جو تدبیر سیاسی زندگی کو دبا دینے کے لئے اختراع کی گئی تھی اسی نے جادو کا سا کام کر دیا۔ تقسیم بنگال کے خلاف پورا ملک اس طرح متحد ہو گیا کہ جیسا ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک کبھی نہ ہوا تھا۔

جب لارڈ منٹو وائسرائے ہو کر لارڈ کرزن کے بعد ۱۹۰۵ء میں ہندستان آئے تو انہیں سخت مشکل صورت حالات سے سابقہ پڑا، اور اس عہدے پر متمکن ہونے کے چند ہی روز بعد انہوں نے مسٹر جان مارلے (Mr. John Morley) کو لکھا:-

"کانگریس کے متعلق .... ہمیں ان کا اثر اور ان کا وجود تسلیم کر کے ان کے بہترین آدمیوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لینے چاہئیں لیکن پھر بھی مجھے اندیشہ ہی کہ اس تحریک میں غیر وفادارانہ عنصر بہت زیادہ ہی اور مستقبل کے متعلق ان سے خطرہ ہی ہے .... میں نے ادھر کچھ عرصے سے برابر ایسی تدابیر پر غور کیا ہی کہ کانگریس کے جو مقاصد ہیں ان کے خلاف کوئی چیز کھڑی کی جا سکے

---

[۵] "انڈیا ان ٹرانزیشن" (India in Transition) سے مہتہ اور پٹوردھن نے اپنی کتاب "کمیونل ٹرائی انگل" (Communal Triangle) میں نقل کیا صفحہ ۷۰۔

میرا خیال ہے کہ دیسی فرمانرواؤں کی ایک مجلس بنا دینے سے کام چل سکے گا، یا اسی خیال کی تکمیل کے طور پر ایک پریوی کونسل بنائی جائے کہ جس میں دیسی فرمانرواؤں کے علاوہ چند بڑے بڑے آدمی بھی شامل ہوں اور اس کا اجلاس ہر سال ایک ہفتہ یا دو ہفتوں کے لئے دہلی میں ہوا کرے۔ ان اجلاسوں میں زیر بحث آنے کے لئے مضامین کا انتخاب بہت احتیاط کے ساتھ عمل میں آیا کرے، لیکن ہم کانگریس سے مختلف خیالات ایسے لوگوں کے منہ سے نکلوا دیا کریں۔ جنہیں ہندستان میں ایک اچھی حکومت کے قیام سے دلچسپی ہے۔"......[1]

مسٹر مارلے نے اگلی جون کی چھٹی تاریخ کو لارڈ منٹو کو لکھا۔

"ہر شخص ہمیں ایسی بات سے متنبہ کر رہا ہے کہ ہندستان میں ایک نئی روح پیدا ہو رہی ہے اور پھیلتی جا رہی ہے۔ لارنس، چیرول، سڈنی، اور تو سب کے سب یہی راگ الاپ رہے ہیں۔ تم انہی اصولوں پر قائم رہ کر ہمیشہ حکومت نہیں کر سکتے، تمہیں کانگریس کی جماعت اور کانگریس کے اصولوں سے مقابلہ کرنا ہی پڑے گا خواہ ان کے متعلق تمہارے خیالات کچھ بھی ہوں۔ تم یقین رکھو کہ اب بہت دن گذرنے سے پہلے ہی مسلمان بھی تمہارے خلاف کانگریسیوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور پھر اور لوگ اور پھر اور لوگ۔[2]

---

[1] لیڈی منٹو کی کتاب "انڈیا منٹو اینڈ مارلے" (India Minto and Morley) صفحہ ۲۸، ۲۹۔ [2] اسی کتاب کا صفحہ ۳۰

"دیسی فرماں رواؤں کی ایک مجلس کو کانگریس کا مد مقابل بلکہ ہر ایک قومی تحریک کا مد مقابل بنا کر کھڑا کرنے کا خیال اس وقت پھل نہ دے سکا۔ لیکن ایک دوسری اور اس سے زیادہ موثر تدبیر اختراع کرلی گئی۔ لارڈ منٹو نے فوراً اپنی مجلس مشاورتی کی مدد سے اصلاحات کی ایک تجویز بنانی شروع کر دی ایسی کہ جس سے انہیں امید تھی کہ کم سے کم ان ہندستانیوں کو مطمئن کر دے گی جو اعتدال پسند ہیں۔ اسی سلسلے میں جہاں ایک طرف یہ اسکیم بن رہی تھی وہیں دوسری طرف یہ کوشش بھی کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کو کانگریس کے آغوش سے چھین لیا جائے۔ مولوی طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ

"۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس علی گڈھ نے جو ان دنوں نینی تال پر تھے اور حکومت کے ارکان سے قریب تر ایک مسودہ عرضداشت اس مضمون کا نواب محسن الملک بہادر کے پاس کہ جو علی گڈھ کالج کے سیکرٹری تھے بھیجا کہ مسلمانوں کو بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ اور اس چیز کی طرف عام طور پر سب تعلیم یافتہ مسلمان متوجہ ہو گئے۔ اس زمانے میں مسٹر آرچ بولڈ (Mr. Archbold) یعنی کالج کے پرنسپل گرمیوں کی بڑی تعطیل میں شملہ گئے ہوئے تھے۔ اور اس طرح وہاں ارباب حکومت کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع حاصل تھا۔ انہوں نے وائسرائے کے سیکرٹری سے ایک مجوزہ وفد کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ مسٹر آرچ بولڈ نے جو خط ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو اپنی گفتگوؤں کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کے پاس بھیجا وہ چھپوا کر وفد کے تمام ممبروں کے پاس بھیجا گیا۔ اس خط سے جس کی نقل ذیل میں دی جاتی ہے یہ بات

اچھی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ علی گڈھ کالج کے پرنسپل کس طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی تفصیلات تیار کیا کرتے تھے، اور کس طرح انہوں نے علی گڈھ میں حکومت کے ایک نائب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ خط کا خلاصہ حسب ذیل ہے جس کا ایک ایک لفظ اس کا مستحق ہے کہ پورے غور سے اس کا مطالعہ کیا جائے:-

کرنل ڈنلپ اسمتھ (وائسرائے کے سکرٹری) نے مجھے (مسٹر آرچ بولڈ) کو اطلاع دی ہے کہ وائسرائے مسلمانوں کے وفد سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہیں اور مجھے ہدایت کی ہے کہ اس کے متعلق ایک رسمی درخواست ان کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور قابل لحاظ ہیں:-

"سب سے پہلا مسئلہ درخواست بھیجنے کا ہے۔ میرے خیال میں یہ کافی ہوگا کہ مسلمانوں کے بعض لیڈر اگرچہ وہ منتخب نہ بھی کئے گئے ہوں اس عرضی پر اپنے دستخط کردیں۔ اب دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ وفد کے ارکان کون لوگ ہوں۔ یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ سب صوبوں کی نمائندگی ہوجائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس سپاسنامے میں لکھا کیا جائے جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے اظہار وفاداری کیا جائے، اور حکومت کا شکریہ ادا کیا جائے کہ وہ ایک طے شدہ تجویز کے مطابق ہندستان کو حکومت خوداختیاری دینے کی طرف قدم اٹھانے والی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہندستانیوں کے لئے حکومت کے عہدے حاصل کرنے کے لئے دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن اس شکریے کے ساتھ ساتھ اس اندیشے اور خوف کا اظہار

بھی ہو کہ انتخابات کے طریقے کو رواج دینے سے مسلمان اقلیت کو نقصان پہنچ جائے گا۔ اور یہ توقع بھی ظاہر کی جائے کہ نامزدگی کے طریقے کو رائج کرکے یا مذہبی بنیاد پر نمایندگی کے حقوق دے کر حکومت ضرور مسلمانوں کی رائے کو بھی جائز وقعت دے دیگی۔ اس رائے کا اظہار بھی سپاسنامے میں ضروری ہی کہ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندستان ہی زمینداروں کی رائے کو کافی اہمیت دینا ضروری ہی۔"

"میری (مسٹر آرچ بولڈ کی) ذاتی رائے یہ ہی کہ مسلمانوں کے لئے سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ وہ نامزدگی کے طریقے کی حمایت کریں کیوں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہی کہ انتخابات کے طریقے کو رواج دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے یہ بھی بہت مشکل بات ہوگی کہ اگر انتخابات کا طریقہ رائج کر دیا گیا تو انھیں ان کا جائز حصہ مل سکے۔"

"لیکن ان تمام کارروائیوں میں میں پسِ پردہ رہنا چاہتا ہوں اور اس کی تحریک بظاہر آپ ہی کی طرف سے عمل میں آنی چاہیئے۔ آپ کو تو یہ معلوم ہی کہ میں مسلمانوں کا کس قدر بہی خواہ ہوں اور اس لئے میں ہر ممکن مدد بڑی خوشی کے ساتھ دوں گا۔ میں آپ کے لئے سپاسنامہ بھی لکھ کر مرتب کر سکتا ہوں۔ اگر وہ بمبئی میں تیار کیا جائے تو میں اس پر نظر ثانی کر لوں گا کیونکہ میں اچھے الفاظ میں عرضیاں لکھنا خوب جانتا ہوں۔ لیکن نواب صاحب اس بات کو اچھی طرح یاد رکھیئے کہ اگر تھوڑے عرصہ میں کوئی بڑا اور موثر کام کرنا ہی تو فوراً کام شروع کر دینا چاہیے۔"[۵۱]

---

۵۱ مولوی طفیل احمد کی کتاب "روشن مستقبل" صفحہ ۳۶۰-۳۶۱۔

اس ہدایت نامہ کے مطابق نواب محسن الملک مرحوم نے لیڈی منٹو کے الفاظ میں مسلمانوں کا وفد گھڑا" سپاسنامہ تیار ہوا اور مسلمانوں کا ایک وفد ہز ہائی نس آغا خاں کی سرکردگی میں وائسرائے کی خدمت میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو حاضر ہوا۔ لیڈی منٹو نے اپنے اس تاریخ کے روزنامچے میں لکھا ہے:-

"آج کا دن بہت ہی معرکہ خیز ہے بقول کسی شخص کے ہندستان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور ہر طبقے اور ہر ملت کے لوگ غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ مسلمان آبادی جس کا شمار چھ کروڑ بیس لاکھ ہے اور جو بہت ہی وفادار ہے اس بات پر ناراض ہے کہ مسلمانوں کو ان کے حق سے کم نمائندگی ملی ہے، اور اس کا خیال ہے کہ ہندوؤں کو ترجیح دے کر مسلمانوں کی بہت سی باتوں میں توہین کی گئی ہے۔ تحریک چلانے والوں نے اس احساس کو کوشش کرکے ترقی دی ہے اور اس بڑے زبردست فرقے کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں۔ نئی نسل ڈانواڈول ہو رہی تھی اور کانگریس کے انقلاب پسندوں کے ساتھ مل جانے پر آمادہ۔ ہر طرف سے یہ آوازیں آرہی تھیں کہ حکومت کے وفادار مسلمانوں کی حمایت نہ کی جائے اور یہ کہ ہم اپنے مطالبات بے چینی پھیلا کر خود منوالیں گے مسلمانوں نے کچھ اور کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے کے سامنے ایک عرضداشت پیش کریں کہ جس میں اپنی شکایات کا اظہار ہو۔ یہ ملاقات آج کے دن طے پائی تھی اور ہندستان کے مختلف

۵ا؎ منٹو صفحہ ۵۶۔

حصّوں سے تقریباً ستر نمائندے وائسرائے سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ رسم ناچ کے کمرے میں عمل میں آئی۔ لڑکیاں اور میں ایک بغل کے دروازے سے کارروائی سننے کے لئے گئیں، اور منٹو اپنے عملے کی ہمراہی میں کمرے کے دروازے سے اندر آئے اور ڈائس پر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ آغاخاں مسلمان خوجہ فرقے کے سرگروہ ہیں۔ وہ علی کی اولاد ہیں اور مذہبی حقوق کی بنا پر اپنے فرقے کے حکمراں ہیں لیکن بادشاہِ بے اقلیم۔ ہز ہائی نیس سپاسنامہ پڑھنے کے لئے منتخب ہوئے کہ جو بہت طویل لیکن نہایت اچھا تھا اور اس میں مسلمانوں کی شکایت اور ان کی خواہشات کا ذکر تھا۔ اس کے بعد منٹو نے اپنا ایڈریس جواب میں پڑھا جو کہ انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد تیار کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے یہ کہنے کے لئے معافی طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یورپ کے طرز کے نمائندہ حکومت کے ادارے ہندستان کے باشندوں کے لئے بالکل ایک نئی چیز ہیں یا یہ کہ ہندستان میں ان کی ترویج کے لئے بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں اس چیز سے بہت دور رہنا چاہتا ہوں کہ مغربی دنیا کے تمام سیاسی کل پرزوں کو مشرقی نسلوں کے رسم و رواج پر غلبہ پانے کو پسند کروں......... آپ کے سپاسنامے کا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب ہے کہ نمائندگی کے ہر طرز میں خواہ وہ میونسپلٹی کے لئے ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے لئے یا قانون ساز مجلس کے لئے غرضیکہ جس ادارے میں بھی انتخابات کے ذریعہ نمائندگی کا طریقہ رائج کیا جائے یا موجودہ نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تو

مسلمانوں کے فرقے کی نمایندگی کے لئے ان کو فرقہ ہی انتخابات عمل میں لائے آپ نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہو کہ موجودہ مشترک صورت میں اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حلقہ ہائے انتخاب ایک مسلمان امیدوار کو منتخب کریں۔ انیز یہ کہ اگر کبھی ایسا ہو بھی تو اس امیدوار کو اکثریت کے طبقے کی رایوں کے لئے کہ جو اقلیت کی مخالفت میں ہوں گی اپنی رایوں کو قربان کرنا پڑے گا، اور وہ اپنے فرقے کی نمایندگی نہ کر سکے گا اور آپ نے یہ بھی دعویٰ پیش کیا ہو اور بجا طور پر پیش کیا ہو کہ آپ کی حیثیت کا اندازہ آپ کی مردم شماری سے نہ لگایا جانا چاہیئے بلکہ آپ کی فرقے کی سیاسی اہمیت سے، اور ان خدمات سے لگایا جانا چاہیئے جو آپ کے فرقے نے سلطنت کے لئے انجام دی ہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ کامل اتفاق رائے ہو۔۔۔۔۔۔ میرے خیال میں جس طرح آپ کو یقین ہو مجھے بھی اس بات کا یقین کامل ہو کہ اگر ہندستان میں کوئی ایسا طریقہ رائج کیا گیا کہ جس میں انتخابات کے ذریعہ سے نمایندے چنے جائیں اور حق رائے دہی اشخاص کو حاصل ہو اور اس برّ اعظم پر بسنے والے فرقوں کے رسم و رواج اور مذہبی معتقدات کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے تو ایسے طریقے کا انجام یقینی طور پر مضرت رساں ناکامیابی ہوگی۔" [۱]

اسی تاریخ میں لیڈی منٹو نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہو کہ "آج شام کو مجھے ایک سرکاری افسر کا حسبِ ذیل خط ملا ہو"، میں

---

[۱] "منٹو" صفحہ ۴۵ - ۴۷ -

یور ایکسی لینسی کو ایک سطر میں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آج کے دن ایک بہت بڑا کار نمایاں انجام کو پہنچا ہی۔ آج سیاسی تدبیر کا ایک ایسا کارنامہ وقوع میں آیا ہی جو ہندستان اور ہندستان کی تاریخ پر بہت برسوں تک اثر انداز ہوگا۔ وہ کارنامہ یہ ہی کہ آج چھ کروڑ بیس لاکھ آدمیوں کو باغیوں کی صفوں میں جا ملنے سے روک کیا گیا ہی"

وہائٹ ہال (انگلستان کی پارلیمنٹ کا ایوان) میں بھی اسے تقریباً اسی نظر سے دیکھا گیا۔ مسٹر مورے کو جب ان کارروائیوں کی روداد ملی تو انہوں نے لکھا۔

من جانب مورلے بنام منٹو - ۲۶ اکتوبر- تم نے اپنے مسلمانوں کی بابت جو کچھ لکھا ہی وہ بہت دلچسپ ہی۔ اور مجھے سخت افسوس ہی کہ میں کیوں تمھاری اس دعوت میں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر شریک نہ ہو سکا۔ تمام کارروائی ایسی خوب صورتی سے عمل میں آئی کہ اس سے بہتر صورت ہو ہی نہیں سکتی اور اس واقعہ نے تمہارے مرتبے اور تمہارے ذاتی اختیارات پر صحیح معنوں میں تصدیق کی مہر لگادی ہے۔ تمہاری اس کارروائی کا ایک اور اچھا اثر یہ بھی ہوا ہی کہ اس نے یہاں نکتہ چیں جماعت کی تمام تجویزوں کو پورے طور پر درہم برہم کر دیا، یعنی اب وہ یہ چیز پیش کرنے سے روک دیئے گئے ہیں کہ بس ہندستانی حکومت ایک دفتری حکومت ہی جو جمہور کا مقابلہ کر رہی ہی۔ مجھے امید ہی کہ اب ہمارے سب سے بڑے حامیانِ آزادی کو بھی یہ بات نظر آجائے گی کہ معاملات اس قدر آسان اور سہل نہیں ہیں[۵]"۔

"بوکن" (Buchan) جس نے لارڈ منٹو کی سوانح عمری لکھی ہے رقم طراز ہے کہ

"اس تقریر نے بلا شک و شبہ یہ اثر کیا کہ باغیوں کی فوج کو مسلمانوں کی جماعت میں سے رنگروٹ نہ مل سکے اور مصیبت کے دن جو کہ اب آنے والا ہی یہ واقعہ ایک بہت ہی بڑی مدد ثابت ہوگا۔"[۵] اس نے اس تقریر کا نام "چارٹ آف اسلامک رائٹس" (Chart of Islamic Rights.) رکھا ہی۔

مولوی طفیل احمد لکھتے ہیں کہ ایسے انتظامات کر دئے گئے تھے کہ انگلستان میں اس واقعہ کی خوب اچھی طرح اشاعت ہو۔ وائسرائے سے مسلمانوں کا وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملا تھا اور لندن ٹائمس میں اسی تاریخ میں ایک لمبا چوڑا مضمون نکلا جس میں مسلمانوں کی عقلمندی کی تعریف کی گئی ہے۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلمان تو کسی وقت میں بھی جمہوریت کے دلدادہ نہ تھے جو یورپ کے طرز کی ہو، اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندستان کے اندر انگلستان کے نمونے پر کوئی ایک متحدہ قوم بھی نہیں تھی، اور پھر ہندستان میں بہت سے مختلف مذہبوں کی موجودگی کا ذکر بھی آگیا تھا وغیرہ دوسرے اخبارات نے بھی اسی قسم کے مضامین شائع کئے"۔ ان اخبارات کے ان مضمونوں سے ظاہر ہوتا ہی کہ انگلستان کے اخباروں کی نگاہ میں ہندستان کے اندر متحدہ قومیت کی موجودگی کس قدر خطرناک اور تکلیف دہ تھی۔ اور وہ یہ دیکھ کر کس قدر خوش ہو گئے کہ وہ اتحاد ٹوٹ گیا، اور وہ اپنی اس عیاری پر کس درجہ نازاں تھے کہ انھوں نے ہندستان کے دو فرقوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور مذہب

۵۔ "بوکن" کی کتاب "لارڈ منٹو" صفحہ ۲۴۴ سے جی این سنگھ نے اقتباس کیا۔

کی بنا پر دونوں میں مدتوں قائم رہنے والی دشمنی پیدا کرادی تھی[5]" اس اسکیم کے مکمل ہونے میں بہت عرصہ لگا اور وائسرائے اور وزیر ہند کے درمیان مدتوں خط وکتابت رہی تب آخر کار اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی رسم قائم ہوگئی۔

(۱۲) مُسلم لیگ کی بُنیاد پڑی مِیثاقِ لکھنؤ

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد مسلمانوں کے وفد کے وائسرائے سے ملنے کے فوراً بعد ہی پڑی۔ ۹ ر نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب سمیع اللہ نے ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں کہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک انجمن "آل انڈیا مسلم کنفیڈریسی (All India Muslim Confederacy) قائم کی جائے" اور آخر کار اگلے دسمبر کے مہینے میں ڈھاکے میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تمام ہندستان سے نمائندے آکر شریک ہوئے۔ نواب وقار الملک نے صدارت کی اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوگئی۔ نواب وقار الملک کو سیکرٹری بنایا گیا اور نواب محسن الملک جوائینٹ سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن افسوس کہ موخرالذکر کا چند ہی روز بعد انتقال ہوگیا۔ ایک ریزولیوشن میں تقسیم بنگال کی حمایت کی گئی اور بائیکاٹ کی تحریک کی مذمت کی گئی۔ لیگ کے قیام پر "ٹائمس آف لندن" نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی سال میں ہندو مہا سبھا کی بھی بنیاد پڑی تھی۔ مسٹر ریمزے میکڈونلڈ (Ramsey Macdonald) نے "اویکنگ آف انڈیا" (Awaken-ing of India) میں سرکاری حکام کی کارگزاریوں کا ذکر ان

الفاظ میں کیا ہے۔

"مسلمان لیڈروں کو بعض ہندستان کے انگریز افسروں سے ہدایت ملتی ہیں اور انہی افسروں نے شملہ اور لندن میں تار کھینچے اور پیشتر سے سوچی ہوئی شرارت کے مطابق ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نا اتفاقی کا بیج مسلمانوں کے ساتھ رعایت آمیز برتاؤ کرکے بو دیا[۵]۔ جداگانہ انتخابات کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلا ہے کہ درمیان میں ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ خلیج برابر چوڑی ہوتی جارہی ہے۔"

مسلم لیگ نے ہر سال اپنے اجلاس کرنا شروع کردئے اور ان میں تقسیم بنگال کی حمایت میں، اور نہ صرف قانون ساز مجالس کے لئے بلکہ مقامی حکومت کی مجلسوں کے لئے بھی جداگانہ انتخابات کے رواج کے حق میں ریزولیوشن پاس کرتی رہی، اور حکومت کی ملازمتوں اور پریوی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کا مطالبہ کرتی رہی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اس کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا اس کے صدر ہز ہائی نیس آغا خان تھے اور اس اجلاس میں انہوں نے ان اصلاحات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کیا جو حکومت کی جانب سے ملی تھیں اور لوگوں کو متنبہ کیا کہ ان کی مخالفت ہرگز نہ کریں مبادا کہ حکومت انہیں واپس لے لے۔ ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے حکومت کی پالیسی پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ پیچھے ذکر ہو چکا ہے کہ سر انتھنی میکڈونیل کے زمانے میں نواب محسن الملک نے کہ جو ان دنوں علی گڈھ کالج کے سیکرٹری تھے ہندی اردو کے جھگڑے میں نمایاں حصہ لیا تھا تو اس پر لفٹننٹ گورنر کا عتاب ان پر نازل ہوا تھا اور انہیں انجمن حمایت اردو

۵؎ مہتہ اور پٹوردھن نے "دی کمیونل ٹرائی اینگل" (The Communal Triangle) کے صفحہ ۶۶ پر حوالہ دیا ہے۔

کی صدارت سے اس بنا پر مستعفی ہونا پڑا تھا کہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری کے لئے یہ جائز
نہیں ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ لفٹننٹ گورنر اپنے جذبۂ انتقام
میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے حکم دے دیا کہ محسن الملک کے نام کے ساتھ
نواب کا خطاب جو انہیں نظام حیدرآباد کی طرف سے ملا تھا سرکاری تحریرات میں لکھا
جایا کرے۔ لیکن حکومت کو انہی نواب صاحب کی اس سیاسی کارگذاری پر کوئی اعتراض
نہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کا وفد اپنی کوشش سے بنایا، اور پھر اب آل انڈیا مسلم لیگ
کے جائنٹ سیکرٹری مقرر ہو گئے درحالیکہ وہ علی گڑھ کالج کے بھی سیکرٹری تھے پھر
نواب وقارالملک جنہوں نے اس جلسے کی صدارت کی تھی کہ جس میں ڈھاکے میں مسلم لیگ
کی بنیاد پڑی تھی۔ اور مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی مقرر ہوئے تھے جب نواب محسن الملک
کی وفات کے بعد کالج کے سیکرٹری بنائے گئے تو ان کی سیاسی سرگرمیاں بالکل سدِّ راہ
ہوئیں۔ وہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی برابر مسلم لیگ کے جلسوں میں
شرکت کرتے رہے جس کا صدر دفتر علی گڑھ ہی میں قائم ہو گیا تھا اور ۱۹۱۰ء تک
وہیں رہا۔ نواب وقارالملک اور کالج کے انگریز پرنسپل کے مابین کچھ اختلافات پیدا
ہوئے اور صوبے کے گورنر نے انگریز پرنسپل کی طرف داری کی۔ اس پر مسلمانوں میں
جوش پھیلا اور انہوں نے نواب وقارالملک کی حمایت کی۔ اس جوش نے گورنر کو
مجبور کر دیا کہ اپنے احکام واپس لے لے، لیکن اس نے وہ بات اپنے دل میں رکھی
اور انتقام لینے کے درپے ہو گیا اور دے کر چھوڑا۔ ہز ہائی نس آغا خاں نے مسلم لیگ
کا صدر دفتر علی گڑھ سے لکھنؤ کو منتقل کر دیا اس امید میں کہ وہاں مسلم لیگ پر علی گڑھ
والوں کا کوئی اثر نہ رہے گا۔ لیکن اس چال کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ
علی گڑھ کے پرنسپلوں کے قبضے سے نکل گئی۔

۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر جب تقسیم بنگال کی تنسیخ کا شاہی اعلان

ہوا تو بہت سے مسلمانوں کو اس سے صدمہ پہنچا، اور نواب سلیم اللہ کو اس قدر رنج ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں لیگ کے کلکتہ کے اجلاس میں انہوں نے اپنی تمام پبلک سرگرمیوں سے استعفا دے دیا۔ اس کے چند ہی روز بعد ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

اسی زمانے میں کچھ اور واقعات بھی ایسے ہوتے رہے جن کا مسلمانوں پر اثر پڑا۔ مولوی شبلی نعمانی کی اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک فاضل اور اہلِ علم ہونے کی حیثیت سے بڑی شہرت تھی۔ انہوں نے رسول اللہ کی سیرت اُردو میں لکھی ہے جو کہ ایک بہت مستند کتاب ہے۔ انہوں نے سرسید کی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ انہوں نے اعظم گڈھ میں ایک دارالعلم قائم کیا جس کی طرف سے بہت سی قابلِ قدر تاریخی تصانیف وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں اور جسے مولانا شبلی کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی چلا رہے ہیں۔ مولانا شبلی تمام عمر سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے، لیکن ان کے آخری زمانے میں مولانا کو ان کی پالیسی کی خوبیوں پر اور کانگریس کے متعلق ان کے طرزِ عمل پر کچھ شبہات لاحق ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے رہتے تھے کہ ہندستان کی آزادی کے مسئلہ پر کہ جو بنیادی مسئلہ ہے توجہ دیں اور صرف کانگریس کے عیب گنانے پر قناعت نہ کر بیٹھیں۔ اخبار مسلم گزٹ لکھنؤ مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں انہوں نے مسلم لیگ کی پالیسی اور سیاست پر بحث کرنے کے بعد لکھا تھا کہ

"درخت کی خوبیوں کا اندازہ ان پھلوں سے کیا جاتا ہے جو اس میں لگیں۔ اگر ہماری سیاست کوئی سنجیدہ سیاست تھی تو اس سے ہم میں عمل کی گرمجوشی اور قربانیوں کے لئے آمادگی پیدا ہونی چاہیئے تھی"[1]

---

[1] طفیل احمد "روشن مستقبل" صفحہ ۳۴۹ اور مہتہ اور پٹوردھن صفحہ ۳۰

مسلمانوں کے خیالات پر بعض اور واقعات نے بھی کافی اثر ڈالا۔ اصلاح یافتہ کونسلوں نے ان کے فرقے پر یہ ظاہر کیا کہ ایک فرقے کے مفاد دوسرے فرقہ کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہیں اور تمام ہندستانیوں کے متحدہ ہو جانے کی ضرورت ہے۔ ان سب چیزوں سے زیادہ مسلمانوں کے خیالات غیر ملکی سیاست سے متاثر ہوئے جہاں قومی تحریکات جاری تھیں بالخصوص ترکی اور ایران کی خبریں ہندستان کے مسلمان نوجوانوں کے دماغوں میں اچھی طرح قومی روح پھونک رہی تھیں۔ .... برطانیہ عظمیٰ نے طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے زمانے میں ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس نے برطانیہ کو اپنے اصلی لباس میں ظاہر کر دیا اور ہندستانی مسلمانوں پر برطانیہ کے دوستی کے دعوؤں کا کھوکھلا پن اور ناپائداری آشکارا ہو گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ قومی اخبارات نے مسلمانوں کے اس صدمے پر جو انہیں یورپ کی قوموں کے ترکی کے ساتھ برتاؤ کی وجہ سے پہنچا تھا مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ ہمدردی کا اظہار کر کے ان کے دلوں کو موم کر دیا۔[۵]"

سنہ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے ایک طبی ادارہ کی ترتیب دی اور ترکی لے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار خود گئے اور قسطنطنیہ میں وزیر اعظم کی خدمت میں وہ تھیلی پیش کی جو ترکی ہلال احمر کے لئے ہندستان میں چندہ کیا گیا تھا مولانا ابو الکلام آزاد نے اخبار الہلال نکالا جس کے پر جوش طرز تحریر اور قومیت اور آزادی، اور قربانی کے متعلق اعلیٰ ترین خیالات نے مسلمانوں کے دلوں کو تمام اردو اخبارات کی بہ نسبت زیادہ ملا دیا۔ مولانا محمد علی اسی زمانے میں انگریزی زبان میں

---

۵ گورمکھ نہال سنگھ کی کتاب لینڈ مارکس ان کانسٹی ٹیوشنل اینڈ نیشنل ڈیولپ منٹ: (Land Marks in Constitutional & National Develepement[19]

"کامریڈ" اور اُردو میں "ہمدرد" نکال رہے تھے، جس نے قومیت کے طوفان کی موجوں کو اور بھی عظیم الجثہ اور عظیم الشان بنا دیا۔ مسلم لیگ بھی ان حالات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی اور جب مارچ ۱۹۱۳ء میں اس کا لکھنؤ کا اجلاس منعقد ہوا تو اس کے دستور اساسی میں ترمیمیں کی گئیں۔ اس اجلاس کی صدارت سر ابراہیم رحمت اللہ نے کی تھی دوسری کارروائیوں کے علاوہ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا مقصد بھی یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ تاجِ برطانیہ کی پشت پناہی میں حکومت خود اختیاری کا ایسا طریقہ جو ہندستان کے لئے موزوں ہو آئینی ذرائع سے تدریج اصلاحات کے ذریعہ موجودہ طرز حکومت کو بدل کر، اور قومی اتحاد کو ترقی دے کر، اور ہندستانیوں کے اندر معاشرتی روح پیدا کر کے، اور دوسرے فرقوں کے ساتھ اس مقصد کی خاطر اشتراک عمل کر کے حاصل کرنا، اس طرح لیگ کا مقصد بھی اب انڈین نیشنل کانگریس کے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا، اور اس طرح فرقہ دارانہ اتحاد اور متحدہ کوشش کے لئے راستہ کھل گیا اور اس کا نتیجہ بھی جلد ہی ظاہر ہو گیا۔

اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ لوگوں میں جوش اور اشتعال پیدا ہو گیا تھا، اور بعض لوگوں نے جن میں مسلمان پیش پیش تھے بہت جرأت آمیز تجویزیں آزاد ہندستانی جمہوریت کے قیام کے لئے بنائیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھی مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل گرفتار کر کے مالٹا بھیج دئے گئے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد اور مولانا حسرتؔ موہانی سب اس لئے نظر بند کر دئے گئے کہ ان سب کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں، اور ترک انگریزوں کے خلاف لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ ان مولاناؤں کی خطا یہ بھی تھی کہ وہ علی الاعلان متحدہ قومیت کا راگ الاپا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگریس دونوں کے اجلاس بمبئی میں

ہوئے۔ کانگریس کے بہت سے لیڈر جن میں پنڈت مدن موہن مالویہ، شریمتی سروجنی نائیڈو، اور مہاتما گاندھی بھی شامل تھے لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہزہائنس نے لیگ کی مستقل صدارت سے استعفا دے دیا۔ لیگ نے اپنی ایک کمیٹی اس کام کے لئے معین کی کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر ہندستان کے لئے کوئی تجویز بنائے۔ لکھنؤ میں پھر لیگ اور کانگریس کے اجلاس ساتھ ساتھ اور ایک ہی وقت میں ہوئے۔ بمبئی اور لکھنؤ کے اجلاسوں کے درمیان کے سال بھر میں لیگ کی کمیٹی نے وہ تجویز مرتب کر لی تھی کانگریس کی بھی قوت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ اعتدال پسندوں اور ترقی پسندوں کے درمیان جو افتراق کی خلیج سورت میں پیدا ہو گئی تھی وہ بھی اب پٹ چکی تھی، اور اس لئے اجلاس میں نہ صرف پنڈت مدن موہن مالویہ، اور سر سیندر ناتھ بنرجی جیسے اعتدال پسند لیڈر شریک ہوئے بلکہ لوکمانیہ تلک نے بھی شرکت کی۔ لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے رو سے کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے حق کو تسلیم کر لیا، اور پنجاب اور بنگال کے علاوہ اور صوبوں میں ان کے تناسب سے کہیں زیادہ نشستیں ان کے نمایندوں کے لئے منظور کر لیں۔ یہ بھی طے پایا کہ کوئی ایسا قانون یا مسودۂ قانون، یا اس کا کوئی حصہ جس کی تحریک کسی غیر سرکاری ممبر نے کی ہو، کسی مرکزی یا صوبہ جاتی مجلس مُقَنِّنَہ میں اس بات کا مجاز نہ قرار پائیگا کہ اس پر اسمبلی میں کوئی کارروائی ہو اگر اس کا اثر کسی ایک فرقے پر پڑتا ہی اور اس فرقے کے کم از کم تین چوتھائی ممبر اس قانون، یا تجویز یا ان کے کسی حصہ کی مخالفت کریں لیگ اور کانگریس کے درمیان یہ معاہدہ ہونے کے علاوہ کمیٹی کی تجویز میں اصلاحات کی ایک اسکیم بھی تھی اور یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت خود اختیاری کی جانب ان اصلاحات کو منظور کر کے کہ جو تجویز میں شامل تھیں ایک حقیقی قدم بڑھایا جائے، نیز یہ کہ سلطنت کی از سر نو تعمیر میں ہندستان کو ایک ماتحت ملک کی حیثیت سے بلند کر کے

سلطنت کے اندر دوسری خودمختار ریاستوں کے ساتھ برابر کے حصہ دار کی منزلت دی جائے
مسٹر ایم، اے، جناح لیگ کے اس اجلاس کے صدر تھے اور کانگریس کی طرف تمام لیڈروں
نے جن میں لوکمانیہ تلک بھی شامل تھے اس پیثاق کو پسند کیا۔ لیگ کے دوسرے ریزولیوشن
بھی اسی طرز کے تھے جیسے کانگریس کے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ لیگ اور کانگریس
کے درمیان کامل اتحاد قائم ہوگیا ہے۔

اس طرح مسلم لیگ کانگریس کے اس سیاسی منصوبے کی پرجوش حامی بن گئی جو کہ
اس نے اختیار کیا تھا۔ یہ نئی رخ آئندہ اجلاس میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ مولانا محمد علی کو
اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا جو کہ اس زمانے میں نظربند تھے۔ گزشتہ دو اجلاسوں کی
طرح لیگ کا یہ اجلاس بھی دسمبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ
ہوا۔ مہاتما گاندھی اور شریمتی نائیڈو نے لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اور لیگ کی
کارروائیوں میں علی برادران کی رہائی کے مطالبے کی تجویز کی تائید کرکے حصہ بھی لیا۔

(۱۳) تحریک خلافت اور اُس کے بعد

لیگ کا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ہونے سے پہلے پہلے جہاں کانگریس
کا اجلاس بھی ہوا تھا ملک کے اندر، اور دنیا بھر میں بہت کچھ واقعات رونما ہوچکے
تھے۔ مسٹر مانٹیگو ہندستان آئے تھے اور لارڈ چیمسفورڈ جو کہ ان دنوں وائسرائے
تھے مل کر اپنی اصلاحات کی رپورٹ تیار کی تھی جو کہ برطانیہ کی اس پالیسی کے مطابق تھی
جو اگست ۱۹۱۷ء میں اختیار کی گئی تھی۔ جنگِ عظیم متحدہ قوموں کی موافقت اور جرمنی
اور ترکی کے خلاف ختم ہوچکی تھی۔ ترکی کی شکست کی وجہ سے چند ایسے مسائل رونما
ہوگئے کہ جن سے ہندستان کے مسلمان متاثر ہوئے جس وقت کہ جنگ جاری تھی برطانوی

حکومت کے نمائندوں نے اس امر کا یقین دلایا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر ترکی کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے گا، اور کوئی کارروائی ایسی نہ کی جائے گی کہ جس کا اثر مسلمانوں کے ان مقامات مقدسہ پر مخالفانہ پڑے جو عرب اور میسوپوٹیمیا میں واقع ہیں۔ اگرچہ اس وقت تک یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ ترکی کے ساتھ کن شرطوں پر صلح کی جائے گی لیکن عرب میں انگریزوں کے ابھارنے پر عربوں نے جو اپنی ترکی حکومت سے بے تعلقی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اس کی بنا پر ہندوستان کے مسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ اور واقعات نے بھی جیسے کہ کانپور کے بلوے کا بہت جبر و تشدد کے ساتھ دبا دیا جانا، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اس خطبے کا ضبط کر لیا جانا جو انہوں نے لیگ کے دہلی کے اجلاس کے موقعہ پر استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے پڑھا تھا، مسلمانوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا۔ تھا۔ علماء اسلام پھر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی میدان میں آ گئے اور ان کی سیاسی تحریکات میں پیش پیش رہنے لگے۔ لیگ نے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کر دیا۔

جنگِ عظیم کے بعد جو صلح ہوئی اس کی شرائط نے ان تمام وعدوں کو جھوٹا ثابت کر دیا کہ جو خلیفۃ المسلمین کے متعلق نیز ان کی سلطنت اور ان کے اختیارات کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں سے کئے گئے تھے۔ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ پر خلافت کے اقتدار کی کمی کی وجہ سے غیر مسلموں کا قبضہ ہوتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ ہندوستان کی خلافت کی تحریک اتحادیوں کے خلاف بالخصوص انگریزوں کے خلاف ایک احتجاجی تحریک تھی۔ ہندوؤں نے مہاتما گاندھی کی ہدایات کے مطابق تحریک خلافت کی پوری قوت سے تائید کی۔ برطانیہ کی ترکوں کی مخالفت پالیسی نے مسٹر مانٹیگو کو بھی خوف زدہ کر دیا جو اس وقت وزیر ہند تھے، اور لارڈ ریڈنگ نے جو کہ وائسرائے تھے ایک تار بھیج کر اس بات پر زور دیا کہ قسطنطنیہ کو خالی کر دیا جائے، مقدس مقامات پر سلطان کی حکومت قائم رکھی جائے، اور ترکی تھریس اور سمرنا کو واپس کر دیا جائے اس تار کی ایک ایسے وقت پر اشاعت کا کہ جب گفت و شنید جاری تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر مانٹیگو

کو استعفا دینا پڑا۔ ہندستان کے اندر خیالات تلخ سے تلخ تر ہوتے گئے اور اس غرض سے کہ مجموعی طور پر اس مسئلے پر توجہ دی جاسکے مرکزی خلافت کمیٹی بنائی گئی جس کی شاخیں تمام ہندستان میں پھیل گئیں۔ علماء نے شیخ الہند مولٰنا محمود الحسن صاحب کی سرکردگی میں جمعیۃ العلماء ہند قائم کی۔ مسلمانوں کی طرف سے انگلستان کو وفد بھیجے گئے تاکہ وہ حکمراں جماعت پر ہندستانی مسلمانوں کے خلافت کے مسئلے کے متعلق جذبات کا پرجوش اظہار کریں، اور اس بات کی پرزور وکالت کریں کہ ایسی کوئی کارروائی نہ کی جائے جس سے سلطنتِ ترکی کے اندر قطع و برید کی نوبت آئے، یا اسلام کے مقامات مقدسہ کی حفاظت کے معاملے میں اس کے اختیارات اور اس کی طاقت کم ہوجائے۔ اس وفد کی ناکامی اور صلح کی کارروائیوں کے بدستور جاری رہنے سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ اتحادیوں کو مسلمانوں کے جذبات کا کوئی پاس اور لحاظ نہ ہوگا اور وہ اپنے وعدوں کے باوجود ایسی ہی شرائط پر صلح کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے کہ جو ترکی کے لئے مضرت رساں ہوں، اور اب اس چیز نے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگادی۔ خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء ہند مسلمانوں کی سب سے زیادہ بااثر اور کارگذار انجمنیں بن گئیں اور کئی سال تک مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ مسلم لیگ کے اجلاس بدستور کانگریس کے اجلاسوں کے ساتھ ساتھ ہوتے رہے، اور ان جماعتوں کی صدارت باری باری سے ترقی پسند قوم پرور مسلمان مثلاً حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر ایم' اے' انصاری، مولانا حسرتؔ موہانی اور علی برادران کرتے رہے۔

خلافت کی تحریک آگے چل کر اس تحریک کے ساتھ مل گئی جو حکومت کے اس قانون کے خلاف جاری کی گئی تھی جو رولٹ بل" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ان کارروائیوں کی تشریح اور توضیح کی جائے جن کی وجہ سے تمام ملک میں اور تمام فرقوں میں اس قدر خونخوار مخالفت پھیل گئی تھی۔

مختصر یہ ہے کہ وہ "سیڈیشن کمیٹی" کی سفارشات کا نتیجہ تھے جس کے صدر "سر سڈنی رولٹ" (Sir Sydney Rowlatt) تھے، اور جس کا منشا یہ تھا کہ کسی قدر

خفت کے ساتھ ان کردہ دفعات پرعمل کیا جائے جو "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" (Defence of India Act) میں شامل تھیں جو لڑائی کے بعد اب نافذ نہ رہا تھا۔
ان مسودہ ہائے قانون کی مخالفت میں تمام ملک اس طرح متحد ہو کر کھڑا ہوا کہ جیسا کبھی آج تک نہ ہوا تھا۔ اور پنجاب، اور صوبہ بمبئی اور دہلی اور بعض اور مقامات پر بلوے بھی ہوئے۔ اس جوش کو دبانے والا ہاتھ بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ چلا اور امرتسر میں وہ واقعات رونما ہوئے جو "جلیانوالہ باغ" کے المناک حادثے کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں۔ اور ان حادثات کے بعد پنجاب میں مارشل لا (جنگی قانون) کا نفاذ ہو گیا۔ اس مارشل لا کے زمانے میں جو جو کچھ مظالم کئے گئے وہ کچھ دنوں کے بعد عوام کو اس وقت معلوم ہوئے کہ جب حکومت کی طرف سے تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر لارڈ ہنٹر (Lord Hunter) تھے۔ کانگریس نے بھی اپنے طور پر علیحدہ تحقیقات کرائی۔ جب ان دونوں کمیٹیوں کی رپورٹیں شائع ہوئیں تو تمام ملک میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اس واقعہ نے مسلمانوں کی اس ناراضی کے ساتھ مل کر کہ جو انہیں خلافت کے مسئلے کے متعلق پیدا ہو چکی تھی ایک طرف کانگریس اور دوسری طرف مسلم انجمنوں کے درمیان اشتراک عمل پیدا کر دیا۔ ایک مشترکہ کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور سب نے مل کر عدم تشدد کے ساتھ حکومت سے ترک تعاون کو اپنا پروگرام مقرر کیا۔ جمعیۃ العلماء نے ایک فتویٰ شائع کیا جس پر نو سو پچیس سر آوردہ مذہبی علما کے دستخط تھے اور اس میں عدم تشدد کے ساتھ ترک تعاون کی منظوری دے دی گئی بہ کثرت علماء کو جیل میں بند کر دیا گیا غم و غصہ کا احساس اس قدر زبردست تھا کہ بہت سے مسلمان ہندستان سے ہجرت کر گئے اور ناقابل بیان مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔

کانگریس نے اپنا ایک مخصوص اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں منعقد کر کے ایک ریزولیوشن غیر متشدد ترک تعاون کی حمایت میں پاس کیا جس کی تصدیق آئندہ ماہ دسمبر کے سالانہ اجلاس ناگپور میں کی گئی۔ اس سے اگلا سال یعنی ۱۹۲۱ء ایسا سال تھا کہ جس میں ہندستان کے تمام فرقوں کے درمیان اس قدر کامل اتحاد نظر آیا کہ جس کی تاریخ میں کوئی

نظر موجود نہ تھی، اور ہر دل میں بس یہی آرزو تھی کہ سوراج حاصل کیا جائے اور پنجاب کے مظالم اور خلافت کے متعلق حکومت کی پیمان شکنی کا تدارک کیا جائے۔ ہر ایک فرقے کے ہزارہا مرد اور عورتیں اس سے پیشتر ہی کہ سول نافرمانی اور ٹیکس کی عدم ادائیگی کی تجویز عمل میں آئے جیل خانوں میں بھر گئے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، دیش بندھو داس پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، اور دوسرے مقتدر رہنما، اور ان کے ساتھ کانگریس اور خلافت کے کارکنوں اور ممبروں کی ایک بہت ہی بڑی تعداد سال کے ختم ہونے سے پہلے جیلوں میں پہنچ گئی۔ ان لیڈروں کے مقید ہو جانے کے باوجود ان انجمنوں کے اجلاس احمد آباد میں انتہائی جوش و خروش کے نظارے دیکھنے میں آئے۔ ٹیکسوں کی عدم ادائیگی اور سول نافرمانی کا ایک پروگرام مرتب کر کے اختیار کیا گیا لیکن اس پروگرام پر عمل درآمد سے پہلے چوری چورا میں سخت بلوہ ہو گیا اور اس لئے پروگرام روک دیا گیا۔ مہاتما گاندھی کو گرفتار کر کے چھ سال کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ نے تحریک کو بالکل روک دیا۔ اس کے دوبارہ جاری کرنے کی کوششیں کی گئیں مگر بے سود ثابت ہوئیں۔

دسمبر ۱۹۲۱ء کا اجلاس احمد آباد مسلم لیگ کا وہ آخری اجلاس تھا جو کانگریس کے پہلو بہ پہلو اسی شہر اور اسی زمانے میں ہوا۔ اگرچہ مولانا حسرت موہانی اس کے صدر تھے لیکن لیگ نے من حیث الجماعت یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کانگریس خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس نے دوسری انجمنوں کی طرح سول نافرمانی کا ریزولیوشن پاس نہیں کیا۔ گذشتہ سات برس سے وہ برابر کانگریس کے قدم بقدم چل رہی تھی، اور اپنے دستور اساسی میں بھی تبدیلی کر لی تھی، لیکن جب سول نافرمانی اختیار کی گئی تو اس نے اپنے اجلاس کانگریس، خلافت کمیٹی، اور جمعیۃ العلماء کے ساتھ منعقد کرنے کی رسم ترک کر دی۔

مولوی طفیل احمد لکھتے ہیں :-

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اپنی ہم عصر دوسری انجمنوں سے پیچھے کیوں رہ گئی۔ اس سوال کا جواب مولانا شبلی مرحوم کی تحریر میں ملتا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"لیگ کا سنگِ بنیاد مسلمانوں کا وہ وفد تھا جو وائسرائے کی خدمت میں شملہ پر گیا تھا۔ اب آگے چل کر اسے خواہ کوئی سا بھی دستوراساسی دے دیا جائے وہی شملہ کے وفد والی روح اس سے ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ لیگ کی عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی لگی تھی اب اس پر جو عمارت بھی بنائی جائے گی اس کا کج ہونا لازمی ہے۔ لیگ کی سیاست کا ماحصل صرف اس قدر ہے ہندو جس قدر بھی حقوق اور منصب حاصل کریں ان میں مسلمانوں کا حصہ مقرر ہونا ضروری ہے۔ یہ حقیقی سیاست نہیں ہے۔ حقیقی سیاست وہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے لوگ حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں، اور اس لحاظ سے سیاست اسی قدر طاقتور چیز ہے کہ جیسے مذہب۔ اس قوت کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ کا کوئی بھی ممبر اپنے اوپر کوئی تکلیف یا صدمہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا، اور وہ اپنے اندر کوئی بلند عزم اور بلند ہمتی نہیں پاسکتا ہے۔"

جوش وخروش کا شعلہ ایک غیر محدود مدت تک فروزاں نہیں رہ سکتا تھا۔ اور سول نافرمانی کے بند ہوجانے اور مہاتما گاندھی کے مقید ہوجانے کی وجہ سے یہ شعلہ سرد پڑا اور افسردہ ہوگیا۔ مسلم لیگ کو دیگر جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا

اور ۱۹۲۳ء میں اس کا اجلاس لکھنؤ میں صرف اس وجہ سے ملتوی ہو گیا کہ شرکاء کی تعداد ناکافی تھی اور کورم پورا ہو نہ سکا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء ، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے اجلاسوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ کانگریس اور لیگ کا راستہ الگ الگ ہے، اور ان راستوں کا باہمی فرق بڑھتا ہی جاتا ہے۔

۱۹۲۱ء میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات حد سے زیادہ خوشگوار تھے۔ اسی سال بقرعید کے موقع پر مسلمانوں نے بالکل اپنی مرضی سے کئی ایک مقامات پر گائے کی قربانی ترک کر دی تھی، اور خلافت کی تحریک میں ہندوؤں کی شرکت نے ہندو مسلم اتحاد کو اچھی طرح قائم کر دیا تھا تو اس زمانے میں چند واقعات ایسے بھی ہوئے تھے جنہوں نے اتحاد کے اس ساز کو بے سُرا کر دیا تھا۔ خلافت کی تحریک کا ملابار کے علاقے میں زور بہت زیادہ تھا جہاں کہ موپلہ مسلمان بہ کثرت آباد ہیں وہاں کے ہندو بھی تحریک خلافت میں اسی طرح شریک ہوئے کہ جس طرح اور مقامات کے ہندو شریک ہوئے تھے۔ عدم تشدد کا سبق ان لوگوں کو اتنا بھی نہ مل سکا تھا کہ جتنا اور مقامات کے لوگوں کو۔ یہاں تحریک نے تشدد کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا محمد علی ملابار جانے کے لئے آمادہ ہوئے اور اگر انہیں وہاں جانے کی حکومت سے اجازت مل جاتی تو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ صورت حالات پر قابو پا لیتے۔ لیکن انہیں حکومت نے راستہ میں گرفتار کر لیا، اور دوسرے لیڈروں کو بھی وہاں جانے سے روک دیا۔ عوام اس جگہ قابو سے باہر ہو گئے، اور جیسا کہ اس قسم کے موقعوں پر ہمیشہ ہی ہوا کرتا ہے حکومت کے مظالم بہت سخت ہوئے اور کوئی ان سے نہ بچا۔ اگرچہ بعض ہندو لیڈروں کو بھی اسی قدر سخت سزائیں ملیں جیسی موپلوں کو، لیکن اس قسم کی اطلاعات ملیں کہ موپلوں نے اس شک پر کہ ہندو حکومت کے ساتھ مل گئے یا کم از کم ان کے ساتھ نہیں ہیں ہندوؤں پر مظالم روا رکھے۔ بیان کیا گیا تھا کہ بالجبر

ہندوؤں کو مسلمان بنایا گیا اور ان چیزوں نے ہندوؤں کے دل میں غصہ پیدا کر دیا شمالی ہندستان کے ہندو بھی ان خبروں کو سن کر جن میں سے بیشتر مبالغہ آمیز تھیں برہم ہو جانے سے باز نہ رہ سکے۔ لیکن صورت حالات اس وقت تک قابو سے باہر نہ ہوئی تھی جب تک کہ لیڈر بالخصوص مہاتما گاندھی جیل سے باہر تھے۔ سوامی شردھانند جو کہ عدم تعاون کی تحریک کے ایک لیڈر تھے اور جنہوں نے اپنے بہادرانہ اور باہمت کاموں سے مسلمانوں کے دلوں میں اس قدر عزت اور اعتماد حاصل کر لیا کہ انہوں نے سوامی جی کو دہلی کی جامع مسجد میں آکر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی، ان کو ان خبروں نے سخت صدمہ پہنچایا جیل سے باہر آتے ہی انہوں نے شدھی کی تحریک شروع کر دی۔

سوامی شردھانند کی یہ شدھی کی تحریک بہت کچھ ہدف ملامت بنی اور قوم پروروں اور مسلمانوں دونوں نے اس پر اعتراضات کئے۔ اس خاص زمانے اور ان مخصوص حالات میں اس کے مناسب وقت ہونے کے متعلق تو بے شک خواہ جو کچھ بھی کہہ لیا جائے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عیسائی یا مسلمان خود شدھی کے طریقے پر کس طرح اعتراض کر سکتے ہیں۔ ان دونوں مذہبوں کے پیرو برابر اپنا تبلیغی کام کرتے رہتے ہیں، اور ہندوؤں کو اپنے حلقۂ مذہب میں داخل کیا کرتے ہیں اگر ہندو بھی اسی طرح غیر ہندوؤں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے لگ جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی غیر ہندو کو اس پر اعتراض ہو درحالیکہ وہ خود ایسا کر رہا ہو ہندوؤں کو بھی لازمی طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا وہی حق حاصل ہونا چاہئے جو دوسروں کو ہے۔ لیکن منطق اور انصاف ہی وہ چیزیں نہیں ہیں جو ہر موقع پر انسانوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اور ہم نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں میں شدھی کی تحریک کے خلاف بہت نفرت پھیل گئی اور خود سوامی شردھانند کے خلاف یہ نفرت اتنی بڑھ گئی کہ ایک مسلمان نے انہیں قتل کر دیا۔ شدھی کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی

تحریکیں جاری کر دیں۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے آخر کے قریب ملتان میں سخت فساد ہوا جس کے دوران میں ہندوؤں کے مندروں کی بے حرمتی کی گئی، بہتیرے ہندو مارے گئے اور بہت سے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ اس طویل سلسلۂ فسادات کا کہ جو کئی سال تک لگاتار ہوتے رہے اور جو قریب قریب ہر حصۂ ملک میں پھیل گئے، یہ ملتان کا بلوہ پہلی کڑی تھی۔ کانگریس اور خلافت کے کام کرنے والوں اور تمام قوم پرور لوگوں کو خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان ان واقعات نے سخت رنج پہنچایا اور انہوں نے اس طوفان کو روکنے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ان فسادات کے پس پشت کوئی طاقت پوشیدہ طور پر اپنا کام کر رہی تھی۔ پاکستان کے بعض حامیوں نے ان فسادات کا الزام تمام تر ہندوؤں کے سر تھوپا ہے، بعض تو اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہندو لیڈروں کی مرتب کی ہوئی یہ ایک اسکیم تھی اور ایسی اسکیم مرتب کرنے سے اگر اور کچھ بھی ان کا منشا نہ ہو تب بھی یہ تو ضرور تھا کہ اس طرح ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی مشق ہی ہو جائے گی جن کے مقابلے میں وہ ہمیشہ بھیڑ بکری بنے رہے ہیں۔ یہ بیان مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ حل کر دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ پاکستان کی موافقت کے دلائل کے سلسلے میں اس سے ایک کڑی کا کام لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض بے بنیاد ہے۔ اگر ان فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ کا، زیادہ نہیں تو گذشتہ تیس ہی سال کی تاریخ کا بغور اور خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا جائے تو اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا کہ یہ فسادات ہمیشہ ایسے ہی موقعوں پر رونما ہوئے ہیں کہ جب ملک میں سیاسی حالات کسی نازک مرحلے پر پہنچ گئے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فسادات ہمیشہ انہی موقعوں پر ہوئے ہیں کہ جب انگریزوں کے ہاتھوں سے طاقت اور اختیارات کے ہندوستانی ہاتھوں میں دے دیے جانے کا مطالبہ بہت زور شور سے اور مسلسل کیا جا رہا ہو، اور جب کبھی ہندوستان کے یہ دو بڑے فرقے اپنے مقصد اور اپنے عمل میں متحد ہو چلے ہوں۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک دلی اور یک جہتی پیدا ہو گئی تھی اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں سوراج کے مطالبے کی تحریک پورے زور کے ساتھ اٹھائی گئی تھی۔ اسی سال کے اختتام کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کے صوبے میں شاہ آباد کے مقام پر سخت فسادات رونما ہوئے جن میں ہندوؤں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا، اور پھر حکومت کے ہاتھوں ہندوؤں کی اچھی طرح بربادی ہوئی۔ اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۱۸ء میں صوبہ متحدہ کے اندر کٹار پور میں سخت بلوہ ہوا، اور اس میں بھی وہی نتیجہ نکلا۔ خلافت اور پنجاب کے مظالم نے ہندو مسلمانوں کے درمیان ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک تقریباً کامل اتحاد پیدا کر دیا تھا، اور ۱۹۲۲ء ہی میں فسادات ملتان سے شروع ہو کر کئی سال تک برابر جاری رہے۔

۱۹۲۴ء میں جب مہاتما گاندھی اپنی سزا کے چھ سال پورے کرنے سے پہلے ہی، اپنی علالت طبع کے باعث رہا ہو کر جیل سے باہر آئے تو انہیں ان فسادات کی بدمستیاں دیکھ کر انتہائی صدمہ پہنچا جن کے سبب سے تمام ملک میں جان و مال کی اس قدر تباہی عمل میں آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق برت رکھا اور پورے اکیس روز کا برت رکھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے دل پر چوٹ لگے اور وہ فرقہ وارانہ تعلقات کی اس ابتری کو روکیں اور آپس میں بھائیوں کا خون بھائی بہانا بند کر دیں۔ مولانا محمد علی نے جو اس سال کانگریس کے صدر تھے ہر فرقے کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہ کانفرنس اس حد تک ضرور کامیاب ہوئی کہ اس نے بالکل متفقہ ریزولیوشن پاس کر دئیے کہ جن میں مذہبی فرقوں کے حقوق اور ان کے فرائض کی تصریح تھی، اور وہ تدابیر بھی بتائی گئی تھیں جن پر ایسے حالات میں عمل کیا جائے کہ جن سے فسادات رونما ہوتے ہیں۔ یہ امید کی گئی تھی کہ اس طرح حالات کی اصلاح ہو جائے گی

اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ان ریزو لیوشنوں کی کما حقہٗ اشاعت کی جاتی، اور ان کی ہدایات پر خلوص دل سے عمل کیا جاتا تو صورتِ حال پورے طور پر قابو میں آجاتی۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا اگر تمام کا تمام الزام کسی ایک فرقے کے سر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ فرقہ وارانہ فسادات اگرچہ ظاہر میں تو مذہبی جنون کا نتیجہ نظر آتے ہیں لیکن فی الاصل ان کے پس پشت ایک سیاسی پس منظر ہوتا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد جب کسی جگہ رونما ہوجاتا ہے تو پھر وہ بجائے خود آئندہ فسادات کا سبب بن جاتا ہے کیوں کہ تعلقات میں تلخی اور ایک دوسرے پر شکوک اور شبہات دلوں میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ فساد کے بعد فضا اس درجہ مکدر ہوجاتی ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی کہ جو اس سے الگ رہے ہیں اور اپنے حواس نہیں کھو چکے ہیں یہ بات مشکل ہوجاتی ہے کہ اپنا دماغی توازن قائم رکھیں اور فسادات کے اسباب کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اور باہمی صلح اور صفائی کے وسائل اختیار کریں۔ ان فسادات کے بعد کا غم وغصہ اس قدر تباہ کن ہوتا ہے کہ بعض اوقات صلح وصفائی کی کوششوں کو بھی شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے غلط معنی لئے جاتے ہیں۔

اس مسئلے پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر عیاں ہوجائے گا کہ فسادات کے متعلق اختلافات خیالات کو اور ان کے اسباب کی چھان بین میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کی کوشش کو طول دینا کسی طرح بھی مفید نہیں ہوا کرتا، اور اس کی یاد کو دلوں میں تازہ رکھنا کسی کام نہیں آتا۔ پولیس اور عدالت کی ایک مدت تک چلنے والی تحقیقات میں جو کبھی کبھی تو برسوں تک چلتی رہتی ہیں ان سے یہی حاصل ہوتا ہے کہ تعلقات کی کشیدگی برقرار رہے کیونکہ مقدمے کے دوران میں فریقین کے ساتھ ساتھ گواہ اور شاہد بھی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہوجاتے ہیں، اور دونوں فرقوں میں اس قسم کے لوگوں کی کمی نہیں رہتی جو مردِ میدان بن کر اپنے اپنے فرقے کی طرف سے نکل آئیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر معاملہ

عدالت میں لے جائے بغیر پنچ کے طور پر طے کرنے اور فریقین میں صلح کرا دینے کی کوشش کی جائے تو اس پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اپنے فرقے کے مجرموں کو سزا سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اصل مجرم بالخصوص وہ لوگ کہ جو نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکایا کرتے ہیں اور فسادات کے لئے اکھاڑا تیار کیا کرتے ہیں وہ اس قدر چالاک ہوتے ہیں کہ سب کچھ کرنے دھرنے کے باوجود صاف بچ جاتے ہیں اور پولیس اور عدالت کے کبھی شکنجے ہی میں نہیں آتے۔ جو غریب سزائیں پاتے اور مصیبتیں جھیلتے ہیں وہ تو وہ بھولے بھالے عوام ہوتے ہیں جو مشتعل ہو کر وقت تو بہت کچھ کر گزرتے ہیں لیکن بعد میں جلد ہی سے ان کا جوش زائل ہو جاتا ہے، اور اپنے کئے پر پچھتانے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کو اگر بچانے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ اخلاقاً کوئی گناہ نہیں ہے بالخصوص جبکہ یہ مقصد ہو کہ آپس کی کشیدگی دور ہو کر عام طور پر تمام ملک میں آپس کے تعلقات از سر نو خوش گوار اور دوستانہ ہو جائیں۔ لیکن اسی قسم کی کوشش پر سنجیدگی کے ساتھ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہ ہندوؤں کی فریب کاریاں ہیں تاکہ وہ سزاؤں سے محفوظ ہو جائیں۔ شاید یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باہمی مصالحت کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی کسی ایک فرقے کی وکالت نہیں کیا کرتے بلکہ دونوں فرقوں کے مفاد پر زور دیتے ہیں اور اس قسم کے فرقہ وارانہ بلووں میں یہ ایک حقیقت ہے کہ طرفین سے ایک دوسرے کے خلاف نالشیں دائر کرائی جاتی ہیں اور دونوں طرف کے آدمی ملزموں کی فہرست میں داخل ہوتے ہیں اور اگر ان کا باہمی تصفیہ کرا دیا جائے تو دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ امر ثابت ہو چکا ہے جیسا کہ ان فسادات میں سے بعض کی تحقیقاتی رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ اگر حکومت صورت حالات کو مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں لیتی تو نہ صرف یہ فسادات روکے ہی جا سکتے تھے بلکہ اگر وہ رونما ہو چکے ہیں تو ان کی مزید ترقی بھی رک سکتی تھی۔ بمبئی میں

بہت سخت فساد ہوا تھا۔ اس میں ۸۹ ہندو اور ۴۵ مسلمان مارے گئے تھے، اور ایک یوروپین اور ایک پارسی، اور ان مقتولین کے علاوہ ۳۴۶ آدمی زخمی ہوئے تھے۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی اور اس نے لکھا:-

"ہماری یہ رائے ہے کہ اس اعتقاد میں کافی وزن اور وقعت ہے کہ پولیس کمشنر کو اس سے کسی قدر پہلے ہی فوج طلب کرلینی چاہیئے تھی جبکہ اس نے طلب کی۔ بہرصورت یہ حال کا تجربہ ظاہر کررہا ہے کہ شروع ہی میں فوج کی ایک بڑی تعداد کو بلا لینا، اور دوسری انتہائی تدابیر اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے۔"

کانپور میں ۱۹۳۱ء میں سخت فساد برپا ہوا۔ کانپور کے فسادات کی تحقیقاتی کمیٹی کا بیان یہ ہے کہ۔

"ایک گواہ نے میرے سامنے یہ بیان کیا کہ عام طور پر سب کا یہ خیال ہے کہ مقامی حکام نے فوری اور سخت تدابیر اختیار کرنا پسند نہ کیا کیونکہ وہ سوداگروں سے اس لئے ناراض تھے کہ انہوں نے کانگریس کی کارروائیوں میں امداد کی تھی، اور انہوں نے یہ جتانا چاہا کہ سرکاری حکام کی مدد کے بغیر ان کا جان و مال محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

پولس کا یہ طرز عمل قابلِ ملامت اور ناقابلِ معافی تھا۔ ہر طبقے کے گواہ اس ایک بیان کے متعلق متفق الرائے تھے کہ فساد کی وارداتوں کے متعلق پولیس نے سہل انکاری اور تغافل سے کام لیا۔ ان گواہوں میں یوروپین تاجر، مسلمان اور ہندو ہر طبقے اور ہر خیال کے فوجی افسر، بالائی ہند کی چیمبر آف کامرس کے سکرٹری، ہندستانی عیسائی فرقے کے نمائندے حتیٰ کہ حکومت کے ہندستانی حکام بھی شامل تھے۔ ایسی شہادت کی طرف سے کہ جس میں سب گواہ ایک زبان ہوں چشم پوشی نہیں کی جاسکتی...... ہمیں

اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ فسادات کے ابتدائی تین دنوں میں پولیس نے اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں وہ سرگرمی نہ ظاہر کی جس کی اس سے توقع تھی...... ...... کئی ایک گواہوں نے ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ جن میں پولیس والوں کی نظر کے سامنے سنگین جرائم کی وارداتیں ہوئیں اور انہوں نے کوئی عملی دلچسپی نہ لی...... ہم سے متعدد گواہوں نے بھی بیان کیا ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اپنی گواہی میں یہی کیا ہے کہ پولیس کی بے پروائی اور بے عملی کی شکایتیں اسی موقع پر کی گئی تھیں۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ان شکایتوں کے متعلق کوئی معقول کارروائی نہ کی گئی[۵]۔"

(۱۴) مثلث کا قاعدہ درازی اختیار کرتا ہے

گوہاٹی کے کانگریس کے اجلاس سے ذرا پہلے دسمبر ۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو دہلی میں ایک مسلمان مذہبی دیوانے نے قتل کر دیا جبکہ وہ بستر علالت پر دراز تھے اور وہ ان سے ملاقات کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس حادثے سے قدرتی طور پر تمام ملک تھرا اٹھا اور سب پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ اور سب نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ سیاسی، سماجی، اور مذہبی غرضیکہ ہر قسم کے ہندو مسلم اختلافات کا تصفیہ از سرِ نو ہونا چاہیئے۔ یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ "مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات" کے ۱۹۲۰ء میں نافذ ہو جانے پر انڈین نیشنل کانگریس اور خلافت کمیٹی

---

[۵] کے، بی، کرشنن کی کتاب "دی پرابلم آف مائناریٹیز" (The Problem of Minorities) صفحہ ۲۷۲-۲۷۳

نے قانون ساز مجالس کا بائیکاٹ کر دیا تھا؛ اور دونوں جماعتوں نے ۱۹۲۰ء کے انتخابات میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں قدرتی طور پر سول نافرمانی کی تحریک کے بند ہو جانے پر دونوں انجمنوں کے لیڈروں میں اختلافات رائے پیدا ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ قانون ساز مجلسوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا گیا اور کانگریس اور خلافت کے کارکنوں نے انتخابات میں حصہ لیا جو کہ ۱۹۲۳ء کے اواخر میں، اور اس کے بعد ہوئے۔ قانون ساز مجالس میں کانگریس سوراج پارٹی کے واسطے سے اپنا کام کر رہی تھی جو کہ اس وقت قائم ہو چکی تھی۔ سوراج پارٹی کا یہ مقصد نہ تھا کہ اصلاحات کو قبول کرے بلکہ وہ قانون ساز مجلس میں اس لئے شریک ہوئی تھی کہ حکومت کی کارروائیوں سے عدم تعاون کرے۔ اس لئے کانگریسی ممبروں نے مرکزی مجلس قانون ساز میں اس مقصد کے ریزولیوشن پیش کئے کہ دستور اساسی پر نظر ثانی کی جائے، اور مالیات کے قانون کو مسترد کر دیا جس کی وجہ سے گورنر جنرل اس بات پر مجبور ہوا کہ ضروری اشیا مجلس قانون ساز کی منظوری سے نہیں، بلکہ اپنے غیر معمولی اختیارات کے ذریعہ حاصل کرے۔ بہت سے مجلس مقننہ کے مسلمان ممبر بھی جو کہ کانگریس کے ممبر نہیں تھے اس کارروائی میں کانگریسی ممبروں کے شریک ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہ بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ملک کے اندر بہت کچھ کشیدگی تھی لیکن مرکزی مجلس مقننہ میں ہندو اور مسلمان ممبروں کے مابین کسی حد تک اتحاد عمل باقی تھا۔

برطانوی حکومت نے پورے عزم کے ساتھ ان تمام تجاویز کی مخالفت کی جو دستور اساسی کے معاملات میں کسی قسم کی اصلاح کے متعلق تھیں۔ لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ حکومت زیادہ عرصہ تک اپنی اس مخالفت کو جاری نہیں رکھ سکتی اور یہ کہ جب تک کہ کسی نہ کسی طرح فرقہ دارانہ مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو اس وقت تک دستور اساسی میں ترقی اور اصلاح ناممکن تھی۔ اس غرض سے گوہاٹی کانگریس نے اپنی

ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ) کو اختیار دیا کہ ہندو اور مسلمان لیڈروں سے مشورہ کرکے ایسے ذرائع فوراً اختیار کرے کہ یہ ہندو مسلمانوں کے قابل صد افسوس اختلافات دور ہو سکیں شری شرینوا اس آئینگر نے جو کہ کانگریس کے صدر تھے ہندو مسلمان لیڈروں اور مرکزی مجلس مقننہ کے ممبروں کی کئی ایک بے ضابطہ کانفرنسیں منعقد کیں۔ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء کے ختم کے قریب دہلی میں چند مسلمان لیڈروں کا جلسہ ہوا اور تجاویز پیش کیں جو مسلم تجاویز کے نام سے موسوم ہوئیں۔ انہوں نے مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس مقننہ کے لئے مشترک انتخابات کا طریقہ حسب ذیل شرائط کے ساتھ منظور کر لیا۔

(ا) سندھ کو الگ ایک صوبہ بنا دیا جائے۔

(ب) شمال مغربی سرحد کے صوبے اور بلوچستان کو وہی درجہ مل جائے جو دوسرے صوبوں کا ہے۔

(ج) پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو، اور

(د) مرکزی مجلس مقننہ میں ان کی نمائندگی کا تناسب کل تعداد نمائندگان کی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔ اس کے بعد مئی اور اکتوبر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جو اجلاس ہوئے ان میں مسلمانوں کے یہ مطالبات معنوی لحاظ سے تسلیم کر لئے گئے اور ساتھ ہی ساتھ چند قاعدے اور قانون اس مسئلے کے مذہبی اور سماجی پہلو کے متعلق بھی بنا دئے گئے۔ کانگریس کا اگلا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا اور اس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظور کردہ تجاویز پاس کی گئیں۔ ایک دوسرے ریزولیوشن کے ذریعہ سے مجلس عاملہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ملک کی دوسری انجمنوں کی مقرر کی ہوئی اسی قسم کی کمیٹیوں کے ساتھ مشورہ کرکے سوراج کے دستور اساسی کی ترتیب کرے جو کہ حقوق کے اعلان کی بنیاد پر بنایا گیا ہو، اور اسے

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مخصوص اجلاس کے سامنے اور دوسری انجمنوں کے نمایندوں کے سامنے، نیز مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس مقننہ کے منتخب ممبروں کے سامنے بغرض منظوری پیش کرے۔ اسی ہفتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں کہ کونسل کو ایک ایسی سب کمیٹی بنانے کا اختیار دیا گیا جو کانگریس کی اور دیگر جماعتوں کی ورکنگ کمیٹیوں سے مل کر ہندستان کے لئے ایک دستور اساسی تیار کرے، اور اس مخصوص قومی اجلاس میں شریک ہو جو کانگریس طلب کرے۔ اس نے مذکورہ بالا مسلم مطالبات کا پھر ذکر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کو صرف اسی حالت میں چھوڑ سکتے ہیں کہ ان کے بقیہ سب مطالبات مان لئے جائیں۔ اس ریزولیوشن میں مدراس کانگریس کے ان فیصلوں کو بھی منظور کیا گیا تھا جو اس نے مذہبی شریعت کی آزادی، ضمیر کی آزادی، اور گائے اور باجے کے مسئلوں، اور شدھی اور تبلیغ کے مسئلوں سے متعلق کئے تھے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی کر دینا ضروری ہے کہ مسلم لیگ میں اس سال تفریق پیدا ہو گئی تھی، ایک حصہ نے اپنا اجلاس کلکتہ میں کیا تھا اور دوسرے حصے نے سر میاں محمد شفیعؒ کی صدارت میں لاہور میں کیا تھا۔ مندرجہ بالا ریزولیوشن کلکتہ والے حصۂ مسلم لیگ نے مولوی محمد یعقوبؒ کی صدارت میں پاس کیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح اس کلکتہ والی مسلم لیگ کے روح رواں اور رہنمائے کارواں تھے۔

اس مقام پر ان واقعات کا ذکر بھی بہت ہی برمحل ہوگا جن کی بدولت کانگریس اور لیگ کے ایک حصے کے درمیان پھر صلح اور دوستی ہو گئی، نیز جن کی بنا پر خود لیگ دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حکومت نے تمام آئینی ترقی کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اس زمانے میں لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) وزیر ہند کے عہدے پر متمکن تھے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۵ء کو انہوں نے لارڈ ریڈنگ (Lord Reading) وائسرائے ہند کو

اس آئینی کمیشن کی تاریخ بڑھانے کے لئے لکھا کہ جس کا تقرر حکومت ہند کے سنہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے مطابق ہوا تھا تاکہ وہ دس سال کی مدت ختم ہونے پر اصلاحات کے اثرات کے متعلق رپورٹ کرے۔ لارڈ برکن ہیڈ نے لکھا تھا کہ :-

"میں یہ پسند کروں گا کہ تم مجھے مشورہ دو اگر تم یہ دیکھو کہ ایسا کوئی موقع آگیا کہ اس آئینی کمیشن کو ایک منفعت بخش سودا کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، یا اس کے ذریعہ سے سوراج پارٹی کے اندر اور زیادہ پھوٹ ڈالی جا سکتی ہے .... اگر اس قسم کی پھوٹ بڑھ کر تمہیں اپنے آئینی کمیشن کی قیمت زیادہ دلا سکے تو پھر پورے طور پر اسے اس کام کے لئے استعمال کرو اور یہ یقین رکھو کہ برطانوی حکومت اس کام میں تمہاری پشت پناہی کرے گی"[۱]

لیکن سنہ ۱۹۲۷ء میں انگلستان کے اندر جو حالات رونما ہوئے ان کی بنا پر لارڈ برکن ہیڈ اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہو گئے "انگلستان میں عام انتخابات جو ہونے والے ہیں ان کے متعلق پیش اندازہ یہ ہے کہ منحوس ثابت ہوں گے۔ حکومت مزدور پارٹی کے ہاتھوں میں جاتی نظر آتی ہے، میں اس بات کا ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ سنہ ۱۹۲۸ء میں آئینی کمیشن کے لئے ممبروں کی نامزدگی ہمارے جانشینوں یعنی کرنل ویجوڈ (Colonel Wedgewood) اور ان کے احباب کے ہاتوں عمل میں آئے۔ ایسا ہوا تو سوراج پارٹی میں مزید تفریق ڈالنے کی تدبیر درہم و برہم ہو جائے گی"[۲]

---

[۱] برکن ہیڈ کی کتاب دی لاسٹ فیز" (The Last Phase) جلد دوم صفحہ ۲۵ کا حوالہ کے، بی، کرشنن کی کتاب پرابلم آف مائناریٹیز" (Problem of Minorities) صفحہ ۳۰۷۔ [۲] برکن ہیڈ صفحہ ۲۵۰۔۲۵۱ اتو لانند چکرورتی نے اپنی کتاب کمال اٹ پالیٹکس" میں حوالہ دیا ہے، صفحہ ۵۸۔

انھوں نے نومبر ۱۹۲۷ء میں آئینی کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اس کمیشن میں سات آدمیوں کو شریک کیا گیا اور انہی سات میں سے ایک سر جان سائمن اس کے صدر قرار پائے۔ اس کمیشن میں کسی ہندستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ مرکزی حکومت ہند کو دعوت دی جائے کہ وہ ایک مشترکہ منتخب کمیٹی کا تقرر اس مقصد کے لئے عمل میں لائے کہ وہ اس کمیشن کے سامنے اپنی رائیں پیش کرے۔ ہندستانیوں نے اسے اپنی تحقیر اور توہین خیال کیا کہ کمیشن میں کسی ہندستانی کو شریک نہ کیا جائے، اور یہ طے پایا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس بائیکاٹ پر صرف کانگریس ہی آمادہ نہیں ہوئی بلکہ ان مسلمانوں کی بھی ایک بہت بڑی جماعت نے یہی فیصلہ کیا جو غیر کانگریسی تھے، اور خلافت کمیٹی نے بھی، حتیٰ کہ وہ لبرل جماعت کے لوگ بھی بائیکاٹ کی تحریک میں شریک ہو گئے جن کی سیاسی معاملات میں بہت ہی اعتدال پسندانہ رائیں تھیں، اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں میں سے صرف وہی ایسے تھے کہ جنہوں نے اصلاحات کو قبول کر کے ان پر عمل کیا تھا جبکہ کانگریس ان اصلاحات کا بائیکاٹ کر چکی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اندر تفریق سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کے مسئلے پر، اور جداگانہ انتخابات کے مسئلے پر پیدا ہوئی تھی۔ لارڈ برکن ہیڈ ہندستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی عناد اور مخالفت کی قدر و قیمت اچھی طرح پہچانتے تھے، اور بہ حیثیت وزیر ہند کے انہوں نے اپنا یہ مشورہ الگزنڈر لارڈ ریڈنگ کو دیا:۔

"جس قدر بھی اس بات کو زیادہ واضح بنا دیا جائے گا کہ یہ آپس کی دشمنی بہت گہری اور حقیقی ہے اور آبادی کے بہ کثرت طبقے اس سے متاثر ہیں۔ اسی قدر یہ بات بھی زیادہ نمایاں ہوتی چلی جائے گی کہ ہم اور صرف ہم ہی ان سب پر زوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھے

سکتے ہیں[51]۔"

جب ہندستان میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا تو انہوں نے پھر وائسرائے ہند لارڈ اردن کو لکھا۔

"ہم نے ہمیشہ بائیکاٹ نہ کرنے والے مسلمانوں پر اور پست اقوام پر بھروسا کیا ہے، اور ان لوگوں پر جن کے تجارتی مفاد ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی جماعتوں پر کہ وہ بائیکاٹ کو ناکام بنا دیں گی۔ تم اور سائمن ہی اس بات کا صحیح اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا اس موقع پر یعنی کمیشن کی موجودگی کے دوران میں یہ مفید ہوگا یا نہیں کہ دشمنی کی دیوار کو شگافتہ کرنے کی کوشش کی جائے[52]۔"

انھوں نے پھر چند روز بعد فروری ۱۹۲۸ء میں وائسرائے کو لکھا کہ :-

"میں سائمن کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ کمیشن کی تمام منازل میں ان اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کرتے رہیں جو بائیکاٹ میں شریک نہیں ہیں بالخصوص مسلمانوں میں اور پست اقوام میں۔ میں ان کی مسلمانوں کے نمائندوں کے ساتھ ملاقاتوں کو بہت ہی زیادہ شہرت دی جانا پسند کروں گا۔ اب پوری حکمت عملی واضح ہو گئی ہوگی۔ اس شہرت دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کی کثیر التعداد آبادی کے دل پر یہ خوف طاری کیا جائے کہ کمیشن کو مسلمانوں نے اپنا دوست بنا لیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی ایسی رپورٹ لکھ دے کہ جس سے ہندوؤں کی حیثیت تباہ ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی ایک ٹھوس اور مضبوط حمایت بھی حاصل ہو جائے اور جناح دور بیٹھے ہوئے دیکھا کریں[53]۔"

---

[51] برکن ہیڈ صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶۔ بحوالہ کال اٹ پالیٹکس صفحہ ۵۷۔ [52] ایضاً صفحہ ۲۵۴۔
[53] برکن ہیڈ جلد دوم صفحہ ۲۵۵ بحوالہ کرشنن صفحہ ۳۰۰۔

اب اس میں کون سی تعجب انگیز بات ہے کہ سر محمد شفیع نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد چن کر لاہور میں ایک دوسری مسلم لیگ بنالی اور مسٹر جناح "دور بیٹھے دیکھتے ہی رہے" اور اپنی جائز اور صحیح مسلم لیگ کی قیادت کلکتہ میں دسمبر ۱۹۲۷ء کے موقع پر کرتے رہے جبکہ شفیع لیگ لاہور میں اپنا جلسہ کر رہی تھی۔

۱۹۲۸ء کے شروع میں کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کا ہندوستان کے لیے ایک دستور اساسی مرتب کرنے میں اشتراک عمل اس توہین و تذلیل کا نتیجہ تھا جو سائیمن کمیشن کے تقرر کے ذریعہ سے ہندوستانیوں کی کی گئی تھی۔ اور اس چیلنج کا بھی نتیجہ تھا جو لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو ایک ایسا دستور اساسی مرتب کرنے کے متعلق دیا تھا جو سب جماعتوں کے لیے قابل قبول ہو۔ آل پارٹیز کانفرنس جو کانگریس کے مندرجہ بالا ریزولیوشنوں کی بنا پر قائم ہوئی تھی وہ اس دستور اساسی کی ترتیب میں لگ گئی اور اس کا ایک بنیادی اور معتدبہ حصہ مرتب کر دینے کے بعد یہ کام ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کر دی جس کا نام نہرو کمیٹی کی رپورٹ مشہور ہو گیا۔ آل پارٹیز کانفرنس کے ایک جلسہ میں اس پر لکھنؤ میں بحث و تمحیص ہوئی اور اس کی منظوری کے بعد وہ آل پارٹیز کنونشن کے کلکتہ کے اجلاس میں دسمبر ۱۹۲۸ء میں پیش ہوئی۔ بہت سی دوسری طاقتیں اس دوران میں عمل کرتی رہی تھیں۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے نمائندوں سے بھی اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ چھٹ چھٹا کر یہ اختلافات صرف تین رہ گئے تھے

(۱) مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں کم از کم ایک تہائی نشستیں ملیں

(۲) جیسا کہ نہرو رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے کہ بالغوں کو حق رائے دہی ملنی چاہیے۔ اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس صورت میں پنجاب اور بنگال

میں مسلمانوںکو اپنی آبادی کے تناسب سے نشستیں ملیں اور زیادہ نہ ملیں اور دس برس کے بعد اس کی دوبارہ جانچ کی جائے

(۴) اختیارات صوبوں کی حکومتوں کو ہوں مرکزی حکومت کو نہ ہوں کنونیشن کے سامنے ان اختلافات کو ایک ریزولیوشن کی شکل میں مسٹر جناح نے پیش کیا تھا۔ ان پر ایک کمیٹی میں جوکہ اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی بہت ہی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں حتیٰ کہ بحث ہی بحث میں صبح ہوگئی لیکن پھر بھی اتفاقِ رائے نہ میسر ہوسکا اور کنونیشن نے ان تجاویز کو مسترد کردیا۔ اس کے بعد سے مسلم لیگ عملاً کنونیشن سے علیحدہ ہوگئی۔ اور اس کا اجلاس جو کلکتہ میں ہورہا تھا وہ کسی آیندہ تاریخ کے لیے ملتوی ہوگیا تاکہ صورتِ حالات پر غور کیا جاسکے

لیگ کا دوسرا بازو جس نے لاہور میں اپنا اجلاس کیا تھا اس زمانے میں بیکار نہ رہا۔ اس نے اپنے اس اجلاس میں کانگریس کا وہ ریزولیوشن مسترد کردیا جو مدراس میں اس نے پاس کیا تھا، اور اپنی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ ایک آئینی تجویز مرتب کرے اور دوسری جماعتوں سے مل کر ایک دستور اساسی ان اصولوں کے مطابق بنائیں جو لاہور کے اجلاس میں منظور کیے گئے تھے تاکہ اس دستور کو آئینی کمیشن کے سامنے رکھا جاسکے۔ ایک ریزولیوشن اس مضمون کا بھی پاس کیا گیا کہ جس کے ذریعہ سے صدر کو یہ اختیار دیا گیا کہ مسلمانوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرے تاکہ ان کے مختلف عناصر کو باہم متحد کیا جاسکے۔ لہٰذا ایک مسلم آل پارٹیز کانفرنس کو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو دعوت دی گئی۔ ہز ہائی نس آغا خاں جو ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا وفد لے کر لارڈ منٹو کے پاس گئے تھے۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے بلائے گئے، اور وہ آگئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلم آل پارٹیز کانفرنس

کی دعوت نامنظور کر دی۔ اس کانفرنس نے اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا کہ

(ا) ہندوستان کے حالات کے مناسب صرف ایک ہی طریق حکومت ہو سکتا ہے اور وہ وفاقی طرز حکومت ہے جس میں ان صوبوں کو کامل خود مختاری اور اختیارات ما بقیٔ حاصل ہوں کہ جو وفاق میں شامل ہوں، اور مرکزی حکومت صرف ان معاملات پر قابو اور اختیار رکھے جن سے تمام ملک کے مفاد وابستہ ہوں اور دستور اساسی کے ذریعہ سے اس کی سپردگی میں دئے جائیں۔

(ب) ایسے معاملات کے متعلق کہ جن کا تعلق مختلف فرقوں سے ہو کوئی مسودہ قانون، تجویز، تحریک یا ترمیم کسی مجلس قانون ساز میں خواہ وہ مرکزی ہو، یا صوبجاتی نہ پیش کی جائے۔ نہ اس پر بحث کی جائے اور نہ پاس کی جائے اگر وہ فرقہ جس پر اس کا اثر پڑتا ہو تین چوتھائی کی اکثریت سے اس کی مخالفت کرے۔

(ج) مسلمان مجالس قانون ساز میں اور دوسری قانونی مجالس میں جو اپنے نمائندے بھیجیں وہ ایسے ہوں جنہیں مسلمانوں کے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب نے منتخب کیا ہو اور اپنے اس حق سے مسلمان اپنی مرضی کے خلاف کبھی محروم نہ کئے جائیں۔ مسلمانوں کو مرکزی اور صوبجاتی ایوان حکومت میں ان کا جائز حصہ ملے مسلمانوں کی اکثریت پر ایسے صوبوں کی مجالس قانون ساز میں کوئی اثر نہ پڑے جن صوبوں میں ان کی آبادی کی اکثریت ہے اور جن صوبوں میں انکی آبادی کی اکثریت ہے اور جن صوبوں میں ان کی اقلیت ہے ان کی مجالس مقننہ میں ان کے نمائندوں کی نشستوں کی تعداد اس سے کم نہ کی جائے کہ جتنی آجکل ہے مسلمانوں کو مرکزی مجالس مقننہ میں ۱/۳ نشستیں ملیں

(د) سندھ کو ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے (س) شمال مغربی سرحد کا صوبہ اور بلوچستان کو وہی آئینی اصلاحات دی جائیں

جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہوں، انھیں سرکاری ملازمتوں میں کافی حصہ دیا جائے اور وہاں مسلمانوں کی تہذیب کی حفاظت کے لیے اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے، ان کی زبان، مذہب، شریعت، اوقاف کی بطرزِ احسن محافظت کی جائے اور سرکاری امداد میں سے انھیں کافی حصہ ملے۔

ریزولیوشن میں اس بات کا بھی اعلان زور کے ساتھ کیا گیا تھا کہ کوئی ایسا دستور اساسی خواہ وہ کسی کا بھی مجوزہ یا مرتب کردہ ہو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا جس میں اس ریزولیوشن کے اصولوں کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

مسٹر جناح نے اس بات کی کوشش کی کہ مسلم لیگ کی دونوں جماعتوں میں اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس میں باہمی مصالحت ہو جائے۔ مسٹر جناح نے لیڈروں کو مل کر ریزولیوشن کا ایک مسودہ بنایا کہ جس کی بنیاد پر سمجھوتا ہو سکے یہی وہ مسودہ تھا جس میں انہوں نے اپنے چودہ نکات رکھے تھے جو مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے لیے ضروری تھے۔ ان چودہ نکات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) آئندہ دستور اساسی کی تشکیل وفاقی ہو جس میں مابقیٰ اختیارات صوبوں کو دیئے جائیں

(۲) مختلف صوبوں کی خود مختاری کا معیار یکساں ہو

(۳) تمام مجالس مقننہ اور دیگر قانونی جماعتوں کی تشکیل اس بنیادی اصول پر کی جائے ان میں اقلیتوں کو کافی اور مؤثر نمایندگی حاصل ہو مگر اس حد تک کہ کسی صوبے کی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے یا دونوں برابر نہ ہو جائیں۔

(۴) مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نمایندگی لازمی طور پر ایک تہائی سے کم نہ ہونی چاہیئے۔

(۵) فرقہ وارانہ جماعتوں کے نمایندوں کا انتخاب جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے

ذریعہ ہوا کرے بشرطیکہ ہر فرقے کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ کسی وقت میں بھی جب وہ چاہے جداگانہ طریقۂ انتخاب کو چھوڑ دے اور مشترک انتخاب کا طریقہ اختیار کرے۔

(۶) صوبوں کی کوئی تقسیم از سر نو اس طرح نہ کی جائے کہ اس کا اثر، پنجاب، بنگال یا صوبہ سرحد کی مسلم اکثریت پر پڑے۔

(۷) تمام فرقوں کو اعتقادات کے متعلق، مذہبی عبادات کے متعلق، رسوم منانے کے متعلق، تبلیغ مذہب کے متعلق، میل جول کے متعلق اور تعلیم کے متعلق، کامل آزادی حاصل ہو۔

(۸) کوئی ایسا قانون، یا مسودۂ قانون، یا اس کا کوئی حصہ کسی مجلس مقننہ میں یا کسی اور منتخب مجلس میں پاس نہ کیا جائے۔ اگر کسی فرقے کے نمایندوں کی تعداد کا تین چوتھائی جو کہ اس مجلس میں ہے اسے اپنے فرقے کے لیے مضرت رساں خیال کر کے اس کی مخالفت کرے۔

(۹) سندھ کو صوبۂ بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

(۱۰) صوبۂ سرحد اور بلوچستان کو وہی اصلاحات دی جائیں جو دیگر صوبجات کو ملیں۔

(۱۱) دستور میں ایسی دفعات رکھی جائیں کہ مسلمانوں کو بحصۂ مناسب سرکاری ملازمتیں بشرط اہلیت مل سکیں۔

(۱۲) مسلمانوں کی تہذیب، تعلیم، زبان، مذہب، شریعت اور خیراتی اداروں کے تحفظ اور ترقی اور سرکاری امداد میں ان کے حصۂ مناسب کی ضمانت دی جائے۔

(۱۳) کوئی مرکزی یا صوبجاتی ایوان حکومت ایسا نہ بنایا جائے کہ جس میں مسلم وزراء کی تعداد ایک تہائی سے کم ہو۔

(۱۴) مرکزی مجلس مقننہ دستور اساسی میں کوئی تبدیلی ان ریاستوں کے اتفاق رائے کے بغیر نہیں کر سکتی کہ جو وفاق ہند میں شامل ہوں۔

(۱۴) مرکزی مجلس مقننہ دستور اساسی میں کوئی تبدیلی ان ریاستوں کے اتفاق رائے کے بغیر نہیں کر سکتی کہ جو وفاق ہند میں شامل ہوں۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جس حصہ مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح تھے اس میں قوم پرور مسلمانوں کی آواز غالب تھی۔ شفیع لیگ اپنے لاہور والے فیڈریشن پر قائم رہی اور عملاً مسلم آل پارٹیز کانفرنس کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ مسٹر جناح نے اپنے چودہ نکات کا جو ریزولیوشن بنایا تھا وہی ان مسلمانوں کا مطالبہ بن گیا کہ جو قوم پرور جماعت کے مسلمانوں کے حلقے کے باہر تھے۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات کو اپنی ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی نکات تقریباً سب کے سب مسٹر میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ تصفیہ یا کمیونل اوارڈ میں شامل کئے تھے۔ قوم پرور مسلمانوں اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے درمیان نہرو رپورٹ کو قبول کرنے کے متعلق اختلاف تھا۔ اول الذکر کا خیال تھا کہ اسے قبول کر لیا جائے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی کانگریس نے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ اگر حکومت برطانیہ نے نہرو رپورٹ کو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک منظور نہ کیا جس میں کہ ہندوستان کے لیے نوآبادی کے طرز حکومت کا ایک سال کے اندر مل جانے کا مطالبہ شامل ہے تو پھر کانگریس اس رپورٹ کو بالائے طاق رکھ کر کامل آزادی کا مطالبہ کرے گی۔ ۱۹۲۹ء میں ملک کے اندر بہت ہی بیداری رونما ہوئی۔ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ ارون نے کہ جو اس وقت تک مشورہ کی غرض سے انگلستان ہو آئے تھے، ایک اعلان کیا کہ جب سائمن کمیشن اپنی رپورٹ مرتب کر کے پیش کرے گا تو برطانی حکومت برطانوی ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے نمایندوں کو دعوت دیگی کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کر کے ہندوستان کے مسئلے پر تبادلہ خیالات کریں اس اعلان میں یہ بھی مذکور تھا کہ مجھے یہ واضح کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اُن (حکومت برطانیہ) کے

اندازہ کے مطابق ۱۹۱۷ء کے اعلان میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ ہندوستان
کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ جیسا کہ اعلان میں سمجھا گیا ہے ہندوستان کو نوآبادیات کے
درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔" چونکہ اعلان کے اس حصے نے شبہ میں ڈال دیا کہ شاید کانفرنس
کے انعقاد کا مقصد ہندوستان کے لیے صرف نوآبادیات کے طرز پر دستور اساسی
بنانا ہے، اس لیے لیڈروں کی ایک کانفرنس نے جس کا انعقاد دہلی میں ہوا تھا۔
اس مسئلے کے صاف کئے جانے کا مطالبہ کیا، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لعل نہرو
پریزیڈنٹ پٹیل، سر تیج بہادر سپرو، اور مسٹر جناح ۲۳۔ دسمبر کو لاہور کے انڈین نیشنل
کانگریس کے اجلاس کے دن وائسرائے سے ملے۔ وائسرائے اس کے لیے تیار
نہ تھے کہ یہ اطمینان دلا دیں کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد کی غرض درجہ نوآبادیات
کی تجویز مرتب کرنا تھی۔ کانگریس اپنے کلکتہ کے اجلاس میں جو ریزولیوشن پاس کر چکی
تھی اس کے مطابق اس نے یہ اعلان کر دیا کہ کانگریس کے دستور اساسی کی دفعہ ۱
میں لفظ سوراج کے معنی مکمل خود مختاری ہوں گے اور یہ کہ نہرو رپورٹ کی تجویز پر
تمادی عارض ہو چکی۔ اس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا کہ سول نافرمانی کا
ایک پروگرام مرتب کرے جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی بھی شامل ہو یہ سول
نافرمانی آئندہ مارچ کے مہینے سے شروع کی گئی اور ایک سال تک جاری رہی
سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۹۳۰ء کے وسط کے قریب پیش کی اور پہلی گول میز
کانفرنس اگلے خزاں کے موسم میں بلائی گئی اور اس کا اجلاس لندن میں ہوا۔ کانفرنس
کے اجلاس میں کانگریس کے نمائندوں نے شرکت نہ کی۔ گول میز کانفرنس میں جو
لوگ شریک ہوئے ان میں برطانوی ہند کے نمائندے تھے جن میں مسلمان
اور دیسی ریاستوں کے نمائندے تھے۔ اس نے ہندوستان کے لیے ایک
وفاقی دستور اساسی کا فیصلہ کیا جس میں برطانوی ہند کے صوبے شریک ہوں یا وہ

ریاستیں یا ریاستوں کے مجموعے کہ جو اس کی شرکت پسند کریں۔ اس لئے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا اور صوبۂ سرحد میں اصلاحات کے رواج کی سفارش کی۔ جداگانہ اور مشترک انتخابات کے طریقوں پر بھی اظہار رائے کیا گیا، اور یہ معلوم ہوا کہ وہ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنے کی حمایت میں ہیں۔ اور اس وقت تک اسے منسوخ کرنا پسند نہیں کرتے کہ جب تک یہی جماعتیں ایسا نہ چاہیں، وفاقی حکومت اور اس میں شامل ہونیوالے صوبوں کے اختیارات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی اور الگ الگ فہرستوں میں ان کے یہ اختیارات تقسیم کئے گئے، لیکن اختیارات کا پورے طور پر فیصلہ نہوا اور نہ اسی کے متعلق فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کے نمائندوں کی وفاقی مجلس قانون ساز میں تعداد کیا ہو۔

پہلی گول میز کانفرنس کے بعد حکومت کی طرف سے لارڈ ارون وائسرائے ہند اور کانگریس کی جانب سے مہاتما گاندھی کے درمیان عارضی صلح ہو گئی جس سے اس بات کے لیے راستہ کھل گیا کہ دوسری گول میز کانفرنس میں جو کہ ۱۹۳۱ء کے موسم خزاں میں ہونے والی تھی کانگریس بھی حصہ لے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں بنارس، کانپور، اور بعض دیگر مقامات پر بہت سخت ہندو مسلم فسادات ہوئے قوم پرور مسلمانوں نے اپنی انجمن بنالی تھی جس کا نام نیشنلسٹ مسلم کانفرنس تھا۔ اس کانفرنس کے اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے درمیان کہ جس نے جہاں تک کہ پروگرام کا سوال ہے مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس دونوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، صرف انتخابات کے مسئلے پر اختلاف تھا، اول الذکر مشترک انتخابات کے حامی تھے اور موخر الذکر جداگانہ انتخاب چاہتے تھے، مسلم نیشنلسٹ کانفرنس نے سر علی امام کی صدارت میں اپریل ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ کے مقام پر اپنا اجلاس منعقد کیا اس اجلاس میں علی امام نے کہا کہ اگرچہ میں خود ایک زمانہ میں سیاسی خیالات کے اسی ادارے سے تعلق رکھتا تھا جو شدت کے ساتھ جداگانہ انتخاب کا حامی ہے اور

فی الحقیقت میں اس وفد میں بھی شریک تھا جس نے لارڈ منٹو سے ملاقات کی تھی لیکن مزید غور و فکر کے بعد اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جداگانہ انتخابات سے صرف یہی نہیں کہ ہندوستانی قومیت کی نفی ہوتی ہو، بلکہ وہ تو خود مسلمانوں کے لیے قطعی طور پر مضرت رساں ہیں۔ اس کانفرنس نے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ دستور اساسی میں بنیادی حقوق کا ایک اعلان ہونا چاہیئے جس میں تہذیب، زبان، اور شخصی قانون وغیرہ کے تحفظ کی ضمانت ہونی چاہیئے، اور یہ کہ وہ ایک وفاقی دستور اساسی ہونا چاہیئے جس میں ماتبقے اختیارات ان صوبوں کو دئے جائیں جو وفاق میں شامل ہوں اور یہ کہ سرکاری عہدوں پر پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ تقرر ہوا کرے جس میں قابلیت کا معیار کم سے کم ہو اور کوئی اقلیت عہدوں سے محروم نہ رہنے پائے اور یہ کہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور شمال مغربی سرحد اور بلوچستان میں بھی حکومت کا وہی طریقہ رائج کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں ہو۔ جہاں تک وفاقی اور صوبجاتی مجالس مقننہ کی نمایندگی کا تعلق تھا اس ریزولیوشن میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ ہر بالغ مرد اور عورت کو حق رائے دہی حاصل ہو، انتخابات مشترک ہوں اور آبادی کی بنیاد پر ان اقلیتوں کے لیے جن کی آبادی تیس فیصدی سے کم ہو نشستیں محفوظ کر دی جائیں اور ان کو یہ حق بھی حاصل ہو کہ مزید نشستیں حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کریں۔ ایک کوشش یہ بھی کی گئی کہ مسلم آل پارٹیز کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے درمیان مفاہمت ہو جائے لیکن یہ سعی مشکور نہ ہوئی۔ دونوں جماعتوں کی ایک مشترک کانفرنس کے انعقاد کے لیے ۲۲۔ جون ۱۹۳۱ء کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور شملہ کا مقام تجویز ہوا تھا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے یہ بیان دیا تھا کہ یہاں پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ شملہ کی فضا کسی سمجھوتے

کے لیے بہت ہی ناموافق ہے ۔ افسوس ہے کہ جو خطرات ہمیں لاحق تھے وہ بہت ہی صحیح نکلے ۔ شملہ کا بدبخت ماحول اور بیرونی اثرات جن سے عوام اس حد تک آگاہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کی تشریح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ان قوتوں کے مقابلہ میں جو اتحاد کے لیے کوشاں تھیں بہت زیادہ قوی اور مضبوط ثابت ہوئے اور تمام ایسی کوششوں پر پانی پھر گیا جو دونوں جماعتوں کے متحد کرنے کے لیے کی گئیں ،، [1]

دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے کانگریس کی طرف سے تنہا مہاتما گاندھی نمایندہ بنا کر بھیجے گئے ۔ برطانوی حکومت نے برطانوی ہندوستان سے نمایندے نامزد کر کے بھیجے تھے جن میں بہت سے مسلمان شامل تھے لیکن ڈاکٹر انصاری کا نام مسترد کر دیا گیا جو مہاتما گاندھی نے تجویز کیا تھا۔ گول میز کانفرنس نے جو کمیٹیاں مقرر کی تھیں ان میں سے ایک اقلیتوں کی کمیٹی بھی تھی جس کے سپرد یہ کام تھا کہ اقلیتوں کے مسئلے کی چھان بین کرے یہ کمیٹی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکی ، اور دوسری گول میز کانفرنس بھی اس مسئلے کا کوئی آخری فیصلہ کئے بغیر ختم ہو گئی اور لازمی طور پر بہت سے دیگر معاملات کا بھی تصفیہ نہ ہو سکا ۔ اس ناکامی پر کسی ہندوستانی کو بھی تعجب نہ ہوا کچھ قوتیں پس پردہ کام کر رہی تھیں جنھوں نے فیصلہ کو ناممکن بنا دیا تھا۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن Mr. Edward Thomson لکھتے ہیں :-

"گول میز کانفرنس میں بالکل ظاہری طور پر بعض نامصالحت پسند مسلمانوں اور بعض خصوصیت کے ساتھ جمہوریت کے مخالف انگریزی حلقوں کے

---

[1] " اینوال رجسٹر " Annual Register بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۰۵

درمیان معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ اسی دوستی اور سمجھوتہ کے متعلق ہندوستان میں وثوق کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی کے راستے میں حقیقی رکاوٹ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ بڑی حد تک سچ ہے اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ گذشتہ زمانے میں ہم ہندوستان میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے طریقے پر عمل کرتے رہے ہیں۔ وارن ہیسٹنگس Warren Hastings کے زمانے سے بعد کے زمانے تک لوگ اس مسرت سے لطف اٹھانے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے تھے جو ہندو مسلمانوں کے جھگڑے سے انھیں حاصل ہوتی تھی حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے بھی جیسے کہ ایلفنسٹن، اور میلکوم، اور مٹکاف تھے انگریزوں کے حق میں ان جھگڑوں کو مفید بتایا ہے" [1]

"مسٹر ریمزے میکڈونلڈ Mr. Ramsey Macdonald نے جو اس زمانے میں وزیر اعظم تھے دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کو مجتمع کر کے یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ایک فیڈرل وفاقی حکومت کے اصول کی حامی ہے بعض تحفظات کے ساتھ کہ آئندہ گورنروں کے صوبجات میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے اور لوگوں کو بیرونی مداخلت اور بیرونی فرماں روائی کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اپنی مخصوص پالیسی سے کام لے سکیں۔ نیز یہ کہ شمال مغربی سرحد

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب انیلسٹ انڈیا فار فریڈم Enlist India for Freedom صفحہ ۵۰

کے صوبے کی بھی دوسرے اس قسم کے صوبوں کی طرح سیاسی تعمیر کی جائے، اور سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اگر ایسے ذرائع مہیا ہو سکیں کہ اس کی مالی حالت درست رہ سکے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق انھوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ گتھی ترقی کی راہ میں ایک بڑی خوفناک رکاوٹ بن گئی ہے لیکن ملک معظم کی حکومت یہ طے کر چکی ہے کہ اس نا اہلی کو بھی ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے اس کا یہ مطلب ہے کہ ملک معظم کی حکومت کو نہ صرف اس مسئلہ کا تصفیہ آپ کے لیے کرنا پڑے گا کہ آپ کی نمائندگی کا کیا طریق ہو بلکہ نہایت دانشمندی اور انصاف کے ساتھ اس کا بھی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ دستور اساسی میں ایسی کون سی روک اور ایسا کونسا پاسنگ رکھا جائے کہ اقلیتوں کو اکثریت کے اس بے روک ٹوک ظلم سے محفوظ رکھا جا سکے جو محض اکثریت حاصل ہونے کی بنا پر اصول جمہوریت برتنے کی بدولت ہو سکتا ہے۔" ؎

اس اعلان کے بعد قدرتی طور پر کمیونل اوارڈ ملنا ہی تھا، اور وہ اگست ۱۹۳۲ء میں مل گیا۔ اس تجویز کا دائرۂ عمل ان انتظامات تک محدود تھا جو برطانوی ہند کے فرقوں کی صوبجاتی اسمبلیوں میں نمائندگی کیلیے کیے گئے تھے، اور مرکزی مجلس مقننہ کے لیے نمائندگی کے مسئلہ پر غور کرنا اس وقت ملتوی رکھا گیا تھا، کیونکہ مرکزی مجلس کے لیے کچھ کرنے میں دیسی ریاستوں کا بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا جو مزید بحث کا محتاج تھا۔ یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ ایک مرتبہ مختلف فرقوں کے طریق نمائندگی اور

تناسب نمایندگی کا اعلان ہو جانے کے بعد مختلف فرقے خود ہی فرقہ وارانہ مسئلوں کے متعلق گذر بسر کا کوئی راستہ نکال لیں گے۔ اگر حکومت ہند کے نئے ایکٹ کے قانون کی شکل اختیار کرنے سے پیشتر حکومت کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مختلف فرقے باہم اس پر متفق ہیں کہ بدلے کی تجویز انہیں مل جائے تو حکومت اسوقت پارلیمنٹ سے سفارش کرے گی کہ کمیونل اوارڈ میں جو دفعات ہیں انکا بدل دے دیا جائے۔ کمیونل اوارڈ کے ذریعے مسلمانوں کو، یورپینوں کو اور سکھوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اپنے جداگانہ حلقہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمایندے منتخب کریں بمبئی کے بعض منتخب حلقہ ہائے انتخاب میں مرہٹوں کے لیے نشستیں مقرر کردی گئی تھیں۔ اچھوتوں کے لیے نشستیں دی گئی تھیں جن کے پُر کرنے کے لیے مخصوص حلقہائے انتخاب میں سے انتخاب ہونا قرار پایا تھا جس میں صرف وہی لوگ رائے دے سکتے تھے۔ اچھوتوں کو عام حلقہ انتخاب میں بھی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ ہندوستانی عیسائیوں کو بھی نشستیں دی گئی تھیں جن کو پُر کرنے کے لیے رائے دینے والے مختلف فرقوں کے حلقہائے انتخاب سے رائے دے سکتے تھے اور اسی طرح اینگلو انڈین جماعت کے لیے قاعدہ تھا۔ نشستوں کی کچھ تعداد عورتوں کے لیے مختص کردی گئی تھیں جو مختلف فرقوں کے مابین منقسم تھی۔ ان کے علاوہ کچھ نشستیں مزدوروں کو دی گئی تھیں اور ان کی مسند پُری مزدور حلقۂ انتخاب کے ذریعہ ہونا قرار پایا تھا۔ تجارت اور صنعت اور کانوں وغیرہ کے لیے مخصوص نشستیں دی گئی تھیں جن کی مسند پُری ایوانہائے تجارت اور دوسری انجمنوں کی جانب سے ہوتی تھی۔ اسی طرح زمینداروں کو جو نشستیں ملی تھیں ان کی مسند پُری زمینداروں ہی کے حلقہ انتخاب میں سے عمل میں آتی تھی۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو فرقہ وارانہ جماعتوں میں تقسیم

کر دینے کا کام جو مارلے منٹو اصلاحات کے ذریعہ شروع ہوا تھا وہ اب بہت کچھ بڑھ گیا اس سے بھی بڑھ گیا کہ جتنا مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نے اس میں اضافہ کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں حلقۂ انتخاب دس حصّوں پر منقسم ہوا تھا اور اب اس کے سترہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں۔ عورتوں اور عیسائیوں کے سر بھی جداگانہ حلقہائے انتخاب تھوپ دیے گئے۔ ہندؤں کے فرقے کو اس میں اچھوتوں کو علیحدہ حلقۂ انتخاب دے کر کمزور کر دیا گیا تقسیمیں مذہب کی بنیاد پر کی گئیں، پیشوں کی بنیاد پر کی گئیں، اور نوکریوں کی بنیاد پر کی گئیں، جہاں جہاں سے بھی ٹکڑا نکالا جاسکتا تھا نکال کر چھوڑا۔ ۹ھ

مختلف فرقوں کو جو نشستیں دی گئیں ان کی تقسیم بھی عجیب تھی۔ فرقہ وارانہ مسئلہ پر جتنی بحثیں ہوتی تھیں ان میں پنجاب اور بنگال کے مسئلے مشکلات پیدا کر دیتے تھے۔ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن یہ اکثریت بہت مختصر سی اکثریت یعنی تقریباً ۵۰ فیصدی کی مسلمانوں کی جانب سے ان دونوں صوبوں کے متعلق اکثریت میں ہونے کے باوجود یہ مطالبہ تھا کہ جداگانہ طریق پر انتخاب کیا جائے اور ان کی نشستیں بھی مخصوص ہوں۔ بنگال میں صورتِ حال اس وجہ سے اور بھی پیچیدہ ہوگئی تھی کہ حکومت یہ چاہتی تھی کہ یوروپینوں کو ان کی حیثیت متوازن کرنے کی غرض سے زیادہ نشستیں دی جائیں اور پنجاب میں یہ صورت تھی کہ غیر مسلم دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے یعنی ہندو اور سکھ، سکھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اگر انتخابات جداگانہ رکھے جاتے ہیں اور نشستیں مخصوص ہوتی ہیں تو انھیں ایک بڑی اور اہم اقلیت ہونے کی بنا پر رعایتی نشستیں ملنی چاہئیں اسی طرح کہ جس طرح مسلمانوں کو اپنی اقلیت والے صوبوں میں ملی ہیں۔

کمیونل اوارڈ نے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں کی نشستوں کا بنگال اور پنجاب کے علاوہ سب صوبوں میں وہی تناسب برقرار رکھا کہ جو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نے انھیں دیا تھا۔ ہندوؤں کی اقلیت بنگال میں ۴۴٫۸ فی صدی کی تھی انھیں دو سو پچاس نشستوں میں سے کل اسّی نشستیں ملیں یعنی کل آبادی کا صرف تیئس[۳۲] فیصدی۔ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۴٫۸ فی صدی تھا۔ انھیں کل ایک سو انیس نشستیں دی گئیں یعنی کل آبادی کا ۴۷٫۶ فی صدی۔ یورپین جن کی آبادی کا تناسب ۰٫۰۱ فی صدی تھا انھیں پچیس نشستیں عطا ہوئیں یعنی نشستوں کی کل تعداد کا دس فی صدی۔ اس تشریح سے ظاہر ہے کہ مسلمان جو اکثریت میں تھے ان کو گھٹا کر اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا، ہندو جو اقلیت میں تھے انھیں انکا جائز حق بھی نہ ملا۔ تاکہ یورپینوں کو اپنی آبادی کا ڈھائی لاکھ گنا پاسنگ دیا جاسکے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ یورپینوں کو دینے کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں کی نشستیں کم کی گئی تھیں لیکن جس فرقے کی زیادہ نشستیں کاٹی تھیں وہ ہندو تھے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دوسرے صوبوں کے برخلاف پاسنگ جو سب سے چھوٹی اقلیت کو ملا وہ صرف اکثریت کی نشستوں میں سے کٹ کر نہیں ملا بلکہ ایک دوسری اقلیت کی نشستوں میں سے بھی دیا گیا جسے نہ صرف اپنے اس حق کی قربانی کرنی پڑی کہ جو وہ اقلیت میں ہونے کی حیثیت سے لیتی بلکہ اکثریت والے فرقے کی بہ نسبت زیادہ قربانی کر کے اسے اپنی نشستیں چھوڑنی پڑیں۔ پنجاب میں بھی اس کام کے لیے ہندو ہی منتخب ہوئے کہ اپنے حق کی نشستوں میں سے چند سکھوں کو پاسنگ کی غرض سے دیں حالانکہ وہ یہاں بھی اقلیت میں تھے اور قانون اور انصاف کے رو سے خود پاسنگ لینے کے حقدار تھے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمانوں کے ان دونوں اکثریت کے صوبوں میں ان کے نمایندوں کی تعداد کو اس حد تک ضرور

گھٹا دیا گیا تھا کہ وہ کل نشستوں کی تعداد کے تناسب سے اقلیت میں رہ جائیں اگر
چہ مجلس مقننہ کے اندر ان کے نمایندوں کی جماعت سب سے بڑی جماعت تھی۔
اور ان کی نشستیں ان کے لیے مخصوص بھی تھیں اور انتخاب کا طریقہ بھی جداگانہ تھا۔
ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی کہ ہندوؤں نے اس کمیونل اوارڈ
پر بڑی شدت سے حملہ کیا جن سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں
بھی قربانی کریں اور اپنی اقلیت کے صوبوں میں بھی اور بنگال میں تو جو قربانی اس
سے طلب کی گئی تھی وہ اس سے بہت زیادہ یعنی تقریباً دگنی تھی جتنی کہ اکثریت
والے فرقے کو کرنی پڑی۔ حکومت کے لیے یہ مخالفت غیر متوقع نہ تھی اور اس سلسلے
میں حکومت ہند کا جو کمیونکے شائع ہوا اس میں یہ تحریر تھا "اس بات کے پیش نظر
کہ اس جھگڑے کے ہر فریق نے اس سے زیادہ نشستوں کا مطالبہ کیا ہے کہ جتنی پر
دوسرا فریق رضامند ہو سکتا ہے۔ یہ لازمی ہے کہ فیصلے کے شمار و اعداد بہر صورت
اس سے کم ہی رہیں کہ جس قدر اس نے طلب کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فیصلہ
جس قدر زیادہ مساوات پر مبنی ہو گا اسی قدر زیادہ اس سے سب کو مایوسی ہوگی۔
لیکن چونکہ حکومت برطانیہ اس معاملہ میں بالکل بے تعلق ہے اور اس کی اپنی کوئی
دلچسپی اس قضیے سے نہیں ہے، اور کمیونل اوارڈ پیش کر کے وہ اپنی طرف سے
انتہائی کوشش کر رہی ہے کہ اس مشکل ترین مسئلے کا حل نکال دے، اس لیے
وہ توقع کرتی ہے کہ ہندوستانی اسے اسی حوصلے کے ساتھ قبول کریں گے۔
کہ جس حوصلے کے ساتھ وہ پیش کیا گیا ہے، اور ایمانداری کے ساتھ اس کے مطابق
عمل کریں گے۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ہے کہ وزیر ہند نے اس بات کا وعدہ کیا تھا
کہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے پاس ہونے سے پیشتر مختلف ہندوستانی
فرقے بطور خود آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں کہ جو اس سے مختلف ہو تو وہ خوشی سے

اسے منظور کریں گے۔"

برطانوی حکومت اور بالکل بے تعلق، کس قدر بجا ارشاد ہوا! یہ برطانیہ کی بے تعلقی ہی تو تھی جس نے ہر مقام پر اسے ہندؤں کے ستانے پر ابھارا۔ انکی نشستیں بنگال میں چھین لیں حالانکہ وہ اقلیت میں تھے اور مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کی نشستیں زیادہ چھینی گئیں اور یہ سب کس لیے کیا گیا تھا۔ صرف اسلئے کہ یورپینوں کو زیادہ نشستیں حاصل ہو جائیں اور پھر زیادہ بھی کس قدر! ڈھائی لاکھ گنی زیادہ۔ اسی بے تعلقی سے مجبور ہو کر اس نے پنجاب میں سکھوں کو پاسنگ کی وہ نشستیں نہ دیں جو دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو دی گئی تھیں اور اسی بے تعلقی کے باعث سے یہ ہوا کہ مسلمانان پنجاب کو یہ رعایت دی گئی کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود ان کی نشستیں مخصوص، اور ان کا حلقۂ انتخاب جداگانہ۔ اب ایسے حالات ملک کے اندر پیدا کر کے کہ فرقہ وارانہ سمجھوتا ناممکن ہو جائے۔ برطانوی حکومت ہم سے یہ وعدہ کرنے چلی ہے کہ اگر مختلف فرقے باہمی سمجھوتے کی کوئی دوسری راہ نکال لیں تو حکومت اس نعم البدل کو خوشی کے ساتھ منظور کرے گی۔ حکومت کس قدر بے تعلق ہے!

برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے معاملے میں دیکھیے تو ۱۹۳۵ء کا قانون بھی دیسی فرماں رواؤں کے حق میں بہت فیاضانہ ہے لیکن یہ حلوائی کی دکان والی فیاضی ہے۔ برطانوی ہند سے چھین کر دیسی فرماں رواؤں کو حقوق دیئے گئے ہیں۔ دیسی ریاستوں کی آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے ۲۴ فی صدی ہے لیکن ان کے فرماں رواؤں کو زیریں ایوان میں ۳۳ فی صدی، اور وفاق کے بالائی ایوان میں ۴۰ فیصدی نشستیں عطا ہوئی ہیں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ وفاقی مجلس مقننہ میں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق اور اختیار ریاستوں کی رعایا کو نہیں بلکہ

یہ اختیار صرف فرماں رواکی ذات تک محدود ہے۔ اسی طرح ایسی ریاستوں کی یا زیادہ صحیح لفظوں میں، دیسی حکمرانوں کی آڑ لے کر حکومت نے اپنے لیے وفاقی حکومت کے زیریں ایوان میں تینتیس فی صدی نشستوں کے لیے نامزدگی کا حق قائم رکھا ہے درحالیکہ اس کا نام انتخابات کے ذریعہ نمایندگی ہے۔ ایک ہاتھ سے لیکر دوسرے ہاتھ سے دیدینے کا اس سے زیادہ عیارانہ طریقہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا جبکہ وہ عطا وبخشش بھی محض ظاہری ہو۔

اس کمیونل اوارڈ کے بعد بھی ہندوستان میں فرقہ وارانہ سمجھوتے کی ایک کوشش کی گئی اور یہ کوشش تقریباً کامیاب ہوگئی تھی کہ پھر ایک مرتبہ اسی بے تعلق برطانوی حکومت نے اس میں ٹانگ اڑادی جیسا کہ واقعات کے ذکر سے واضح ہو جائے گا۔ کمیونل اوارڈ کا اعلان ۱۶ راگست ۱۹۳۲ء کو ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی کے برت اور معاہدہ پونا کے مطابق اوارڈ کی ترمیم کے بعد کہ جس کا اثر اچھوتوں پر پڑتا تھا۔ پنڈت مالویہ اور مولانا شوکت علی کے درمیان گفت وشنید، جاری ہوئی کہ کمیونل اوارڈ کا بدل پیدا کیا جائے۔ ابتدائی گفت وشنید بہت امید افزا معلوم ہوئی اور مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے درخواست کی کہ مہاتما گاندھی کو رہا کردیا جائے یا کم از کم ایسی آسانیاں مہیا کردی جائیں کہ جیل میں ان سے ملاقاتیں کی جاسکیں تاکہ اس صلح کی گفت وشنید میں مدد ملے۔ یہ درخواست ۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو کی گئی تھی۔ ۷۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے صدر کا یہ اعلان شائع ہوا کہ اب پھر سے جداگانہ اور مشترک انتخاب کے سوال کو اٹھانا بہت ہی بے موقع ہوگا اور مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کو چھوڑ دیں، لیکن وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر اکثریت والے فرقے کی جانب سے اس قسم کی تحریک ہو تو وہ ان قطعی تجاویز پر غور کرلیں جن میں تمام ضروری اور اہم

کے پرائیویٹ سکریٹری نے مولانا شوکت علی کے تار کا یہ جواب دیا کہ "آپ کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس بات کا یقین حاصل کریں کہ جس کام کا ارادہ آپ کر رہے ہیں اس میں آپ کو تمام مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں آپکو اس بیان کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو کہ ۷ر اکتوبر کے اخبارات میں مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے صدر کی جانب سے شائع ہوا ہے، نیز دوسرے بیانات کی طرف بھی۔"[1]

اب تو اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہ بتایا جائے کہ مولانا شوکت علی کے ۲ر اکتوبر والے تار کا جواب وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے اس وقت تک نہ دیا جب تک کہ مسلم آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے ۷ر اکتوبر کے اخبارات میں بیان شائع نہ ہو گیا، اور پھر تار کا جواب جو ۹ر اکتوبر کو بھیجا گیا اس میں اسی بیان کیطرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ دوبارہ ۲۶ر اکتوبر کو مولانا شوکت علی نے جب وہی درخواست کی اور وائسرائے سے یہ بھی استدعا کی کہ وہ تمام متعلقہ جماعتوں پر اپنا اثر ڈالیں تاکہ امن و صلح قائم ہو سکے جس سے سب کو فائدہ پہنچے تو فوراً ۲۷ر اکتوبر ہی کو اس کا یہ جواب آگیا کہ جب تک مسٹر گاندھی سول نافرمانی کو پورے طور پر ترک نہ کریں گے۔ اس وقت تک آپ کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ کوشش کی گئی کہ مہاتما گاندھی سے ملاقات ہی کی اجازت مل جائے تو صرف یہ جواب ملا کہ ۲۷ر اکتوبر کو جو خط بھیجا جا چکا ہے اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ ان سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں مل سکتی۔

حکومت کے طرزِ عمل سے ہمت نہ ہار کر ۱۶ر اکتوبر کو لکھنؤ میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی گئی اور اس میں بالاتفاق یہ ریزولیشن پاس کیا گیا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی اس تجویز کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ کانفرنس کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں سے ملاقات کرے اور

---

[1] اینول رجسٹر Annual Register ۱۹۳۲ء جلد دوم صفحہ ۲۰۲-۱۰۱

پھر اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر بھی عمل میں آگیا کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کے ایک متفق علیہ حل کے متعلق گفت و شنید کرے۔ یونٹی کانفرنس (انجمن اتحاد) نے الہ آباد میں اپنے اجلاس ۳ نومبر کو شروع کر دیئے۔ اس میں ۶۳ ہندو، ۱۱ سکھ، ۲۹ مسلمان، ۲ اور دیسی عیسائی شریک تھے۔ اس کمیٹی نے روزانہ اپنے اجلاس جاری رکھے اور متعدد ریزولیوشن پاس کئے جن کا تعلق ان مسائل سے تھا کہ جن میں اختلاف موجود تھا یا اختلاف ہو سکتا تھا۔ بنگال اور پنجاب کے سخت پریشان کن مسئلوں کے متعلق بھی جہاں تک کہ ہندو مسلمانوں سے اس کا تعلق تھا اتفاق رائے حاصل ہو گیا۔ ہندوؤں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ مسلمانوں کو صوبے کی اسمبلی میں ۵۱ نشستیں مل جائیں اگر طریقۂ انتخاب مشترک ہو۔ اس کے متعلق بھی ایک فارمولا بن گیا کہ آیا اختیارات ماتبقی مرکز کے سپرد ہوں یا کہ وفاق میں شامل ہونے والے صوبوں کو تفویض کئے جائیں ایک دوسرا فارمولا بنا جس میں کہ مشترک انتخابات کا طریقہ تسلیم کیا گیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ امیدواروں کو اپنی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے مخصوص فرقے کی رایوں میں سے کم سے کم تیس فی صدی رائیں اپنے حق میں حاصل کریں، اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہ امیدوار کامیاب سمجھا جائے گا کہ جس نے اپنے فرقے کی سب سے زیادہ رائیں حاصل کی ہیں۔ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نمایندگی کے متعلق بھی فیصلہ ہو گیا اور بتیس ۳۲ فی صدی نشستیں انھیں مل گئیں۔ دونوں فریقوں کو بعض باتوں میں کچھ چھوڑنا پڑا تھا اور بعض میں انھیں کچھ زیادہ مل گیا تھا۔

لیکن ایک معاملہ ایسا بھی تھا کہ جس کے متعلق صرف ہندو مسلمانوں کا اتفاق رائے کام نہ دے سکتا تھا اور وہ معاملہ اس پاسنگ کا تھا جو صوبہ بنگال میں یورپینوں کو ملا ہوا تھا۔

معاملات جس طریقے پر طے ہوئے تھے اس کے مطابق سب نشستوں کا ۹۵٫۷ فی صدی حصہ ہندو مسلمانوں میں نکل جاتا تھا اور اس طرح یوروپینوں کے لیے دس فیصدی کسی طرح نہ بچ سکتا تھا جو کہ انھیں حاصل تھا۔ اس لیے یہ طے پایا کہ ہندو اور مسلمان مل کر کلکتہ میں یوروپینوں سے اس مسئلہ پر بات چیت کرلیں اور اس طرح الٰہ آباد میں اپنا اجلاس ختم کرکے کانفرنس ملتوی ہوگئی۔

یہ بات ابھی فراموش نہ ہوئی ہوگی کہ میکڈونلڈ ایوارڈ نے مسلمانوں کی مرکزی مجلس مقننہ میں نمائندگی کے مسئلے کو طے کئے بغیر چھوڑ دیا تھا اور سندھ کے متعلق یہ کہہ دیا تھا کہ اگر اس کی مالی حالت کو قابل اطمینان بنایا جاسکا تو اسے علیحدہ صوبہ بنایا جائیگا۔ ابھی پنڈت مالویہ اور ان کے ہمراہ مسلم نمائندے کلکتہ کے راستے ہی میں تھے کہ وہاں جاکر یوروپینوں سے ان کی رعایتی نشستوں کے متعلق بات چیت کریں کہ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوگئی کہ سر سیموئیل ہور نے ان سے پہلے ہی یہ اعلان کرکے صورت حالات پر قبضہ کرلیا کہ ملک معظم کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی مجلس مقننہ میں برطانوی ہندوستان کی کل نشستوں کا ۳۳⅓ حصہ ملے گا، اور سندھ یہی نہیں کہ الگ صوبہ بنا دیا گیا بلکہ مرکزی حکومت سے اس کو سرکاری امداد دیکر اس کی مالی حالت کو درست کیا جائیگا۔ اس طرح یونٹی کانفرنس کی کئی ہفتوں کی محنت شاقہ کے یہ پھل کہ سخت کوشش کے بعد اس نے تمام مسئلوں پر ہندو مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کا اتفاق رائے حاصل کرلیا تھا۔ سر سیموئیل ہور کے اس اعلان کی بدولت کہ جو تاک کر بالکل صحیح وقت پر کیا گیا تھا، چیتھڑے چیتھڑے ہوکر بکھر گئے اس بات کی توقع کیسے ہوسکتی تھی کہ تمام مختلف جماعتوں میں اب کوئی باہمی سمجھوتہ ہوسکتا ہے جب کہ یہ ظاہر تھا کہ کوئی نہ کوئی جماعت ہمیشہ ایسی ہوسکتی ہو کہ جو ہر سمجھوتے پر اعتراض کردے خواہ وہ کتنا ہی منصفانہ ہو اور ایسی حالت میں کہ جب برطانوی حکومت ہمیشہ اس کو کچھ زیادہ دینے کو تیار رہے جتنا کہ باہمی سمجھوتے کے ذریعہ اس جماعت کو مل سکتا ہے جو زیادہ داموں پر سودا کرنے کو تیار ہو

باب (۱۵) اختلافات کا زاویہ پھیلتا ہے

ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ کمیونل اوارڈ نے اچھوت ذاتوں کو بھی جداگانہ انتخاب اور مخصوص نشستوں کی رعایت دی تھی۔ ان شرائط میں معاہدۂ پونا کے بعد کہ جو مہاتما گاندھی کے برت کی وجہ سے وجود میں آیا تھا ترمیم ہوئی جس کے رو سے اچھوت ذاتوں کو کمیونل اوارڈ کی عطا کردہ تعداد کی بہ نسبت کہیں زیادہ تعداد میں نشستیں مل گئیں اور وہ ان کے لیے مخصوص بھی کر دی گئیں جنھیں وہ انتخاب کے ایک مخصوص طریقے پر حاصل کر سکتے تھے۔ ایسا اس وعدہ کی مطابقت میں کیا گیا تھا جو کمیونل اوارڈ دیتے وقت حکومت نے کیا تھا کہ نئے دستور اساسی کے نفاذ سے پہلے پہلے اس کی دفعات کو بدل کر انکی جگہ اس معاہدے کی دفعات رکھی جا سکتی ہیں جو دو مخالف فریق باہمی سمجھوتے کے ذریعہ طے کر لیں۔ الہ آباد کی یونٹی کانفرنس کو بھی یہی امید اور اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے اوارڈ کی جو دفعات ہیں انھیں اسی معاہدے کی دفعات سے بدلوالیں جو ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف دیگر فرقوں کے مابین طے پا جائے۔ ہمیں یہ معلوم ہی ہو چکا کہ کس طرح سر سموئیل ہور نے عین اس وقت کہ جب وہ کامیابی کی منزل میں قدم رکھنے ہی والا تھا۔ بم کا گولا گرا کر اس کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ پھر بھی اس تدبیر سے یہ نہ ہو سکا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی مخالفت کی آواز بند ہو جاتی۔ مخالفت برابر حجم اور قوت میں ترقی ہی کرتی رہی جب تک کہ اصلاحات کی تجاویز اپنی لاانتہا میعاد پوری کرتی رہیں، حکومت برطانیہ یہ کہہ چکی تھی کہ مختلف فرقوں کے عدم اتفاق کو اصلاحات کے راستے کی رکاوٹ نہ بننے دیا جائیگا، اور اس لیے اگست ۱۹۳۲ء میں اوارڈ کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس قانون کو منظور کرانے میں حکومت کو تین سال لگ گئے اور بالآخر جون ۱۹۳۵ء میں یہ مسودہ قانون پاس ہوا۔ کانگریس کو اس دوران میں ایک اور آزمائش

ے گزرنا پڑا تھا اور جب وہ وقت آیا کہ وہ اپنی رائے آزادانہ ظاہر کر سکے تو اس نے ایسا نہ کیا۔ کیونکہ اس کے بمبئی کے اجلاس میں، جو اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی رائیں اس اوارڈ کو قبول یا مسترد کرنے کے متعلق مختلف تھیں، چند ہی ہفتوں کے بعد مرکزی اسمبلی کے لیے انتخابات شروع ہو گئے، اور لازمی طور پر کانگریس کا اوارڈ کے متعلق غیر جانب داری کا رویہ ان چیزوں میں سے ایک تھا کہ جن کے خلاف حملہ کیا گیا تھا۔ کانگریس کو اکثر صوبوں میں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن بنگال میں جو ممبر منتخب ہو کر آئے اگرچہ انہوں نے اور تمام باتوں میں تو کانگریس کا پروگرام تسلیم کر لیا تھا لیکن اوارڈ کے مسئلے پر انہیں آزادی حاصل تھی کہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کریں۔ اوارڈ کے متعلق مخالفت اور حکومت برطانیہ کی پالیسی کے بہتریں پھل تو لگا لیکن یہ پس نفاق اور پھوٹ کا سبب تھا شروع ۱۹۳۵ء میں پھر ایک مرتبہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کے صدر اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی متفقہ معاہدہ ہو جائے لیکن وہ ناکام رہی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جون ۱۹۳۵ء میں پاس ہوا تھا اور نئے ایکٹ کے مطابق انتخابات ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں اور ۱۹۳۷ء میں عمل میں آئے، آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی میں جو کہ اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں ہندوستان کے لوگوں کے سر ایک دستور اساسی زبردستی تھوپنے کے خلاف پرزور احتجاج کی گئی تھی اور یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ صوبہ دارانہ اسکیم سے جس قدر بھی فائدہ اٹھایا جا سکے اٹھایا جائے باوجود اس کے کہ اس کی شکل انتہا سے زیادہ قابل اعتراض ہے۔ جس کی وجہ سے وزارتوں اور مجالس قانون ساز کا حقیقی قبضہ اور ذمہ داری بالکل بیکار ہو گئی ہے اور یہ کہ آل انڈیا فیڈریشن اسکیم سخت رجعت پسندانہ، پیچھے کی طرف لوٹنے والی مضرت رساں اور برطانوی ہندوستان کے لوگوں کے ضروری اور اہم مفاد کے حق میں مہلک ہے اور اسی طرح دیسی ریاستوں کے حق میں بھی، اور ہندوستان کی دیرینہ اور دلی آرزو کو کہ وہ

کامل طور سے ذمہ دار حکومت کے نصب العین تک پہنچ جائے۔ تعویق میں ڈالنے والی اور ٹھکرا دینے والی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ وفاقی اسکیم کو اس ریزولیوشن میں اس لیے برا کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی اس دیرینہ اور دلی آرزو کا خون کرنے والی تھی کہ وہ اپنے نصب العین تک جو کہ کامل ذمہ دار حکومت تھا پہنچ جائے اور اس سبب سے اسے مسترد کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مفاد کے پیش نظر قابل عمل نہ تھی نہ کہ اس لیے کہ فیڈرل دستور اساسی دیگر یا کسی اور طریقے پر وہ ہندوستان کے صرف مسلمانوں کے مفاد کو مجروح کرتی تھی۔ لیگ نے ایک پارلیمنٹری بورڈ مقرر کیا جس نے انتخابات کے متعلق اپنا مینی فیسٹو (جماعت کا لیڈر۔ جو جو کام کرنا چاہتا ہے ان کی فہرست) شائع کیا جس کے مطابق انتخابات کے مقابلے لڑے گئے اس میں بیان کیا گیا تھا "وہ خاص اصول جن پر ہم اپنے نمائندوں سے توقع کرتے ہیں کہ مختلف مجالس مقننہ میں کام کریں گے یہ ہوں گے:۔

(۱) کہ موجودہ صوبہ وارانہ دستور اساسی اور مجوزہ مرکزی دستور اساسی جلد سے جلد منسوخ ہو کر اس کی جگہ جمہوری اور کامل طور پر خود مختار حکومت قائم ہو۔

(۲) اور یہ کہ اس زمانہ میں مختلف مجالس مقننہ کے اندر مسلم لیگ کے نمائندے ان مجالس سے یہ کام لیں گے کہ جتنا زیادہ ممکن ہو دستور اساسی سے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگوں کے سدھار کا کام لیا جائے۔ جس وقت تک جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب موجود ہیں اس وقت تک مسلم لیگ کی علیحدہ جماعت بنے گی تو ضرور لیکن یہ جماعت ہر اس جماعت یا جماعتوں سے آزادی کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی جس کا نصب العین قریب قریب وہی ہو جو لیگ کی جماعت کا ہے۔" مینی فیسٹو میں جو پروگرام شامل تھا اس میں ایسی صرف دو دفعات تھیں جن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں ہی سے تھا۔

(ا) مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی نگہداشت کرنا۔ اور

(ب) ایسے ذرائع اختراع کرنا کہ جن سے مسلمانوں کی عام حالت کو بہتر بنایا جاسکے۔

باقی تمام دفعات ایسے معاملات سے متعلق تھیں جو بلا قید مذہب وملت سب کے لیے مشترک تھے، مثلاً قشتہ دآمیز قوانین کی منسوخی، یا ایسی تدابیر کو مسترد کرنا کہ جو ہندوستان کے مفاد کے لیے اور لوگوں کی بنیادی آزادی کے لیے مضرت رساں ہوں اور جن کی مدد سے ملک کی مالیات کا ناجائز استعمال عمل میں آتا ہو۔ ملک کے انتظامات اور فوج پر جو مصارف آتے ہیں ان میں کمی کرنا ملک کا روپیہ ایسے محکموں پر صرف کرانا کہ جن سے قوم کی تعمیر ہوسکے، حرفتوں کو ترقی دینا، سکوں کا اور تبادلۂ زر کا ایسا انتظام کرنا جو ملک کے مفاد کے مطابق ہو، دیہاتی آبادی کا سدھار وغیرہ۔ انتخابات کے موقع پر یا تو لیگ نے سب صوبوں میں اپنے امیدوار کھڑے نہ کیے یا کھڑے کیے تو کامیاب نہ ہوسکی. کانگریس نے اپنی طرف سے غیر مسلم نشستوں میں سے بیشتر کے لیے اور صرف چند مسلم نشستوں کے لیے امیدوار کھڑے کیے۔ انتخابات کا یہ نتیجہ حسب ذیل نکلا۔

جدول دوم

نام صوبہ	نشستوں کی کل تعداد	کانگریس کی حاصل کردہ تعداد	مسلم نشستوں کی مجموعی تعداد	مسلم لیگ کی حاصل کردہ تعداد	دوسری مسلم جماعتوں کی حاصل کردہ تعداد
مدراس	۲۱۵	۱۵۹	۲۸	۱۱	۱۷
بمبئی	۱۷۵	۸۶	۲۹	۲۰	۹
بنگال	۲۵۰	۵۴	۱۱۷	۴۰	۷۷
صوبۂ متحدہ	۲۲۸	۱۳۴	۶۴	۲۷	۲۷

نام صوبہ	نشستوں کی کل تعداد	کانگریس کی حاصل کردہ تعداد	مسلم نشستوں کی مجموعی تعداد	مسلم لیگ کی حاصل کردہ تعداد	دوسری مسلم جماعتوں کی حاصل کردہ تعداد
پنجاب	۱۷۵	۱۸	۸۴	۱	۸۳
بہار	۱۵۲	۹۸	۳۹	۰	۳۹
صوبہ متوسط	۱۱۱	۷۰	۱۴	۰	۱۴
شمال مغربی سرحد	۵۰	۱۹	۳۶	۰	۳۶
آسام	۱۰۸	۳۳	۳۴	۹	۲۵
اڑیسہ	۶۰	۳۶	۴	۰	۴
سندھ	۶۰	۰	۳۶	۰	۳۶
کل میزان	۱۵۸۵	۷۱۴	۴۸۵	۱۰۸	۳۷۷

اس فہرست سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پانچ صوبوں میں کانگریس کو نشستوں کی اکثریت حاصل تھی۔ بمبئی اور صوبہ سرحد میں جو امیدوار بطور خود کھڑے ہو کر کامیاب ہوئے تھے وہ بھی کانگریس کے شریک ہو گئے اور وہاں بھی کانگریس کی اکثریت ہو گئی۔ مسلم لیگ کو ایسے صوبوں میں بھی اکثریت حاصل نہ ہوئی جہاں کہ مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی بنگال پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ اور ان صوبوں میں سے کسی میں یہ بھی نہ ہوا کہ مسلم لیگ نے مسلمان نشستوں ہی پر اکثریت حاصل کر لی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ایک صوبہ میں بھی مسلم لیگ اپنی وزارت نہ بنا سکی تھی۔ بغیر اس کے کہ وہ اپنے ساتھ کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم جماعت کو نہ ملائے۔ چار صوبوں میں تو ایسا ہوا کہ اس کو ایک نشست بھی نہ ملی۔ اور پنجاب میں اس نے صرف ایک نشست حاصل کی۔ جب وزارتیں بنانے کا وقت آیا تو کانگریس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ مجلس مقننہ میں جو کانگریسی جماعت کا لیڈر ہے وہ مطمئن نہ ہو جائے اور کھلے طور پر یہ اعلان نہ کر سکے کہ گورنر اپنے اختیارات

خصوصی کو کام میں نہ لائے گا جو مداخلت کے متعلق اسے حاصل ہیں اور وزیروں کے مشوروں کو قانونی کارروائیوں کے متعلق نہ ٹھکرائے گا۔ چونکہ گورنروں نے اس بات کا عہد نہ کیا۔ اس لیے کانگریسی جماعت نے عہدے قبول نہ کیے۔ کانگریس جس بات کا وعدہ طلب کرتی تھی وہ گورنر کی مخصوص ذمہ داریوں کے متعلق تھا یعنی ان معاملات کے متعلق کہ جن میں گورنر اپنے وزراء کے مشورے کے بغیر کام کر سکتا تھا اور ایسے معاملات کے متعلق جن میں وہ وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی ذاتی رائے کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ مخصوص ذمہ داریوں کی فہرست کا مجموعی اثر سر سموئیل ہور کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ نظم و نسق کے پورے میدان پر حاوی ہے۔ صوبے کے امن و سکون کے لیے جو خطرات ہوں انکو روکنا، اقلیتوں کے جائز مفاد کا تحفظ کرنا، سرکاری حکام اور ان کے اہل و عیال کے مفاد کا تحفظ کرنا، وزراء کے دائرۂ عمل میں اگر کوئی امتیازی برتاؤ اس قسم کا ہو جو انگریزوں یا انگریزوں کے کارخانوں کے خلاف ہو تو اس کی روک تھام کرنا، ایسے علاقوں میں امن اور حسن انتظام قائم رکھنا جو ایک حد تک دائرہ سے خارج ہیں۔ دیسی ریاستوں اور ان کے فرماں رواؤں کے حقوق کی حفاظت کرنا اور گورنر جنرل کے احکام اور ہدایات پر عمل کرنا۔" [1]

اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس اتنی بڑی فہرست میں سے جو کہ نظم و نسق کے پورے میدان پر حاوی ہے: "اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ" صرف ایک مختصر سی مد ہے "اور اقلیتوں" میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں رہنے والے انگریز اور ہندوستان کے اپنے بہت سے فرقے بھی داخل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب لارڈ زیٹلینڈ Lord Zetland جو وزیر ہند تھے جب یہ اعلان کرنے کو

---

[1] چنتامنی اور مسانی کی کتاب "انڈیاز کانسٹی ٹیوشن ایٹ ورک" صفحہ ۹۱ - ۹۲

کھڑے ہوتے ہیں کہ گورنر کے عہدے کے متعلق کانگریس کا مطالبہ بغیر اس کے منظور نہیں کیا جا سکتا کہ دستور اساسی میں ترمیم کی جائے تو جو مثال آپ کے ذہن میں اقلیتوں کے مفاد کے خلاف کانگریسی وزراء کے لیے طرز عمل کی آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اقلیت کے فرقے کے اسکولوں کی تعداد میں کمی کر دینا کانگریسی وزراء کے لیے بالکل کانگریس کے اصول کے اندر ہو گا کیونکہ وہ ایک ایسا کام ہو گا جو قانون کی حد کے اندر رہے اور سے ایک آئینی کارروائی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے گورنر کو یہ اختیار حاصل نہ رہے گا کہ وہ اقلیت کی حفاظت کر سکے، پارلیمنٹ نے جو حفاظت حقوق کی شق رکھی ہے وہ صرف اسی پیش بینی کی بناء پر رکھی ہے کہ اس دستور اساسی کی پابندی کرتے ہوئے بھی اس قسم کی کارروائیاں ممکن ہیں" لے اس ضمن میں اقلیت والے فرقے کا جو حوالہ دیا گیا ہے اس کا مقصد صاف ظاہر ہے، اور اس کا اثر بھی انگریزوں کے حسب منشا ہوئے بغیر نہ رہا

کانگریس نے گورنروں سے جو ضمانت طلب کی تھی وہ صرف اپنے ہی وزیروں کے لیے نہیں مانگی تھی اور دوسرے صوبوں میں جن فرقوں یا جماعتوں کی اکثریت تھی۔ وہ بھی بہتر ہوتا کہ اس مطالبے میں کانگریس کے ساتھ شریک ہو کر زور ڈالتے اور اس طرح یہ ممکن ہو جاتا کہ ہر صوبے کے منتظمین کو کسی حد تک گورنروں کی مداخلت سے وزراء کی آئینی کارروائیوں میں نجات مل جاتی۔ لیکن دوسری جماعتوں نے ایسا نہ کیا اور بلا کسی شرط اور ضمانت کے وزارتیں مرتب کر لیں، کانگریس اب بھی انتظار کرتی رہی۔ بعد میں جو تبادلۂ خیالات ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کانگریس کی وزارتوں کے آئینی کاموں میں مداخلت کرنا نہ گورنر کے لیے آسان ہو گا اور نہ وہ بار بار ایسا کر سکے گا۔ یہ ان عجیب و

غریب تجربوں میں سے ایک ہے کہ جس چیز کو نامعقول کہا گیا تھا وہی اس قدر اہم ثابت ہو۔ گورنروں سے ضمانت کا یہ مطالبہ اگرچہ تمام وزارتوں کے بھلے کے لیے کیا گیا تھا لیکن اس کا ذکر اس طریق پر کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا مطالبہ تھا کہ جس سے صرف کانگریسی ہی وزارتیں فائدہ اٹھاتیں۔ وزیر ہند صاحب نے یہ باریکی لوگوں کو سمجھائی کہ کانگریسی وزارتیں ممکن ہے کہ اپنے اختیارات اقلیت کے خلاف استعمال میں لائیں، اور اس باریک نکتے کو لیگ نے سمجھ لیا اور اسی پر اڑ گئی کہ کانگریس نے گورنر سے ضمانت بس اسی مقصد کے لیے طلب کی تھی۔ لیگ نے اسی مقام پر دم نہیں لیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔ لیگ کے حامیوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ضمانت اس لیے طلب کی گئی تھی کہ کانگریسی وزیر مسلمان اقلیت پر ظلم توڑنے میں اپنے اختیارات صرف کرنا چاہتے تھے جو لوگ لیگ کی طرف سے پروپگینڈا کر رہے تھے انھوں نے (بقول سر سموئیل ہور کے) "ظلم و تشدد کا سارا میدان" چھوڑ کر کہ جس پر گورنر کے مخصوص اختیارات حاوی تھے، جن سے کانگریس نے وزراء کی جان چھڑانی چاہی تھی ایک یہی ذرا سا کونہ اقلیتوں کے حقوق کا لے لیا تھا۔ جب کانگریسی وزارتیں بن گئیں تو اس قسم کے واقعات تو عمل میں آئے کہ کانگریسی وزراء نے کبھی کبھی گورنر کو اپنے مشورے کے مطابق عمل کرنے پر استعفے کی دھمکی دیکر یا استعفاء دیکر مجبور کر لیا۔ لیکن کبھی کوئی ایک بھی ایسا موقع پیش نہ آیا کہ جب کسی اقلیت کے متعلق کسی کانگریسی وزارت نے یہ کوشش کی کہ گورنر کے مجبور ہو جانے سے فائدہ اٹھائے اور اقلیت کے حقوق پر کسی قسم کا اچھا یا برا اثر ڈالے۔

کانگریس نے کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۳۷ء میں بہت سے بحث و مباحثہ کے بعد جو کہ اس دوران میں ہوتا رہا اپنی وزارتیں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا وہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مشترک وزارتیں بنائے۔ ایسے صوبوں میں کہ جہاں لیگ کا ایک

ممبر بھی منتخب ہوا تھا مثلاً بہار، اڑیسہ، اور صوبہ متوسط میں، تو وزارت کے مشترک کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ صوبہ متحدہ اور صوبہ بمبئی میں اس قسم کی کوشش کی گئی لیکن وہ ناکام رہی۔ کانگریس اسمبلیوں میں ایک معینہ پروگرام لے کر اور اپنی ایک مقررہ پالیسی کو آگے بڑھانے کے لیے گئی تھی۔ اور وہ اپنے حلقۂ انتخاب سے غداری کیے بغیر ایسا نہیں کر سکتی تھی کہ ایسے لوگوں کو اپنی وزارت کے اندر داخل اور شامل کرے جنھیں یہ پالیسی اور پروگرام قبول نہو، پروگرام بھی ایسا نہ تھا کہ جس پر فرقہ وارانہ بنیادوں پر اعتراض ہو سکتا اگرچہ یہ ممکن تھا کہ ایسی جماعتیں اس کی بعض دفعات پر اعتراض کرنے کے لیے اٹھ سکتی تھیں کہ جن میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اس لیے وہ کوئی فرقہ وارانہ پروگرام نہ تھا جس پر مسلمانوں ہی کی طرف سے اختلافات کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہ ایک سیاسی اور اقتصادی پروگرام تھا اور جن مسلمانوں نے اسے قبول کر لیا تھا وہ اس کی وجہ سے اسلام سے خارج نہیں ہوئے، کانگریس کو قدرتی اور لازمی طریقے پر ان مسلمانوں کو اُن مسلمانوں پر ترجیح دینی تھی جنھوں نے اس کا پروگرام قبول نہیں کیا تھا۔ کانگریس نے ایسے مشہور اور معلوم اصول پر جمے رہنے کا فیصلہ کیا کہ یک جنس لوگوں کی وزارتیں بنائے جو کہ اس کے اپنے ممبر ہوں اور ان میں مسلمان یقینی طور پر شامل تھے۔ اس لیے کانگریس نے مسلمان ممبروں کا انتخاب ان مسلمانوں میں سے کیا کہ جو اس کے ممبر تھے۔ اور بس یہی کانگریس کا سارا گناہ تھا۔ لارڈ زیٹلینڈ نے جو اشارہ دیدیا تھا اسے پروپگنڈے کی غرض سے خوب اچھی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔

وزارت کے عہدوں پر فائز ہونے میں مسلمانوں کو نیز دیگر اقلیتوں کو ان کے تناسب سے زیادہ حصہ دیا گیا تھا۔ گیارہ صوبوں کے کل اکھتر وزیروں میں سے چھبیس مسلمان تھے، دس دیگر اقلیت والے فرقوں کے اور پینتیس ہندو ہندوؤں کے کانگریسی صوبوں میں وزیروں کی کل تعداد سینتیس تھی، ان میں چھ مسلمان تھے اور پانچ دیگر اقلیت

والے۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد کانگریس نے دو اور صوبوں میں مشترک وزارتیں بنائیں یعنی شمال مغربی سرحد کے صوبے میں اور آسام میں اور اس طرح مسلمان وزیروں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ صوبہ سرحد میں چار وزیروں میں سے تین مسلمان تھے جن میں ایک وزیر اعظم بھی تھے یعنی ڈاکٹر خاں صاحب اور آسام میں تین مسلمان اور پانچ غیر مسلم وزیر تھے۔ ان اعداد و شمار سے لیگ کی طرف سے عذرات پیش کرنے والوں کے ان بیانات کی اچھی طرح تکذیب ہو جاتی جو ملک بھر میں پھیلائے جا رہے ہیں۔

کانگریس نے وسط جولائی ۱۹۳۷ء کے قریب عہدے قبول کئے تھے اور ان عہدوں پر متمکن ہوئے صرف آٹھ مہینے ہوئے تھے کہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ چونکہ مرکزی دفتر میں بے شمار شکایتیں اس امر کی پہنچی ہیں کہ کانگریسی حکومتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ برا برتاؤ کیا جا رہا ہے انہیں تکلیف دی جا رہی ہے، اور ان کے ساتھ بے انصافی کی جاتی ہے، اس لئے اس کونسل کا یہ فیصلہ ہے کہ ایک مخصوص کمیٹی (مندرجہ ذیل) ممبروں پر مشتمل مقرر کیجائے تاکہ وہ پوری واقفیت بہم پہنچائے اور ضروری تحقیقات کرے، اور مناسب طریقے پر تدارک کرے اور اپنی رپورٹ وقتاً فوقتاً کونسل کے پاس بھیجتی رہے۔ اس کمیٹی نے جس کے صدر راجا صاحب پیرپور تھے اپنی رپورٹ ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو پیش کی۔ اس جگہ اس رپورٹ کی شکایات کا بالتفصیل ذکر کرنا ممکن نہیں۔ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد کانگریسی وزراء نے ان الزاموں کی تحقیقاتیں کیں اور جواب میں اپنے بیانات شائع کئے۔ ان میں سے بعض شکایتوں کے متعلق اپنے اپنے صوبے کی مجلس مقننہ میں بھی سوالات کئے گئے۔ ان الزامات کی تحقیقات کبھی غیر جانب دارانہ طریقے پر نہیں ہوئی ہے۔ مسٹر فضل الحق نے جو اس زمانہ میں مسلم لیگ کے اونچے درجے کے ممبر تھے پنڈت جواہر لال نہرو کو چیلنج دیا تھا، اور پنڈت جواہر لال نہرو چیلنج قبول کر کے مسٹر فضل الحق کی تجویز

کے مطابق ان کے ساتھ چلنے کو تیار بھی ہو گئے تاکہ الزامات کا سچ جھوٹ معلوم ہو سکے، لیکن مسٹر حق نے معاہدہ فسخ کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں راقم السطور نے جو اس سال کانگریس کا صدر تھا، مسٹر جناح کو ایک خط لکھ کر یہ تجویز پیش کی کہ ان تمام شکایات کی تحقیقات کسی غیر جانب دار افسر سے کرائی جائے اور سر مارس گوائر Sir Maurice Gwyer کا نام بھی اس کام کے لیے پیش کیا جو اس زمانے میں فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ لیکن بدقسمتی سے مسٹر جناح نے یہ تجویز پسند نہ کی اور جواب میں یہ لکھا کہ "اب یہ معاملہ ہز ایکسی لینسی (وائسرائے) کے زیر غور ہے اور وہی وہ مناسب حکم ہیں کہ جو اس کے متعلق ایسی کارروائی کریں گے اور ایسے وسائل اختیار کریں گے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کر دیں اور ان صوبوں کے اندر کہ جہاں کانگریسی وزارتوں کے ہاتھوں انتظامات ہیں، پھر کامل امن اور محفوظ ہونے کا احساس قائم کر دیں گے۔" نہ تو ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے اور نہ کسی ایسے صوبے کے گورنر نے جہاں کانگریس وزارتیں تھیں، اور نہ لارڈ زٹلینڈ نے جو اس تمام زمانے میں وزیر ہند رہے کہ جب تک کانگریسی وزارتوں نے کام کیا، غرض کہ کسی ایک نے بھی کبھی نہ مسلمانوں پر نہ کسی اور اقلیت پر کانگریسی مظالم کا سوال اٹھایا۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ آیا وائسرائے نے مسٹر جناح کی عرضداشت پر کوئی کارروائی کی یا نہیں جب کہ انہوں نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا، اور نہ ہمیں یہی معلوم ہے کہ مسٹر جناح نے اس معاملے کے متعلق وائسرائے پر کوئی مزید زور ڈالا ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد مسٹر جناح نے یہ مطالبہ ضرور پیش کیا کہ ایک شاہی کمیشن کا تقرر عمل میں آنا چاہئے تاکہ وہاں ان الزامات کی تحقیقات کرے لیکن اسے حکومت نے منظور نہ کیا اور معاملہ آگے نہ بڑھا۔ ان کے استعفا دینے سے پیشتر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے وزیروں سے درخواست کی تھی کہ اپنے اپنے صوبے کے گورنروں کو اس بات کی دعوت دیں کہ ان کے وزارت کے زمانے کی پالیسی میں یا ان کے کاموں میں اگر کوئی پالیسی یا کام ایسا

تھا کہ اس کا اثر مسلمانوں پر یا کسی دوسری اقلیت پر مخالفانہ پڑا ہو تو اس کی جانب اشارہ کردیں۔ کسی ایک صوبے میں بھی ایسا نہ ہوا کہ کسی گورنر کو اس قسم کی کوئی مثال ملی ہو بلکہ اس کے برعکس اپنے عہدے سے علیحدہ ہونے کے بعد سر ہنری ہیگ (Sir Henry Haig) نے کہ جو صوبۂ متحدہ کے گورنر رہ چکے تھے اور یہ بھی نہ تھا کہ کانگریس کے ساتھ نرم دلی کی بیماری کے لئے وہ بدنام ہوں، انہوں نے کانگریسی وزارتوں کے اس کارنامے کی شہادت دی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں کس قدر انصاف سے کام لیا، اور انتہائی احتیاط برتی۔ اس لئے وہ نام نہاد مظالم ایک مدعی کے یک طرفہ بیانات کی حد سے کبھی آگے نہ بڑھے جن کی کہ کبھی تحقیقات نہیں ہوئی۔ اور جو کبھی ثابت نہ کئے جا سکے۔ اس کے باوجود وہ لیگ کے پروگرام کی خاص تختی بنے ہوئے ہیں اور برابر ان سے پروپیگنڈے کا کام لیا جا رہا ہے۔

بہتر ہوگا اگر میں عائد کردہ الزامات میں سے بعض نمایاں نکات کا ذکر کردوں

بندے ماترم کا گیت ان اسباب میں سے ایک خیال کیا جاتا تھا کہ جس کی وجہ سے ہندوستان کے دو بڑے فرقوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ گیت گذشتہ صدی میں سنہ ۸۰ء کے قریب لکھا گیا تھا، اور اس صدی کے شروع ہی سے وہ عام طور پر پسند کیا جاتا ہے، نہ صرف بنگال میں بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی۔ کانگریس کے اور کانگریس کے علاوہ دوسرے اجلاسوں میں بھی یہ برابر اسی وقت سے گایا گیا ہے۔ مسٹر جناح خود بھی کانگریس کے ایک ممتاز رکن کم سے کم پندرہ سال تک رہے ہیں جب کہ یہ گیت برابر وہاں گایا جا رہا تھا، اور کبھی انہوں نے اس پر کوئی اعتراض اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں کیا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں جبکہ کانگریس کو اپنی جنگ میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ حمایت اور مدد حاصل تھی اس زمانے میں یہ بیشمار اجتماعات کے موقعوں پر گایا جا چکا ہے، لیکن ان دنوں میں کبھی کسی نے اس پر حرف گیری نہ کی۔ اس کے باوجود

بھی گیت کانگریس کے وزارتیں قبول کرنے کے بعد سے بہت بڑی وجہ شکایت اور باہمی جھگڑے کا سبب بنا دیا گیا، اور اس کا ذکر پیرپور رپورٹ میں سب سے پہلے کیا گیا ہے۔ مگر کانگریس کمیٹی نے ہر ممکن غلط فہمی کو رفع کردینے اور ہر اعتراض کے موقع کو درمیان سے ہٹا دینے کی غرض سے یہ ہدایت جاری کردی کہ آئندہ اس کے صرف ابتدائی دو بند گائے جایا کریں۔ اسی طرح اس کا مذہبی انداز بھی اس سے دور کر دیا گیا کہ جس پر ممکن تھا کہ کسی کو اعتراض ہو سکے۔ لیکن پھر بھی یہ کہا گیا کہ مسلمان اس کہانی کو نہیں بھول سکتے جو اس گیت کا پس منظر تھی اور جس میں کہ یہ گیت وارد ہوا ہے۔ کامل یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگال کے باہر دوسرے صوبوں میں ہزار میں سے ایک آدمی بھی اس کہانی کے وجود کا کوئی علم نہ رکھتا تھا تا آنکہ اس کا بنگال سے منگانا اس غرض سے ضروری ہو گیا کہ گیت پر اعتراضات کا جواز ثابت کیا جا سکے۔

دوسری چیز سہ رنگا جھنڈا ہے۔ یہ جھنڈا اس زمانے میں عالم وجود میں آیا تھا جب کانگریس کو تحریک خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کی حمایت و امداد حاصل تھی۔ اسے قومی جھنڈے کے طور پر اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے قبول کر لیا تھا۔ بندے ماترم کے گیت کی طرح اس جھنڈے پر بھی حکومت برطانیہ کا عذاب نازل ہوا تھا جس کی نظروں میں یہ جھنڈا اور وہ گیت دونوں انقلابی علامات تھیں، اور وہ ان دونوں کو دبانے کے درپے ہو گئی۔ اس لئے اس جھنڈے کو یہ اعزاز و امتیاز حاصل ہو گیا کہ بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کی حفاظت کی اور اسے اونچا رکھنے کے لئے پولیس کی لاٹھیاں بھی کھائی ہیں اور اپنی جانیں بھی گنوائی ہیں۔ مسلمانوں نے کبھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا جب تک کہ کانگریسی وزارتیں وجود میں نہ آئیں۔ اور اس جگہ پر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہندوؤں کا جھنڈا نہیں ہے۔

کانگریس کے پروگرام میں ایک اور چیز جسے مسلمانوں پر حملے کے نام سے تعبیر کیا

جاتا ہے۔ اس کا عوام کے ساتھ ربط ہے۔ کانگریس گذشتہ کم سے کم پچیس سال سے عوام کی تحریک بن چکی ہے اور اس کا ثبوت مختلف ستیاگرہوں کی تحریکوں سے مل چکا ہے۔ اس کے بلانے پر ہمیشہ عوام آزادی کی راہ میں مصیبت جھیلنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ان تحریکوں کی تفصیلات بیان کرنا غالباً غیر ضروری ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ان تحریکوں میں حصہ لیا ہے اور مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اب یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کانگریس کیلئے یہ چیز جرم میں داخل ہوگئی کہ وہ مسلمان عوام تک پہنچنے کی کوشش کرے تاوقتیکہ یہی نہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان کے اندر مسلم لیگ کے سوا کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان سے بات کرے، اور ہندو مسلمان یا اور کسی کو استحقاق نہیں پہنچتا کہ ان سے کسی سیاسی یا اقتصادی مسئلے پر، یا کسی اور ایسی بات پر کہ جو عام دلچسپی کی ہو تبادلۂ خیال کر سکے۔ ہر آزاد ملک میں ہر فرد اور ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے ذاتی یا اپنی جماعت کے اصول مقاصد اور پروگرام لوگوں کے سامنے پیش کرے، حتیٰ کہ پاکستان میں بھی ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ لوگوں سے یہ حق چھینا نہ جائیگا۔ کانگریس ہی پر کیا منحصر ہے کوئی بھی اور جماعت وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ، اور مذہبی ہو یا سماجی سیاسی ہو یا اقتصادی اپنے اس حق کو چھوڑ نہیں سکتی، اور اس کے خلاف شور و شر مچانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسا کرنیوالوں کے دل میں آزادی کلام اور آزادی ملاقات کا کوئی احترام نہیں ہے۔ فرقے فرقے کے جداگانہ انتخاب نے فرقوں کی تقسیم مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر تو کردی تھی، اب اس کا اثر یہ پڑا ہے کہ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات بھی ترقی کر گئے۔ اس چیز کو خود مسلمانوں نے بھی محسوس کیا ہے، اور اس مسئلہ پر خود لیگ کے اندر افتراق پڑ چکا ہے۔ اور خود مسٹر جناح اس فریق کے لیڈر تھے جو جداگانہ انتخابات کا مخالف تھا۔ لیکن دوسروں نے اس کی بات نہ مانی اور انہیں دبنا پڑا۔ اگر کانگریس آج تک اپنے اسی عقیدے پر قائم ہے کہ جداگانہ انتخابات کا طریقہ ایک برا اور مضرت رساں طریقہ ہے تو اسے کس طرح الزام دیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے باوجود جو کچھ آجکل مطالبہ ہو رہا ہے وہ

یہ ہے کہ نہ صرف جداگانہ انتخابات ہی کو برقرار رکھا جائے اور اپنے فرقے کے رائے دہندوں کو دوسرے فرقے کے امیدواروں کے حق میں رائے دینے سے روکا جائے اور امیدواروں کو منع کیا جائے کہ ایسے لوگوں کی رائے مانگنے اور رائے حاصل کرنے کیلئے نہ جائیں جو دوسرے فرقے کے ہوں، بلکہ یہاں تک ہو گیا ہے کہ غیر سرکاری جماعتیں مسلمانوں سے کسی قسم کا واسطہ اور میل جول ہی نہ رکھیں، یہ ایک ایسا مطالبہ ہے کہ جس کی بدولت جداگانہ انتخابات کی شر انگیزیاں نہ صرف ان کاموں تک پھیل جائیں گی، کہ جن کا تعلق انتخابات سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کیلئے یہ ناممکن کر دینگی کہ دوسرے فرقوں کے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا بھی میل جول رکھ سکیں یہ صورت حال تو ایسی ہے کہ بیک نگاہ اسے مسترد کر دینا چاہیے۔

ایک دوسری چیز جس پر لیگ کی جانب سے بہت کچھ اعتراضات کیے گئے ہیں۔ وہ بنیادی تعلیم کی وردھا اسکیم ہے۔ اس طریق تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ بچوں کو کتاب کے ذریعہ سے اتنی تعلیم نہ دی جائے جتنی کہ مختلف قسم کی صنعتوں کے ذریعہ سے نفسیات اور تعلیمات کے ماہرین نے مغربی ممالک میں اس طریقے کو اختیار کر لیا ہے، اور سارجینٹ اسکیم میں بھی بنیادی طور پر اس کو لے لیا گیا ہے۔ جس کمیٹی نے کہ اس اسکیم کے متعلق وردھا میں کام کیا اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے، کہ جن کی شہرت ایک ماہر تعلیم یافتہ کی حیثیت سے کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انھیں اپنے اس کام میں خواجہ غلام السیدین صاحب سے مدد ملی جو ایک زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں کشمیر کے ڈایرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ہو گئے تھے، اس بات کا سمجھنا سخت مشکل ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی اسکیم کہ جسے دو بہت ہی مشہور مسلمان ماہرین تعلیم نے بنایا ہو کس طرح ایک ایسی اسکیم ہو گئی کہ جسے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہونچانے کے لیے بنایا ہو۔ اسکیم کا سارا قصور بس اتنا ہے کہ مہاتما گاندھی نے اسے پبلک سے روشناس کرایا تھا اور انہی نے اس کانفرنس کو مدعو

کیا تھا کہ جس نے وہ تیار کی۔ اس اسکیم کو عملی شکل دی جا چکی ہے اور دہلی کی جامعہ ملیہ میں خود ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی نگرانی میں اسے چلایا جا رہا ہے۔ مجھے ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ کسی اور مقام پر بھی اسے اسی قدر کامیابی کے ساتھ چلایا گیا ہو، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کا نام کانگریسی مظالم کی فہرست میں داخل ہے۔ اسی مقام پر اس چیز کا ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ خصوصیت کے ساتھ صوبہ متوسط کی اس تعلیمی تجویز پر اعتراض کیا گیا تھا کہ جو ودیا مندر اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں اس صوبے کے وزیر اعظم نے مسلمان ممبران اسمبلی کی ایک کانفرنس بلائی جس میں کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری ہیں۔ اس کانفرنس کا اجلاس ، فروری کو ہوا تھا وزیر اعظم نے ودیا مندر اسکیم کی سب کے سامنے توضیح کی اور بتایا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دیہات کے اندر تعلیم سے بے تعلقی اور جہالت باقی نہ رہے اور بلا لحاظ مذہب وملت ہر شخص تعلیم یافتہ ہو جائے اور لوگوں سے جاگیریں اور روپیہ لے کر اسے چلایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک پرائیویٹ انجمن بنی اور حکومت نے وعدہ کیا کہ انجمن کی اپنی آمدنی کے علاوہ سرکاری طور پر بھی اسے امداد دی جائیگی۔ وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان اسی قسم کی اپنی علیحدہ انجمن قائم کر لیں تو وہ اسے پسند کریں گے۔ نواب زادہ نے کہا کہ مسلمان اس کا نام مدینۃ العلم رکھیں گے اور اسکیم کا نام مدینۃ العلم اسکیم ہو گا۔ وزیر اعظم نے اس اسکیم اور اس انجمن کی بھی اسی طرح امداد کا وعدہ کیا کہ جس طرح دوسری انجمن کے متعلق کیا تھا۔ صرف ودیا مندر اسکیم ہی کے متعلق نہیں بلکہ اور بھی تمام معاملات پر اس کانفرنس میں بحث ہوئی اور تمام معاملات نہایت خوش دلی کے ساتھ ایک ایسے طریقے پر طے کر دیئے گئے کہ جو صوبے کے مسلمان ممبران اسمبلی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کے

یہ اطمینان بخش تھا، معاہدے کی شرطوں پر وزیر اعظم نے اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے دستخط کیے۔ اس طرح وہ ستیہ گرہ بند ہو گئی جو کہ بعض مسلمانوں نے شروع کی تھی اور مسلمانوں کے خلاف جو مقدمات تھے وہ واپس لے لئے گئے۔ ۱۹ فروری ۱۹۳۹ء کو صوبے کی حکومت نے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں ان کارروائیوں کا ذکر تھا۔ لیکن ودیا مندر اسکیم پھر بھی کانگریس کے مظالم کی فہرست کا جزو بنی ہوئی ہے، جب مسٹر فضل الحق نے اس معاملے کو پھر اٹھایا تو صوبے کی حکومت نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں نواب زادہ کی اجازت سے وہ معاہدہ شائع کرا دیا کہ جس پر نواب زادہ اور پنڈت شکلا وزیر اعظم کے دستخط تھے اور یہ واقعہ اس وقت ظہور میں آیا کہ جب کانگریسی وزارت کو استعفا دیئے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ یہ عہد نامہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کے اخبار ہتواد میں دیکھا جا سکتا ہے جو ناگپور سے شائع ہوتا ہے۔

ایک یہ الزام بھی کانگریسی وزارتوں کے سر تھوپا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں ہندو مسلم فسادات ہوئے، بدقسمتی سے اس قسم کے فسادات تو ملک میں ہوتے ہی رہتے ہیں، اس وقت بھی ہوتے تھے کہ جب کانگریسی وزارتیں نہیں بنی تھیں، اور اس زمانے میں بھی ہوتے رہے کہ جب کانگریس نے وزارتوں کو خیرباد کیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس وقت سے زیادہ عالمگیر ہو گئے ہیں اور جلدی جلدی بھی وقوع میں آنے لگے ہیں کہ جب سے منٹو مارلے اصلاحات کے ساتھ ساتھ جداگانہ انتخابات کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ فسادات کے واقعات کی تفصیلات اور ان کے اسباب کی تحقیقات کسی طرح بھی یہاں ممکن نہیں ہے اور ایسے واقعات جو عدالتوں تک پہنچے ان کی تحقیقات عدالتوں نے کی بھی ضرور ہو گی۔ مسٹر ذرانی نے ایک واقعہ پر بہت زور دیا ہے جو برار میں ہوا تھا اور ہائیکورٹ کے فیصلہ کا حوالہ دے کر اس زمانے کے وزیر اعظم سے مطالبہ کیا ہے کہ یا تو وہ خودکشی

رے یا پبلک کی زندگی سے کنارہ کشی کر جاتے، اس لئے اس مقدمے سے متعلق
چند واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ ہندوؤں میں سے ایک بڑا آدمی قتل ہو گیا تھا۔
اور بعض دوسروں کے چوٹیں آئیں تھیں۔ مقدمے کی تحقیقات ایک یوروپین سپر
بی جی، ٹیلر ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی نگرانی میں عمل میں آئی تھی۔ مقدمے
کی سماعت بھی اس ضلع میں نہیں ہوئی تھی کہ جہاں واردات وقوع میں آئی تھی،
بلکہ ملزم کی درخواست پر ناگپور میں کی گئی تھی۔ سشن جج جس نے مقدمے کی سماعت
کی، سول سروس کا ایک یوروپین ممبر مسٹر ایم۔ این، کلارک تھا۔ لہٰذا اس بات پر بھی
شاہد ہیں کہ وہ کافی تجربہ کار جج تھا۔ کیونکہ اس کے چند روز بعد ہی اسے ناگپور کے
ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ مقدمے کی سماعت اس وقت عمل میں آئی تھی کہ جب
کانگریسی وزراء اپنے عہدے چھوڑ چکے تھے اور سشن جج اور ہائیکورٹ کے جج کے
فیصلے کانگریس وزارت کے استعفیٰ کے مہینوں بعد صادر ہوئے تھے۔ عدالتوں میں
رات دن یہ ہوتا رہتا ہے کہ ہائی کورٹ میں جا کر ماتحت ججوں کے فیصلے درہم برہم ہو جایا
کرتے ہیں اور بالکل یہی واقعہ اس مقدمے میں بھی پیش آیا تھا۔ ایک چیز ہے کہ جس کو
وزیر اعظم کے خلاف بہت اہمیت دی گئی ہے، انھوں نے ایک تقریر کی تھی جس کے متعلق
کہا جاتا ہے کہ اس سے مقدمے کی تفتیش کے دوران میں ملزم کے خلاف اثر پڑا
لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تقریر اس موقع پر کی گئی تھی جب کہ اسمبلی میں تحریک
التوا اجلاس کی پیش ہوئی تھی اور اس کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ مقدمے کے
واقعات بیان کر دیئے جائیں جیسی کہ رپورٹ حکومت کو ملی تھی۔ یہ بحث واقعہ کے صرف
تین ہی دن بعد چھیڑ دی گئی تھی اور اس وقت تک معاملہ کسی عدالت کے ہاتھ میں نہ
گیا تھا۔ وزیر اعظم کو جب شدید فرقہ وارانہ کشیدگی کی اطلاعات ملیں تو وہ خود موقع
واردات پر گئے اور احتیاطاً اپنے ہمراہ اسمبلی کے تین مسلمان ممبران کو بھی لیتے گئے

کرنے میں پولیس کا ہاتھ نہ تھا، اور اس ضمن میں پولیس پر جتنے الزامات تھے ان میں سب سے پولیس کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ اگر یہی رواج پڑ جائے کہ ہر ایسے مقدمے کے لیے کہ جس میں ماتحت عدالت نے سزا تجویز کی اور ہائی کورٹ نے ملزم کو بری کر دیا۔ وزیر اعظم کو ذمہ دار گردانا جائے تو پھر تو حکومت کا کام چلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ سشن جج پر وزیر اعظم کا کوئی اثر پڑا ہو۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ یہ مقدمہ اس وقت عدالت میں چلا گیا تھا کہ جب وزیر اعظم استعفار دے کر محض ایک معمولی شہری رہ گئے تھے۔

ہندی اردو کے جھگڑے کو بھی کانگریس کے مظالم کی ایک مثال بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک پرانا اختلاف ہے جو کہ ابھی تک چلا آتا ہے، کانگریسی وزارتوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جس سے یہ مخالفت بڑھے۔ جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اسی لیے کیا کہ دونوں میں باہم مصالحت ہو جائے، لیکن قبل اس کے کہ انکی کوششوں کا کوئی نتیجہ نکلے اور وہ کوئی مؤثر قدم اٹھا سکیں وہ مستعفی ہو گئیں

۱۹۳۷ء کے بعد سے اس وقت تک کی فرقہ وارانہ مسئلے کی تاریخ بس اتنی ہے کہ کانگریس کی طرف سے مسلسل اور متواتر کوششیں ہوتی رہیں کہ سمجھوتے کی کوئی شکل نکل آئے اور مسلم لیگ کی جانب سے روز افزوں مطالبات ہوتے رہے۔ جن کی کہ برطانوی حکومت کبھی بالواسطہ طریق پہ حمایت کر دیتی تھی اور کبھی انکو مسترد کر دیتی تھی، اور اس طرح ملک کو ایک کشاکش پیہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے کہ کانگریسی مظالم کا ہوا بنا کر کس طرح کھڑا کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مہاتما گاندھی

اور سری سوبھاش چندر بوس نے کہ جو اس کانگریس کے صدر تھے یہ کوشش کی کہ لیگ کے کم سے کم خیالات تو معلوم کرلیں کہ وہ کس چیز سے مطمئن ہو سکتی ہے۔ تاکہ پھر کانگریس اور تمام مل کر ان مطالبات پر غور کرے اور بشرط ممکن انہیں پورا کردے، یہ اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ مسٹر جناح کے مشہور چودہ نکات تو کسی نہ کسی حد تک برطانوی حکومت نے قبول کرلیے تھے اور انہیں ۱۹۳۵ء کے دستور اساسی کے قانون میں شامل کردیا گیا تھا۔ مسٹر جناح کے اور اس وقت کے کانگریس کے صدر یعنی راقم الحروف کے درمیان اوائل ۱۹۳۵ء میں گفت و شنید ہوئی تھی۔ اور وہ اس قانون کے نفاذ سے پیشتر ہو چکی تھی اور اس کا موضوع مشترک انتخابات تھا۔ اب جبکہ ۱۹۳۵ء کا قانون نافذ ہو چکا تھا اور نہ صرف جداگانہ انتخابات بلکہ اور بھی بعض نکات تسلیم کیے جا چکے تھے تو پھر یہ توقع تو فضول تھی کہ لیگ جداگانہ انتخابات کو یا بعض اور دوسری باتوں کو چھوڑ دے گی اس کے باوجود کہ تحفظ کی جتنی ضمانتیں لیگ نے طلب کی تھیں وہ حاصل کرلی تھیں، اور اس حقیقت کے باوجود کہ مسلمانوں کی وزارتیں پنجاب، سندھ، شمالی مغربی سرحد کے صوبے اور بنگال میں کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وزارت کا کام چلا رہی تھیں اور آسام میں بھی کبھی وزارت ان کے ہاتھ آتی اور کبھی نکل جاتی تھی، ان تمام باتوں کے باوجود مسلم لیگ نے یہی رائے قائم کی کہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور تحفظ کی تمام ضمانتیں اور حکومت برطانیہ کے وہ تمام وعدے کہ وہ گورنر کے تمام مخصوص اختیارات کے ذریعہ سے ان کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کرے گی بے سود اور ناقابل اعتبار ثابت ہوئی کہ جس نتیجے پر کہ مسلم لیگ پہنچی وہ یا تو ایک صحیح نتیجہ تھا یا صرف فرضی اور خیالی، ایک مرکب خوف اور بے اعتمادی کا تھا۔ اگر نتیجہ صحیح تھا تب تو مسلم اکثریت کے صوبوں کی علیحدگی اور ان میں خود مختار اور آزاد ریاستوں کا قیام بھی ان صوبوں کے مسلمانوں

مسلمانوں کی اقلیت ہے جیسا کہ ہم ابھی بتائیں گے لیکن اگر وہ محض ایک فرضی خوف ہو کہ جو دلوں پر چھا گیا ہے تو پھر اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انتظار کیا جائے کہ زمانہ اس بے اعتمادی کو دور کر دے۔ مگر لیگ یہی کیے چلی جارہی ہے کہ اپنے مطالبات کی فہرست کو بڑھائے اور باہمی سمجھوتے کے امکانات کو گھٹائے وہ لمبی چوڑی گفت و شنید اور خط و کتابت جو کچھ عرصہ تک ایک طرف مہاتما گاندھی، شری سوبھاش چندر بوس اور پنڈت جواہر لال کے اور دوسری طرف مسٹر جناح کے مابین چلتی رہی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکی کہ طرفین ایک دوسرے کے وکالت ناموں میں نقص نکالتے رہیں۔ مسٹر جناح نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم لیگ کو تمام مسلمان فرقے کی واحد نمائندہ انجمن تسلیم کیا جائے اور کانگریس صرف ہندوؤں کی جانب سے بولے، کانگریس ان دونوں حالتوں کے تسلیم کرنے سے عاجز تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تسلیم کر ہی نہیں سکتی تھی۔ گفت و شنید کا نتیجہ اتنا بھی نکلا کہ کم از کم لیگ کے مطالبات کی فہرست ہی بن جاتی۔

یہ بات فراموش نہیں کی جاسکتی کہ ملک میں کئی ایک اور بھی مسلمانوں کی جماعتیں ہیں اور وہ لیگ کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتیں۔ میں اُن کے نام ہی جو بتا دوں، ایک تو قوم پرور مسلمانوں کی جماعت ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف نام اختیار کر چکی ہے، پھر احرار ہے جنھوں نے بہت کچھ مستقل مزاجی دکھائی ہے اور قربانیاں کی ہیں۔ پھر جمعیتہ العلماء ہے جو قومی آزادی کے لیے برابر لڑتے اور مصیبتیں جھیلتے رہے ہیں اور جن کا اپنا مخصوص اثر مسلمانوں پر ہے اس لیے وہ مذہب کے عالم اور خدا پرست لوگ ہیں۔ پھر شیعہ ہیں جن کی الگ ایک کانفرنس موجود ہے اور جنھوں نے اپنے لیے الگ تحفظات کا مطالبہ

کیا ہے اور لیگ کے خلاف بھی تحفظ کے خواہاں ہیں اور یہ اس کے باوجود ہے کہ خود مسٹر جناح اور بعض دوسرے چوٹی کے ممبر لیگ میں شیعہ ہیں، پھر مومن ہیں جو مسلمان مردم شماری کا ایک بہت بڑا جزو تو ضرور ہیں۔ اگر یہ نہ کہا جائے کہ انہیں کی اکثریت ہے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ جمعیت بنا رکھی ہے اور انھوں نے کئی مرتبہ بالا علان لیگ کے اس دعوے کی تردید کی ہے، پھر بلوچستان کے قوم پرور مسلمان ہیں جنھوں نے خدام وطن کے نام سے اپنی جماعت بنالی ہے۔ پھر شمالی مغربی سرحد کے خدائی خدمتگار ہیں اور بنگال کی کرشک پرجا پارٹی ہے، اور سب سے آخر میں لیکن کسی سے کم درجے پر نہیں، علامہ مشرقی کے خاکساروں کی جماعت ہے جو لیگ کے ہمنوا اور ہم آہنگ نہیں ہیں اور بہت سے مسئلوں پر اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ان سب جماعتوں کی مردم شماری کا اندازہ مختلف فیہ ہے۔ ان کے حامی کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں انکی اکثریت ہے اور لیگ اس کے خلاف بیان کرتی ہے۔

کانگریس اس بات کو کیسے مان لیتی کہ وہ ہندؤں کی ایک جماعت ہے، اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ وہ اپنے گذشتہ زمانے کے وجود ہی سے انکار کررہی ہے اور اپنی تمام تاریخ کو جھٹلا رہی ہے اور اپنے مستقبل کے ساتھ غداری پر آمادہ ہے۔ اس نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ ہر مذہب و ملت کے ہندوستانیوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ جہاں تک کہ سیاسی اور اقتصادی آزادی کی خواہش کا تعلق ہے وہ ان ہندؤں کی بھی نمایندہ نہیں ہے جو اس سے مختلف اپنے الگ مفاد رکھتے ہوں، اور یہی صورت مسلمانوں اور دوسری مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے متعلق ہے، ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہندؤں کی ایک فرقہ وارانہ جماعت مان لیتی۔ لیگ کا نقطۂ نظر منظور نہ کرنے میں اس نے صرف واقعات اور حقیقت حال کا

ذکر کیا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے لیے تیار تھی کہ مسلم لیگ کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرتی۔ لیکن اس سے مسٹر جناح کا اطمینان نہ ہوا اور گفت و شنید ادھر بیچ میں سے بند ہو گئی۔

اپنے اس بیان کے ثبوت میں صرف چند حوالے دینا کافی ہوں گے۔ ۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے جو خط مہاتما گاندھی کو لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں :- ہم ایک ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اب کسی قسم کے شبہات باقی نہ رہنے چاہئیں آپ آل انڈیا مسلم لیگ کو اس حیثیت سے تسلیم کر لیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی وہی اور صرف وہی اور صرف وہی ایک با اختیار اور نمایندہ جماعت ہے اور دوسری طرف یہ مان لیں کہ آپ کانگریس اور ہندوستان بھر کے دوسرے ہندوؤں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ یہ بنیاد ہے کہ جس پر ہم گفت و شنید میں آگے قدم بڑھا سکتے ہیں اور منزل پر پہنچنے کے لیے کوئی مشین اختراع کر سکتے ہیں۔"[1]

شری سوبھاش چندر بوس سے گفت و شنید کے درمیان مسٹر جناح نے ایک فارمولا ذیل کے الفاظ میں تجویز کیا:

"آل انڈیا مسلم لیگ بہ حیثیت ہندوستانی مسلمانوں کی با اختیار جماعت کے اور کانگریس بہ حیثیت ہندو اہل الرائے کی جماعت کی با اختیار نمایندہ کے مندرجہ ذیل شرائط پر باہم بطور ایک ہیئت کے متفق الرائے ہو گئے ہیں جو کہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ہندو مسلم مسئلہ کو طے کرنے کے لیے ہے۔ مزید غور کے بعد انھوں نے اس طرح بدلا تھا:-

"کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ بہ حیثیت ہندوستانی مسلمانوں کی

---

[1] یونٹی ٹاکس (Unity Talks) صفحہ ۲۸

بااختیاری اور نمائندہ جماعت کے حسب ذیل شرائط پر ہندو مسلم سمجھوتے
کی جو کہ بطور ایک میثاق کے ہے متفق ہے " آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس
عاملہ نے ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پاس کیا " آل انڈیا مسلم لیگ
کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہندو مسلم سمجھوتے کے مسئلے پر کانگریس
کے ساتھ گفت و شنید کرے سوائے اس بنیاد کے کہ مسلم لیگ ہی
ہندوستان کے مسلمانوں کی بااختیار اور نمائندہ جماعت ہے " مسٹر جناح
نے ۲۔ اگست ۱۹۳۹ء کو جو خط شری سوبھاش چندر بوس کو لکھا
اس میں وہ اس سے بھی کچھ اور آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے لکھا تھا
کہ " یہ مجلس اس بات کو ظاہر کر دینا چاہتی ہے کہ وہ اسے اچھا نہیں
سمجھتی کہ ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے اور طے کرنے کے لیے کانگریس جس
کمیٹی کو مقرر کرے اس میں کوئی مسلمان شامل ہو " فروری ۱۹۴۱ء میں
جب مسٹر تیج بہادر سپرو نے مسٹر جناح کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ
اور مہاتما گاندھی باہم مل کر ہندو مسلم اختلافات کو طے کر دیں تو انھوں نے
۱۹ فروری ۱۹۴۱ء کو اس کے جواب میں لکھا کہ

" میں ہمیشہ اس بات کے لیے تیار اور خواہشمند رہا ہوں کہ مسٹر گاندھی سے
یا اور کسی ہندو لیڈر سے جو ہندو فرقے کی جانب سے آئے ملاقات
کروں اور ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لیے جو کچھ بھی میں کر سکتا
ہوں کروں "

یہ مطالبہ بالکل نیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی ایسا مطالبہ نہیں کیا گیا
تھا۔ جس گفت و شنید کا نتیجہ معاہدۂ لکھنؤ کی صورت میں نکلا تھا وہ اس کے بغیر جاری
رہی تھی کہ لیگ نے مسلمانوں کی بااختیار اور نمائندہ جماعت کا لقب اختیار کیا ہو، یا

کانگریس کا نام ہندو رائے عامہ کی ٹھوس جماعت کی با اختیار اور نمائندہ تنظیم رکھا گیا ہو۔ ۱۹۳۵ء میں جو گفتگو مسٹر جناح اور اس زمانے کے صدر کانگریس کے درمیان ہوئی اس قسم کا کبھی کوئی ذکر نہیں آیا، اور بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت مسٹر جناح کانگریس کے ساتھ معاہدہ کرنے کو تیار ہی نہ تھے تاوقتیکہ اس عہد نامے پر ہندو مہا سبھا کی طرف سے پنڈت مالویہ کے دستخط نہ ہوں، اور صرف اسی بنا پر وہ گفت و شنید بند کرنی پڑی تھی کہ صدر کانگریس اس بات کی ذمے داری نہ لے سکتا تھا کہ ہندو مہا سبھا سے بھی اس معاہدہ کی تصدیق کرا دے۔

اس کے بعد اور سنیئے، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے لیگ نے صرف اسی بات پر اصرار نہیں کیا کہ اس کی نمائندہ حیثیت تسلیم کر لی جائے اور اسی پر بس نہیں کیا کہ کانگریس کا نام ایک ہندو جماعت رکھ دیا جائے، بلکہ یہاں تک بڑھ گئی کہ یہ بھی متعین کر دے کہ مسلم لیگ کے ساتھ ہندو مسلم مسئلے پر گفتگو کرنے کیلئے کانگریس کی طرف سے کون آئے اور کون نہ آئے جیسا کہ اس فقرے سے ظاہر ہو رہا ہے جو اوپر لکھا جا چکا ہے۔ جب مہاتما گاندھی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ مسٹر جناح سے یہ گفتگو کرنے کے لیے اپنے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی لے جائیں تو مسٹر جناح نے صاف انکار کر دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی طویل گفت و شنید اور خط و کتابت کے دوران میں جو مسٹر جناح سے ہوئی بار بار یہ کوشش کی وہ نکات معلوم کریں کہ جن کے متعلق مسلم لیگ کا خیال تھا کہ ان پر مباحثہ کی اور انھیں طے کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں انھیں ہمیشہ ناکامی ہوتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک پر زور درخواست کے جواب میں جو انھوں نے محتاج بحث اور محتاج مفاہمت نکات معلوم کرنے کے لیے کی تھی۔ مسٹر جناح اپنے مکتوب مورخہ ۱۷۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں لکھتے ہیں: کہ

شاید آپ نے چودہ نکات کا ذکر سنا ہوگا" اور اس کے بعد انھوں نے ۱۲ جولائی ۱۹۳۶ء کے اخبار اسٹیٹسمین کے ایک مضمون کا حوالہ دیا تھا جس کا عنوان "تھرو مسلم آئز" (مسلمانوں کی نگاہ سے) اور اخبار "نیو ٹائمس" کی یکم مارچ ۱۹۳۸ء کا حوالہ دیا جس کے ایک مضمون میں وہ مختلف تجاویز بیان کی گئیں تھیں جن پر غور کرنا ضروری تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مراسلہ مورخہ ۶ اپریل ۱۹۳۸ء میں ان نکات کا تجزیہ کیا جو اس میں شائع ہوئے تھے اور ان کے متعلق کانگریس کی رائے ظاہر کی تو مسٹر جناح ایکدم سے پلٹ پڑے اور اپنے ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۸ء کے خط میں لکھا کہ:۔

"آپ نے اپنے خط کے شروع میں چند نکات ظاہر کر کے انھیں میری طرف منسوب کیا ہے کہ گویا وہ میری تجاویز ہیں۔"

اور اس کے بعد کسی کو بھی کسی طرح یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون سے نکات ہیں جن پر مسلم لیگ کانگریس سے غور کرانا چاہتی تھی۔

۱۹۳۹ء میں جب جنگ عظیم شروع ہو گئی تو مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن وہ بھی بے نتیجہ رہی۔ اور اس ناکامی کے بعد پنڈت نہرو نے مایوسی کے عالم میں ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یہ لکھا کہ "بدقسمتی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کبھی اس منزل تک بھی نہ پہونچ سکیں گے کہ مختلف فیہ مسائل پر باقاعدہ مباحثہ ہو سکے کیونکہ ابتدائی شرطوں کی صورت میں بہت سے روڑے اور رکاوٹیں ہمارے راستے میں آجاتی ہیں...... چونکہ یہ رکاوٹیں قائم رہتی ہیں اور برابر ان میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوا ہوں کہ اصلی مصیبت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے سیاسی زاویہ نگاہ اور مقاصد میں اختلاف ہے۔"

ایکطرف تو لیگ اور اس کے صدر اختلافی مسائل کی وضاحت کانگریس کے سامنے کرنے کیلئے تیار

نہ تھے تاکہ ان پر تبادلۂ خیال ہو سکے، لیکن دوسری طرف وقتاً فوقتاً وائسرائے سے
اِن میں سے بعض نکات کا تذکرہ انھیں نامرغوب نہ تھا۔ حکومتِ برطانیہ بھی اپنی
طرف سے ان اختلافات سے فائدہ اٹھانے میں کسر نہ اٹھا رکھتی تھی اور اس غرض کے
ملک میں لیگ کی حیثیت کو تقویت پہنچانا ضروری تھا۔ یہ واقعہ ابھی فراموش نہ ہوا ہوگا
کہ وہ مسلم آل پارٹیز کانفرنس ہی تھی جس نے اصرار کیا تھا کہ ہندوستان کے لیے ایک وفاقی
اسکیم بنائی جائے۔ لیکن جب ۱۹۳۵ء کے قانون کے ذریعہ سے اس قسم کی اِسکیم
بنائی گئی تو اس وقت تک لیگ کی اور خصوصیت کے ساتھ مسٹر جناح کی رائے بدل
چکی تھی اور اس تجویز کے اس حصہ پر جس میں وفاق کا ذکر تھا انھوں نے خاص طور
پر حملہ کیا تھا۔ ۱۱ ستمبر کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ وفاق کے قیام کے متعلق تیاریاں جنگ
کے دوران میں بند رہیں گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک ریزولیوشن کے
ذریعہ سے وفاق کے التوا پر اظہار اطمینان کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وفاق کی تجویز
ہمیشہ کے لیے ترک کر دی جائے اور برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ ہندوستان
کے آئندہ دستور اساسی کے مسئلہ پر نظرثانی اور اس کی ازسرِنو تشکیل عمل میں لائی جائے
اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ "اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کے مسئلہ
کے متعلق کوئی اعلان اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ اس کے متعلق آل
انڈیا مسلم لیگ کی رضامندی اور منظوری حاصل نہ ہو جائے اور ملک معظم کی حکومت
اور برطانوی پارلیمنٹ کوئی دستور اساسی بغیر اس قسم کی رضامندی اور منظوری کے
نہ بنائے اور نہ قطعی طور پر اسے اختیار کرے۔"

لارڈ لنلتھگو (Lord Linlithgow) نے ۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء
کو جواب دیا کہ "ملک معظم کی حکومت اس امر کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے کہ
ہندوستان کے اندر کسی قسم کی بھی آئینی ترقی کے لیے مسلمانوں کے فرقہ کی رضامندی

حاصل کرنا کس قدر اہم ہے اس لیے آپ کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں آپ کے فرقے کی رائے کو اپنی حیثیت کی بنا پر جو وقعت اور وزن حاصل ہے اس کا اندازہ کمی کے ساتھ کیا جائے گا۔" مسٹر جناح نے وائسرائے سے ۶ فروری سنہ ۱۹۴۰ء کو ملاقات کی اور اس ملاقات کے بعد جو سرکاری کمیونکے شائع ہوا اس میں یہ تحریر تھا کہ "ہز ایکسی لینسی نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ ملک معظم کی حکومت اس ضرورت سے پورے طور پر باخبر ہے کہ تمام اقلیتوں کے جائز مفاد کا تحفظ بسا ضروری ہے اور مسٹر جناح کو یہ اندیشہ نہ کرنا چاہیئے کہ رعایا کے ان طبقوں کی اہمیت کبھی نظر انداز کردی جائے گی۔" لیکن مسلم لیگ کی تشفی اس وعدے سے بھی نہ ہوئی۔ لیگ کی مجلس عاملہ کی رائے کی تفصیل لکھتے ہوئے مسٹر جناح نے مندرجہ بالا فقرہ نقل کرنے کے بعد اپنے مکتوب مورخہ ۲۳ فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں وائسرائے کو لکھا کہ "مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ جو سوال مسلم لیگ نے اٹھایا ہے اس (وعدہ) سے اس کا تدارک نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کے باوجود لوکر ڈراکومیوں کی حیثیت بس یہ رہ جاتی ہے کہ وہ مشورے اور مشاورت کیا کریں اور آخری فیصلے کے اختیارات برطانیہ عظمیٰ کے ہاتھ میں ہوں کہ وہ جس طرح چاہے برطانوی ہندوستان کی قسمت اور مستقبل کے متعلق فیصلہ صادر کردے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس حیثیت کو قبول نہیں کرسکتے۔" انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ایک صاف اور قطعی وعدہ کیا جائے کہ "ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے یا درمیانی زمانے کے سمجھوتے کے متعلق کسی دوسری جماعت کو بغیر ہماری رضامندی اور منظوری کے کوئی قول نہ دیا جائیگا۔" حکومت برطانیہ نے وائسرائے کے وسیلے سے ایک مرتبہ اور کوشش کی اور وزیر ہند نے پارلیمنٹ کے ایوان امرا کے سامنے یکم اپریل سنہ ۱۹۴۰ء کو ایک تقریر کی جسے وائسرائے نے ایک دوسرے خط کے ذریعہ مسٹر جناح تک پہنچایا۔ وہ بیان حسب ذیل تھا:-

ملک معظم کی حکومت نے جو یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ وہ ہندوستان کی تمام جماعتوں اور تمام مفادوں کے نمایندوں کے مشوروں کے ساتھ آئینی میدان کا امتحان کرے گی اس کا مقصد حکم دینا نہ تھا بلکہ گفت و شنید کرنا۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے مابین ایک پایدار

سمجھوتے اور اقرار نامے کی ضرورت ہے مگر ایک متحدہ ہندوستان کے اس خواب کی تعبیر دیکھنی منظور ہے جس کے لیے کہ اتنے بہت سے ہندوستانی اور انگریز محنت و کوشش کرتے رہے ہیں، کیونکہ میں کسی طرح یقین نہیں کر سکتا کہ اس ملک میں حکومت یا پارلیمنٹ کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ ملک معظم کی آٹھ کروڑ مسلم رعایا کے سر ایک ایسا دستور اساسی زبردستی تھوپے گی۔ جس دستور کے ماتحت وہ پرامن اور با اطمینان زندگی نہ بسر کر سکیں۔ لیگ کی مجلس عاملہ اس مزید تشریح و توضیح سے بھی مطمئن نہ ہو سکی اور مسٹر جناح ایک مرتبہ پھر ۲۵ جون سنہ ۱۹۴۰ء کو وائسرائے سے ملے، اور انھیں اپنے وہ نکات کہ جن پر تبادلۂ خیالات عمل میں آیا تھا لکھ کر اپنے یکم جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کے خط کے ساتھ بھیجے اس خط میں مندرجہ ذیل نکات تھے۔

(۱) ملک معظم کی حکومت کوئی ایسا اعلان نہ کرے گی نہ بیان دے گی جو کسی طریقے پر ان بنیادی اصولوں کے خلاف ہو جو لاہور کے ریزولیوشن میں ہندوستان کی تقسیم کے متعلق، اور شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مسلم ریاستیں بنانے کے متعلق ہیں۔

(۲) ملک معظم کی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو واضح اور قطعی طور پر یقین دلائے کہ برطانوی حکومت کوئی عارضی یا قطعی اسکیم دستور اساسی کی بہتیر سے مسلمانان ہند کی رضامندی اور منظوری حاصل کیے بغیر اختیار نہ کرے گی۔

(۳) جنگ کے متعلق کوششوں کی زیادتی، اور ہندوستان کے وسائل جنگ کی فراہمی اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکومت برطانیہ یہ چاہے اور اس کے لیے تیار ہو کہ مسلمان لیڈروں کو مرکز اور صوبوں دونوں کی حکومتوں میں برابر کے شریک کی حیثیت سے ملایا جائے۔ بالفاظ دیگر اسلامی ہندوستان کے لیڈروں پر برابر کا اعتماد کیا جائے اور انھیں مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں اختیار کا برابر حصہ ملے۔

(۴) عارضی طور پر اور زمانۂ جنگ کے دوران میں مندرجہ ذیل باتیں عمل میں لائی جائیں:-

(ا) موجودہ دستور اساسی کے ڈھانچے میں رہ کر وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع کی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ مسلمانوں کی نمایندگی کانگریس کے شامل ہونے کی صورت میں تو ہندوؤں کے برابر ہو ورنہ بصورت دیگر مسلمانوں کو ممبروں کی بڑھی ہوئی تعداد میں حصہ غالب ملے، اور اس صورت میں ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد کی جائے۔

(ب) ایک جنگی کونسل بنائی جائے جس میں کم از کم پندرہ ممبر ہوں بشمولیت وائسرائے جو کہ اس کے صدر ہوں۔ اس میں مسلمانوں کی نمایندگی کانگریس کے شامل ہونے کی صورت میں تو ہندوؤں کے برابر ہو ورنہ انکو اکثریت حاصل ہو۔

(ج) آخری بات یہ ہے کہ مجوزہ جنگی کونسل کے لیے اور گورنر جنرل کی کونسل کے لیے نمایندے اور گورنروں کے اضافہ شدہ مشیر مسلم لیگ منتخب کرے۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وائسرائے اس سے یہ نہ سمجھ لیتا کہ فی الحقیقت مطالبہ اس بات کا ہے کہ حکومت کے اختیارات مسلم لیگ کے ہاتھوں میں دیئے جائیں، اور بنابریں اس نے ۶ جولائی ۱۹۴۰ء کو اس کے جواب میں لکھا کہ اگرچہ وہ مسلمانوں کے مفاد کی پوری پوری نمایندگی کی اہمیت کو بخوشی منظور کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ذمہ داری کمی یا بیشی کے ساتھ کسی بھی فرقے کے حصے میں آئے۔ انھوں نے لکھا کہ " ذمہ داری تو تمام تر گورنر جنرل ان کونسل ہی کے ذمہ رہے گی۔ دوسرے یہ بات تو صاف ہے کہ موجودہ قانون اور موجودہ طریق عمل کے مطابق یہ اختیار صرف وزیر ہند کو پہنچتا ہے کہ وہ گورنر جنرل کے مشورے سے ان ناموں کا فیصلہ کرے جو وہ ملک معظم کی خدمت میں گورنر جنرل کی کونسل میں شمولیت کے لیے پیش کرنا چاہتا ہے اور یہ لوگ کسی بھی سیاسی جماعت کے نامزدہ نہیں ہوسکتے خواہ وہ کتنی بھی اہم جماعت ہو۔" آگے چل کر وائسرائے نے یہ بھی لکھا کہ " میں خیال کرتا ہوں کہ مجھے یہ بات صاف کر دینی چاہیے کہ قانوناً یہ بالکل ناممکن ہوگا کہ ایسے مسلمان صاحبان کا انتخاب جو کہ میری وسعت دادہ ایگزیکیٹو کے لیے یا بطور غیر سرکاری مشیروں کے چنے جائیں، مسلم لیگ پر چھوڑا جاسکے۔ لیکن اس اتفاقی ضرورت

کہ جو رونما ہو گئی ہے آپ کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیئے کہ جو تجویز بھی آپ پیش کریں گے اس پر پوری توجہ نہ دی جائے گی۔"

۷۔ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کو وائسرائے کا ایک بیان شائع ہوا جس میں حکومت کی پالیسی کا ذکر تھا۔ حکومت کے گزشتہ اعلانات کا جو کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون کا پورا جائزہ لینے کے متعلق تھے جبکہ ہندوستان کے دستور اساسی پر نظر ثانی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا تھا کہ حکومت اپنی ذمہ داریوں کو جو ہندوستان کے امن اور فلاح کے متعلق اس پر عائد ہیں کسی ایسے طرز حکومت کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی جس کے اختیارات کا انکار ہندوستان کی قومی زندگی کا کوئی بڑا اور طاقتور عنصر کرے، نہ حکومت ایسے عناصر کو بالجبر دبا کر حکومت کے سامنے جھکا دینے کے کام میں شرکت کر سکتی ہے۔ انھوں نے حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا کہ جنگ کے خاتمے پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے گی جو ہندوستان کی قومی زندگی کے نمائندوں پر مشتمل ہو تاکہ وہ ایک نئے دستور اساسی کا خاکہ تیار کریں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت کا ارادہ ہے کہ ہندوستانی نمائندوں کی ایک خاص تعداد کو گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل میں شرکت کی دعوت دے اور ایک جنگی انجمن مشاورت قائم کرے۔ مسٹر ایمرے نے جب وائسرائے کی اس پیش کش کا برطانوی دارالعوام میں تذکرہ کیا تو ہندوستان کے اختلافات پر بہت کچھ زور دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ "ہندوستان میں جدوجہد ہو رہی ہے وہ زیادہ تر حکومت اور ایک متحد الخیال مخالف جماعت کے درمیان نہیں ہے بلکہ خود ہندوستانی قومی زندگی کے خاص عناصر کے درمیان ہے۔ اسلیے اس گتھی کا سلجھاؤ اس آسان طریقے پر نہیں ہو سکتا کہ ملک معظم کی حکومت اور ہندوستان کے نمائندوں میں تصفیہ ہو جائے بلکہ نسبتاً اس مشکل طریقہ پر ہو سکتا ہے کہ جسمیں بہت سے پہلو ہیں اور جسمیں ملک معظم کی حکومت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ بھی متعلقہ جماعتوں میں سے ایک ہے" دوسری جماعتوں کی توضیح میں انھوں نے مسلمانوں کا، اچھوتوں کا، اور دیسی فرماں رواؤں کا نام گنایا۔ اسی تقریر میں آپ نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان ایک مستغنی عن الغیر ملک اور دنیا کا ایک ممتاز علاقہ ہے، اور یہ کہ وہ اپنی ایک قدیم تہذیب پر اور ایک ایسی طویل تاریخ پر کہ جس میں اس کی تمام قومیں شریک ہیں ناز کر سکتا

ہے۔ اب یہاں سے ہماری نگاہیں مثلث کے تیسرے ضلع یعنی قاعدے کو آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ بڑھتا ہوا محسوس کرتی ہیں، جہاں ایک طرف جمہوریت کے اصولوں کی انتہائی تعظیم کی جاتی ہے۔ وہیں یہ ہندوستان کی قومی زندگی کے عناصر کی پیٹھ تھپکی جاتی، یا منہ پیٹا جاتا ہے جیسا بھی ضرورت اور مصلحت وقت کے مطابق ہو۔ کسی بھی آئینی ترقی کے لیے سمجھوتے کے ٹھوس اور پائیدار ذرائع کی تلاش ہوتی ہے اور اس پر اصرار ہوتا ہے، اور سیاسی جمود کے متعلق یہ فتوے صادر کردیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ کے مابین نہیں ہے بلکہ خود ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور مختلف مفادوں کے مابین ہے۔ جس وقت مسلم لیگ اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ جو آئینی دستور بنایا جائے اس کے لیے پہلے سے مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی ضروری ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مختلف مجالس کے لیے مسلمان نمایندوں کے منتخب کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے تو پہلے مطالبے کا جواب تو اس طریق پر دیا جاتا ہے کہ اس جواب میں ہندوستان کے سب فرقے شریک ہیں اور وہ سب فرقوں کے لیے عام ہے، لیکن دوسرے مطالبہ کا جواب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کردیا جاتا ہے۔ جب مسلم لیگ یہ مطالبہ پیش کرتی ہے کہ شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کردیا جائے تو فوراً ہندوستان کو اپنی گذشتہ تواریخ یہ کہہ کر یاد دلادی جاتی ہے کہ اس کی تہذیب بہت پرانی اور اس کی تاریخ جس میں اس کی سب قومیں شریک ہیں، بہت لمبی چوڑی ہے اور اسی ضمن میں یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستان تو ایک مستغنی عن الغیر اور دنیا کا دنیا سے الگ اور ممتاز گوشہ ہے۔ لیگ کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کے اعلان پر جہاں تک کہ اس کا تعلق آئندہ دستور اساسی سے تھا اظہار پسندیدگی کیا، لیکن اس مخصوص پیش کش کو جو وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع کے متعلق تھی ناقابلِ اطمینان بتایا۔ وائسرائے کی اس پیش کش سے لیگ مطمئن نہ ہوسکی کہ ایگزیکیوٹو کونسل کے لیے لیگ جو چار نام پیش کرے گی ان میں سے دو کا انتخاب کرلیا جائیگا، اور نہ اسی قسم کی جو پیش کش وائسرائے کی مشاورتی مجلس کے متعلق کی گئی تھی اسی سے مسلم لیگ کو اطمینان ہوا۔ بعد کی گفت وشنید سے بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کو مسٹر جناح

نے آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے جلسہ میں۔ بیان کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ کا کوئی ارادہ نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے اختیاراتِ حکومت چھوڑے اور یہ کہ وہ نوکروڑ مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہی ہے کہ جو ایک قوم ہیں۔ اس طرح کچھ عرصہ کے لیے اس کوشش کا انجام ناکامی پر ہوا جسے مسٹر جناح نے مسلم لیگ اور حکومت برطانیہ کے درمیان معاہدۂ جنگ کا لقب دیا تھا۔

اسی سال کے ختم کے قریب کانگریس نے وہ تحریک شروع کی جس کا نام انفرادی سول نافرمانی کی تحریک تھا اور جس کا مقصد تقریر کی آزادی کا حق قائم کرنا تھا۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ اس تحریک کا مسلمانوں پر یا لیگ پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا، اور جس حق کے حاصل کرنے کے لیے وہ شروع کی گئی تھی اس سے مسلمان بھی اسی حد تک مستفید ہوسکتے تھے کہ جیسے کوئی اور۔ لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ نے اسے مسلمانوں کے خلاف تحریک سمجھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ: "انہیں مسٹر گاندھی کا اصل مقصد خوب معلوم ہے جو اس ستیاگرہ کی تحریک کو شروع کرنے اور پوری کوشش کے ساتھ اسے چلانے سے ہے۔ برطانوی حکومت کو توجہ دلائی کہ اگر کانگریس کے ساتھ کوئی رعایت ایسی کی گئی کہ جو مسلمانوں کے خلاف اور ان کے مطالبے کے لیے مضرت رساں ہو تو مسلم لیگ اپنی پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کرے گی، اور مسلم لیگ اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہتی ہے کہ اگر صورتِ حالات نے مجبور کیا تو وہ مداخلت کرنے میں پس و پیش نہ کرے گی اور اس جھگڑے میں وہ سب کچھ کرے گی جو اس ملک کے مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کے لیے ضروری ہو۔"

اس کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس اپریل ۱۹۴۱ء میں مدراس میں ہوا اور لیگ کے دستور اساسی میں اس قسم کی ترمیم کی گئی کہ اس میں عقیدہ کے طور پر پاکستان شامل ہوسکے۔

برطانوی حکومت اور مسلم لیگ کے درمیان سودے کی کارروائیوں کی دوسری منزل وہ تھی کہ جو کرپس کی پیش کش کے نام سے مشہور ہے۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس جو کہ برطانیہ کی جنگ کی کابینہ کے ایک ممبر تھے ہندوستان آئے اور اپنے ہمراہ حکومت برطانیہ کی پالیسی اور تجویز کے متعلق ایک اعلان بھی لائے۔ اس میں یہ تجویز تھی کہ ایک نیا اتحادِ ہند بنایا جائے جو کہ تاجِ برطانیہ کی

نوآبادیات کے درجہ کی ایک نوآبادی بن جائے۔ اس میں وہ دستور العمل بھی دیا ہوا تھا کہ جس کے مطابق ہندوستان کے لیے نیا دستور اساسی بنایا جائے، اور ملک معظم کی حکومت نے اس کا ذمہ لیا تھا کہ دستور اساسی کو منظور کرے گی اور اس کے مطابق عملدرآمد کرائے گی اس شرط کے ساتھ کہ برطانوی ہند کے ہر ایک صوبے کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر وہ اس نئے دستور کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو حق حاصل رہے گا کہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت کو برقرار رکھے اور اس کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ اگر آئندہ کسی موقع پر وہ اس دستور کے اندر شامل ہونے کا فیصلہ کرے تو ایسا کر سکتا ہے۔ یہ بھی مذکور تھا کہ ملک معظم کی حکومت اس کے لیے بھی تیار ہوگی کہ ایک نیا دستور اساسی ان صوبوں کے لیے بنایا جائے کہ جو اتحاد ہند میں شامل نہیں ہیں اور انہیں بھی وہی درجہ دیا جائے جو اتحاد ہند کا ہو۔ اعلان میں ہندوستانی لیڈروں کو اس بات کی دعوت بھی دی گئی تھی کہ ملک کی کونسلوں میں شریک ہوں اور ہندوستان کے تحفظ کا سب کام چلانا اور اس پر قبضہ حکومت ہند کے ہاتھ میں رہے۔

اس طرح اس اعلان نے برطانوی ہند کی ہر ایک ریاست کو یہ حق دیدیا کہ وہ اپنے آپ کو آل انڈیا یونین سے الگ رکھ سکتی ہے، اور مسلم لیگ کا یہ مطالبہ کہ اتحاد ہند سے الگ اور خودمختار ایک مسلمانوں کی ریاست قائم کی جائے تقریباً منظور کر لیا گیا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ اس پیش کش کو اس بنا پر مسترد کر سکتی تھی کہ اس سے اتحاد ہند کی شکست عمل میں آتی تھی، لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ اس کے خلاف اس نے صاف کہدیا کہ کانگریس ایسا خیال بھی نہیں کر سکتی کہ کسی صوبے کے باشندوں کو اتحاد ہند کے اندر شامل رہنے پر مجبور کرے درحالیکہ ان کی ظاہر کردہ اور مستقل رائے اس کے خلاف ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتادیا کہ اس اتحاد کی شکست خواہ وہ کسی وجہ سے ہو سب متعلقہ فرقوں کے لیے مضرت رساں ہوگی۔ کانگریس نے اس پیش کش کو اس بنا پر مسترد کیا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں جو ذمہ داری دی گئی ہے اس کے حلقہ اثر سے تحفظ ہند کا محکمہ باہر ہے اور اس لیے جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ نہ ملنے کے برابر ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو گیا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے پیش کش کو مسترد کر دیا ہے،

اور اس وقت یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ اپنی موجودہ شکل میں یہ تجاویز ناقابل قبول ہیں۔ اس نے اس بات پر اظہار خوشنودی کیا کہ پاکستان کا امکان مبہم الفاظ میں تسلیم کر لیا گیا۔ اور اپنا یہ اعتقاد بھی ظاہر کیا کہ ایسی دو قوموں کو اتحاد ہند بنانے پر مجبور کرنا کہ جو الگ الگ دو مستقل قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان نہ کوئی منصفانہ فعل ہوگا اور نہ امن اور خوش حالی کے پیش نظر ممکن ہی ہوگا۔ اور اعلان کا بظاہر یہی خاص مطلب ہے کہ اتحاد قائم کیا جائے اور بہت دور کے بالکل خیالی امکان کے طور پر دو الگ الگ اتحادوں کو الگ نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ مسلم لیگ نے اس اعلان پر یہ بھی اعتراض کیا کہ دستور اساسی بنانے والوں کا انتخاب بھی مسلمانوں کے اس بنیادی حق سے گریز ہے کہ وہ اپنے نمایندوں کا انتخاب جداگانہ طریق پر کریں۔ اس طریقے کے متعلق بھی جو کسی صوبے کی رائے اتحاد میں شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا مسلم لیگ نے ایک اعتراض کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ایسی صوبوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو تمام بالغوں کو حق رائے دہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ صرف مسلمانوں کو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اُن کو اُن کے حکومت خود اختیاری کے پیدائشی حق سے محروم کرنے کا ہم معنی ہوگا۔ اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جب کہ برطانوی حکومت نے ہر ایک صوبے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اتحاد ہند سے باہر رہ سکتا ہے، اور وہ اس کے لیے یہ قاعدہ بناتی ہے کہ اس خواہش کا فیصلہ مجلس مقننہ میں ساٹھ فی صدی رایوں کی اکثریت سے کیا جائے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر علیحدہ رہنے کا مطالبہ، اقلیت کی طرف سے کیا جائے اور رائے شماری کے ذریعہ سے کیا جائے جس میں رائے دینے کا حق ہر بالغ مرد کو حاصل ہو، تو مسلم لیگ اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ مجلس مقننہ کی رائے صوبے کے مسلمانوں کی عام رائے کا صحیح معیار نہیں ہو سکتی، اور اس بات پر بھی مصر ہے کہ بالغوں کا حق رائے دہی صرف مسلمانوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اقلیت اگر قریب قریب پینتالیس فی صدی کی بھی ہو جیسی کہ بنگال اور پنجاب میں ہے تو اس کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں اور ایسے اہم مسئلے کے

ں بھی کر جیسے ہندوستان کی تقسیم ہے اس کی کہیں کوئی آواز ہی نہ ہو، اور اسے اس کی مرضی
وقت کیے بغیر اپنے ان ہم وطنوں سے کھینچ کر جدا کر دیا جائے جن کے ساتھ وہ سدا سے رہتا
ہے۔

جب کرپس مشن ناکام ہو چکا تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بمبئی کے اجلاس میں جو ۱۔
ت سے ۹۔ اگست ۱۹۴۲ء تک ہوا تھا اپنا وہ یادگار ریزولیوشن پاس کیا جو "کوئٹ انڈیا"
ندوستان چھوڑ دو) ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ اس اجلاس میں بھی پیشتر کے مختلف
جلاسوں کی طرح یہ اعلانات کانگریس کی طرف سے کیے گئے تھے کہ وہ اختیارات اپنے لیے نہیں چاہتی
ہندوستان کے باشندوں کے لیے چاہتی ہے اور یہ کہ اگر حقیقی قوت کے ساتھ مسلم لیگ ہی کو اختیار مل جائیں تب بھی وہ مطمئن ہو جائیگی
لیکن جب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۶۔ اگست سے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۲ء تک ہوا تو
اس نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا:۔

مجلس عاملہ کی یہ پختہ رائے ہے کہ یہ تحریک صرف اسی لیے نہیں ہے کہ انگریزوں کو
مجبور کیا جائے کہ اختیارات صرف چند ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دیں اور اس طرح اس
قابل نہ رہیں کہ جو اخلاقی ذمہ داریاں ان پر عائد ہیں اور جو وعدے انھوں نے مسلمانوں سے
اور ہندوستان کے دیگر فرقوں سے وقتاً فوقتاً کیے ہیں انھیں پورا کر سکیں، بلکہ تحریک کا مقصد
یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو بھی اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ کانگریس کے حکم کے آگے سر
جھکا دیں اور اس کی شرطیں مان لیں ......! حکومت برطانیہ کو یہ پیش کش کرنے کے بعد
کہ لیگ اس بات کے لیے تیار ہے کہ مساوات کی بنیاد پر ذمہ داریاں قبول کر لے بشرطیکہ
اس کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں، لیگ کی مجلس عاملہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ
وہ اس تحریک سے بالکل الگ رہیں جو کہ کانگریس نے شروع کی ہے۔ اس کے بعد سے اس
تحریک کو مسلمانوں کے خلاف تحریک مان لیا گیا اور اس وقت سے لیگ کے پروپگنڈا کرنے
والے برابر اس بات پر زور دینے لگے کہ قبل اس کے کہ کانگریسی قیدی رہائی پائیں اور سیاسی جمود کو ختم

کرنے کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اپنا اگست کا ریزولیوشن واپس لینا چاہیئے برابر کانگریس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے جاپان کے ساتھ سازش کرلی ہے اور اس کے بعد بھی لگاتے رہے ہیں کہ جب حکومت برطانیہ نے اس الزام کو ترک کردیا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۴ء میں مہاتما گاندھی کی مسٹر جناح سے لمبی چوڑی گفت و شنید بے کار ثابت ہوئی، اور اس سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ مسٹر جناح اپنے پاکستان کا ایک صحیح نقشہ اور ایک مکمل تصویر ہی دیدیں جس میں کہ پاکستان کی حدود متعین ہوں، اس کے دستور اساسی کی کوئی ابتدائی تشکیل ہو، اور اس کے اندر جو اقلیتیں رہیں گی ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت ہو۔

وقفہ کے زمانے کے لیے ایک عارضی سمجھوتے کے متعلق ویول تجاویز جون ۱۹۴۵ء میں کی گئی تھیں جن کے متعلق یہ مسلّمہ تھا کہ انکا کوئی اثر آئندہ بننے والے دستور اساسی پر نہ پڑیگا۔ ایک بنیادی چیز ان تجاویز میں یہ تھی کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں ہندو مسلمان اور اچھوت ذات کے نمایندے مساوی تعداد میں ہوں اور اس طرح جس چیز پر لیگ برابر زور دے رہی تھی یعنی صوبوں کی حکومتوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کا ہندوؤں کے ساتھ مساوی حصہ وہ چیز تسلیم کرلی گئی۔ مسلم لیگ اور مسٹر جناح نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہندوستان کی اقلیتوں کو اپنے دامن میں پناہ دے رکھی ہے اور جب کبھی انھوں نے اپنے مطالبات پر زور دیا ہے تو ہمیشہ سب متعلقہ جماعتوں پر یہ اثر بھی ڈالا ہے کہ ہندو اکثریت بالخصوص کانگریس جو ایک زمانے میں "ہندوؤں کی مجموعی رائے کی با اختیار اور نمایندہ جماعت تھی" اب اس بات پر آمادہ ہوگئی ہے کہ "اقلیتوں کو دبائے اور ستائے"۔ انھوں نے اچھوت ذاتوں کو ہندوؤں سے الگ کوئی چیز سمجھ لیا ہے اور ایک ایسی اقلیت بنا دیا ہے کہ جس کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ برطانوی حکومت ہمیشہ اس فکر میں رہتی ہے کہ لیگ کو ایک پاسنگ کی طرح ہمیشہ اپنے سیدھے ہاتھ کو رکھے تاکہ ہندوستان کے عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا بوجھ برابر کیا جاسکے جس کی نمایندگی کانگریس کرتی ہے، اور اس مقصد کے لیے رعایتوں پر رعایتیں کیے جارہی ہے۔ تاکہ لیگ کے روز افزوں مطالبات کو پورا کرسکے، اور یہ آخری پیش کش کہ مسلمان نمایندوں کی تعداد ان ہندوؤں کے مساوی ہو کر جو اچھوت ذات

سے تعلق نہیں رکھتے حکومت کی ایسی تشفی بخش پالیسی کے عین مطابق تھی۔ لیکن پیشتر کی طرح اس موقع پر بھی وہ تشفی بخش ثابت نہ ہوئی اور مسٹر جناح کی اس عندیے کہ کونسل کے لیے مسلمان ممبروں کے انتخاب کا حق انکے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے پیش کش کو ناکام کر دیا، اور لارڈ ویول نے ناکامی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی جیسی کہ وہ درحقیقت تھی بھی۔ لیکن شملہ کی کانفرنس کی ناکامی کا ایک اور دلچسپ شاخسانہ بھی پھوٹا۔ اس کے نتیجے کے طور پر مسلم لیگ کا ایک اور نیا مطالبہ نکل آیا۔ جس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ اس بات کی طالب نہیں ہے کہ غیر اچھوت ہندوؤں کے ساتھ اسے مساویانہ حصہ ملے بلکہ اب وہ اچھوتوں اور دیگر تمام مشترکہ اقلیتوں کے ساتھ بھی مساوات کی طلبگار ہے۔ شملہ کانفرنس کے بعد مسٹر جناح نے ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو اخباری نمایندوں کے ایک جلسے میں حسب ذیل بیان دیا تھا۔

"پھر اس مجوزہ ایگزیکیوٹو میں ہماری اقلیت ایک تہائی کی رہ جائے گی۔ دوسری تمام اقلیتوں کا جیسے کہ سکھ اور عیسائی وغیرہ ہیں نصب العین وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ انھیں اپنے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کچھ شکایات ضرور ہیں لیکن انکا نصب العین اور مقصد ایک متحد ہندوستان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ نسل اور تہذیب کے لحاظ سے وہ ہندوؤں سے بہت ہی قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔ میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ تمام اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا جائے۔ ان کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت ہونی چاہیئے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ لیکن عملاً ہمیشہ لازمی طور پر یہی ہو گا کہ ان کی رائے ہماری مخالفت میں جائے گی، اور وائسرائے کے مخصوص اختیارات کے سوا ہمارے پاس اپنے تحفظ کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، اور جبکہ ہر آئین کے واقف کار کو معلوم ہے یہ ویٹو ہر موقع پر، اور روزمرہ کے کاموں میں اکثریت کے فیصلوں کے خلاف ان پالیسیوں اور اصولوں کے متعلق استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ جو بنائے جائیں گے اور نہ ان تدابیر کے خلاف اسکا استعمال ہو سکتا ہے جو قانونی اور انتظامی کارروائیوں کے متعلق عمل میں لائی جائیں گی"۔ اب اس سے یہ بات

صاف ظاہر ہو گئی کہ ایک اقلیت کے تحفظ کی اور کوئی صورت نہیں ہے بجز اس کے کہ یا تو
اسے اکثریت بنا دیا جائے یا کم از کم بقیہ سب جماعتوں کے برابر کر دیا جائے۔ اس مقام سے
آگے بڑھنے سے پہلے اس طرف اشارہ کر دینا مناسب ہو گا کہ مسٹر جناح نے اس بیان میں
دوسری اقلیتوں کے تحفظ کا عذر چھوڑ دیا ہے، اب وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ جو مقصد اور
نصب العین کانگریس کا ہے وہی نہ صرف اچھوت ذاتوں کا ہے جنہیں وہ اب تک، اقلیت
سمجھتے ہیں بلکہ سکھوں اور عیسائیوں کا بھی ہے اور انہیں اندیشہ ہے کہ جب اس کے مطابق
کام کیا جائے گا تو ان کی رائے لازمی طور پر کانگریس کی طرف اور لیگ کی مخالفت میں جائیگی۔
وائسرائے کا ویٹو کا اختیار بھی کہ جو مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی تنہا ضمانت ہے اس
معاملہ میں بیکار اور محض ایک فریب ثابت ہو گا۔ اب قابل غور چیز یہ ہے کہ کیا لیگ کی پالیسی
اور لیگ کے نصب العین کی اس سے زیادہ کوئی اور بھی توہین ہو سکتی ہے کہ اسے تمام
ہندوستان میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ جو اس کی حمایت کرنے والا ہو، حتیٰ کہ ان مسلمانوں
میں سے بھی کوئی اس کا حامی نہیں ہے کہ جن کو اس نے ممبری کے لیے نامزد نہ کیا ہو۔

باب (۱۶) دوسرے حصّہ کا خلاصہ

ہم نے کافی طوالت کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلے کی تاریخ سے بحث کی ہے بالخصوص
اس حصّے سے کہ جو مسلمانوں کا مسئلہ ہے، اور برطانوی حکومت نے جو حصّہ اس میں لیا ہے۔
یہاں ہم اس تمام بحث کا خلاصہ اسے چند حصوں میں تقسیم کر کے کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے وہ زمانہ ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی اختیار اور
اقتدار حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اور ہندوستان میں برطانوی راج کو قائم کرنے میں مصروف
تھی۔ اس وقت اس کا اسی لاکھوں برس پرانی پالیسی پر عمل تھا کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔

اور اس کی مشق اس طرح ہوتی تھی کہ دیسی فرماں رواؤں میں ایک کی جنبہ داری دوسرے کے خلاف لیلی۔ اور دونوں کو ایک بدیشی کمپنی کے خلاف آپس میں متحد نہونے دیا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سال ختم ہوتے ہوتے خود مختار دیسی فرماں روا تقریباً سب کے سب یا تو زیر کرلیے گئے تھے یا ان سے دوستی کرلی گئی تھی اور مغل شہنشاہ دہلی کے تخت پر محض ایک گڈا بنکر رہ گیا تھا کہ جسے کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ جو باقی رہ گئے تھے انھیں بھی جلد ہی ختم کردیا گیا۔

دوسرے دور میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف بہانوں سے اور طرح طرح کے عذرات پر مختلف دیسی حکومتوں کا الحاق عمل میں آتا رہا اور کمپنی کی حکومت کو استحکام پہنچتا رہا۔ اس بدیشی حکومت کے خلاف عام ناراضی بہت گہرائی تک پھیل گئی تھی۔ مسلمانوں کو نہ صرف اس بات کا صدمہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے حکومت اور اختیارات نکل گئے بلکہ یہ بھی کہ مادی خوش حالی بھی ان سے دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ اصلاح حالات کے لیے ایک تحریک شروع کی گئی لیکن اس نے سکھوں کے خلاف جہاد کی صورت اختیار کرلی جو اس زمانے میں پنجاب پر حاکم تھے۔ حکومت برطانیہ نے اگر اس جہاد کی باقاعدہ کوئی ہمت افزائی نہ بھی کی تو کم سے کم یہ تو کیا کہ خاموشی کے ساتھ الگ بیٹھی دیکھتی رہی اور اس وقت تک کوئی مداخلت نہ کی کہ جب تک سکھ برطانوی علاقے کی شمال مغربی سرحد پر ایک خود مختار طاقت تھے، لیکن جبھی کہ پنجاب سکھوں کے ہاتھوں سے نکال لیا گیا تو اس جہاد کی تحریک کو بہت جلد کچل دیا گیا۔

ناراضی اور بددلی کی آگ جو آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی ۱۸۵۷ء میں ایک بغاوت کی صورت میں بھڑک اٹھی جس میں کہ ہندو مسلمان دونوں نے حصہ لیا اور دہلی کے شہنشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ بغاوت کی کوششیں ناکام رہیں اور سلطنت مغلیہ کو بالکل ختم کردیا گیا، اور ہندوستان کی شہنشاہی انگلستان کی ملکہ کی طرف منتقل کردی گئی۔ بغاوت کے بعد سخت تشدد آمیز کارروائیاں کی گئیں جن میں مسلمانوں کو حد سے زیادہ نقصان پہنچا۔ غدر

کے بعد جو نفرت دعمل میں آیا تھا اس کے اثرات سے سنبھلنے کے لیے ملک کو کئی برس لگ گئے
ہندوؤں نے اس انگریزی تعلیم سے فائدہ اٹھایا کہ جو رائج کی گئی تھی لیکن مسلمان
اس سے روٹھے رہے اور اس لیے تعلیم میں پیچھے رہ گئے۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں
کے تعلیمی سدھار کی تحریک شروع کی اور علی گڑھ کالج قائم کیا۔ سیاسی دنیا میں ۱۸۸۵ء انڈین نیشنل
کانگریس وجود میں آئی، اور اس طرح تمام انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لیے ایک پلیٹ فارم
قائم ہوگیا کہ جہاں وہ تمام صوبوں سے آکر آپس میں ملیں اور ایسے مسئلوں پر باہم تبادلۂ خیال کرسکیں
کہ جو عام دلچسپی اور اہمیت کے ہوں اور حکومت کے سامنے شکایات دور کرنے کے لیے اپنی
تجاویز پیش کیا کریں۔ ایک انگریز مسٹر بیک نامی علی گڑھ کالج کا پرنسپل مقرر ہوا، اور اس نے
صرف طالبعلموں کی ذمہ داری لینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی سیاست پر بھی
حاوی ہوگیا۔ سر سید احمد خاں نے اس کے اثرات سے متاثر ہوکر مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ
کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ بہت سے مسلمان پھر بھی کانگریس سے علیحدہ نہ ہوئے، لیکن علی گڑھ
کالج برابر اس غرض سے استعمال ہوتا رہا کہ انگلستان کے قدامت پرستوں سے اپنا ناتا جوڑے
رکھیں، اور ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی ترقی کے متعلق انگریزوں پر بھروسہ رکھیں۔ پیٹریاٹک
ایسوسی ایشن (Patriotic Association) اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن
(Mohamedan Defence Association) قائم کی گئیں جو دونوں مسٹر
بیک کی اور مسٹر (جو بعد میں سر بنا دیے گئے تھے) تھیوڈور مارلیسن کی زیر ہدایت کام کرتی تھیں
کہ جو علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل کے دس سال میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم
کر دیا، اور یہ ظاہر کیا کہ اس غرض سے انھوں نے ایسا کیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک ایسا صوبہ بنا
بن جائے، کہ جس میں ان کی اکثریت ہو۔ اس پر ایک پُر زور برہمی شروع ہوگئی اور جیسی کہ توقع
تھی بنگال کے ہندو مسلمانوں کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی اگرچہ بہ کثرت ایسے صاحب اثر

مسلمان تھے کہ جو اس تقسیم کے خلاف تھے۔ لارڈ کرزن کے جانے کے بعد لارڈ منٹو وائسرائے ہو کر آئے اور انھوں نے وزیر ہند لارڈ مارلے کی مدد سے اصلاحات کی ایک تجویز تیار کی۔
اصلاحات کی تجویز کی توقع اور انتظار میں مسلمانوں کا ایک وفد مسٹر آرچ بولڈ کے مشورے سے بنایا گیا کہ جو اس زمانے میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے اور وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے جن کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے وفد کے ایڈریس کے جواب میں جو کہ ہز ہائی نس آغا خاں کی سرکردگی میں گیا تھا وائسرائے نے مسلمانوں کے مخصوص حقوق کو تسلیم کیا، اور مجلس مقننہ میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ سے انکی نمائندگی منظور کر لی۔ انگریزوں کے حلقے میں ہندوستان اور انگلستان دونوں مقامات پر وائسرائے کی اس خدمت کو بہت ہی استحسان کی نظر سے دیکھا گیا تھا، کیونکہ دوسرے لفظوں میں یہ ایسی کارروائی تھی کہ جس کی بدولت مسلمانوں کو بغاوت پسندوں کے ساتھ شامل ہو جانے سے روک لیا گیا تھا۔ اس طریقے پر وہ بیج بویا گیا تھا کہ جو اب ایک تناور درخت کی صورت میں کھڑا ہے اور جس کی شاخیں چاروں طرف کو خوب پھیل گئی ہیں، اور جس کا اثر ہندوستان کی تباہی کی صورت میں اور انگریزوں کی دائمی نفع اندوزی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ جس نے ہندوستان کی آزادی کا راستہ روک رکھا ہے۔
کانگریس نے صرف یہی نہیں کیا، کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا طریقہ بادل ناخواستہ منظور کر لیا ہو بلکہ ان صوبوں میں کہ جہاں ان کی اقلیت تھی انکی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ نمائندگی بھی دیدی۔ لکھنؤ کا معاہدہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان دسمبر ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا، اور حکومت برطانیہ کے سامنے ایک متحدہ مطالبہ رکھا گیا تھا جو دو حصوں پر مشتمل تھا، ایک حصہ میں جداگانہ انتخابات اور مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی سے بحث کی گئی تھی اور دوسرے حصہ میں نرم قسم کے سیاسی مطالبات تھے کہ ملک کی حکومت میں ملک کے لوگوں کو کچھ حصہ ملے۔ حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ اس سے متفق ہے کہ ہندوستان کے باشندے آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے حکومت خود اختیاری حاصل کریں۔ مسٹر مانٹیگو

وزیر ہند اور چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے نام سے جو اصلاحات منسوب ہیں ان پر عملدرآمد کی صورت میں مسلم لیگ کے مطالبہ کا وہ حصہ جس کا تعلق جداگانہ انتخابات سے تھا تمام و کمال منظور کر لیا گیا تھا، لیکن اس سیاسی حصے سے چشم پوشی اختیار کرکے اسے اس چیز سے بدل دیا جس کا نام صوبوں کی دو عملی ہے۔

یورپ اور ہندوستان میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہے جنھوں نے ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں بہت کچھ بیداری پیدا کردی۔ پنجاب کے المناک حادثے، اور خلافت کے متعلق بدعنوانیوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر فرقوں کو اس بات پر ابھار دیا کہ متحد ہو کر اٹھیں اور کانگریس، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور دوسری انجمنوں نے ایک متحدہ اور مشترکہ پروگرام کے ماتحت کام کرنا شروع کردیا، اور لارڈ لائیڈ کے قول کے مطابق کامیابی کے بالکل کنارے ہی پر پہنچ گئیں۔ وائسرائے "سخت حیران و پریشان رہ گیا"، جبکہ بہت سے ہندو اور مسلمان لیڈر جیلوں میں بھر دئیے گئے، اور سول نافرمانی کی تحریک اس سبب سے واپس لے لی گئی کہ عوام نے پولیس کے مقابلے میں تشدد اختیار کر لیا تھا، تو اس کے بعد ہندو مسلم فسادات رونما ہوتے اور کئی سال تک ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا بنے رہے۔ برادرانہ اتحاد عمل کی جگہ برادر کشی عام ہوگئی اور اس قسم کے جھگڑے اور فساد روزمرہ کی بات ہوگئے۔ غیر متشدد عدم تعاون کا پروگرام جس پر کہ کانگریس نے اور مسلم جماعتوں نے متحد ہو کر عمل شروع کیا تھا کمزور پڑ گیا اور ختم ہوگیا۔

گوہاٹی کانگریس کے بعد کوششیں ہوئیں کہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جائے جو اب ہندو مسلم مسئلہ بن گیا تھا۔ ۱۹۲۷ء کے شروع میں ہندو مسلمان لیڈروں کے مابین تبادلۂ خیال عمل میں آیا اور بعض مسلمان لیڈروں نے "مسلم تجاویز" کے نام سے تجاویز مرتب کیں۔ ان تجاویز میں چار چیزیں تھیں۔ سمجھدار ہندوستانیوں نے جداگانہ انتخابات کی مضرتیں محسوس کر لی تھیں اور مسلم تجاویز میں اس طریقہ انتخاب کو ترک کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا تھا بشرطیکہ (۱) سندھ

کو الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ (۲) دوسرے صوبوں کی طرح شمال مغربی سرحد کے صوبے اور بلوچستان میں بھی اصلاحات رائج کی جائیں۔ (۳) پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے رکھی جائے۔ (۴) مرکزی مجلس مقننہ میں ان کی نمائندگی کل نمائندوں کی تعداد کے ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

مزید غور و فکر اور باہمی مشاورت نے کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کو تقریباً ایک حاصل شدہ سی چیز بنا دیا تھا جبکہ سنہ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کا مدراس کا اجلاس ہوا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جو اصلاحات نافذ ہوئی تھیں کانگریس نے اور مسلم انجمنوں نے ان کا بائیکاٹ کیا تھا اور ان سے ملک میں کوئی بھی مطمئن نہ ہوا تھا۔ لیکن اعتدال پسندوں نے انھیں قبول کر کے ان کے مطابق عمل شروع کر دیا تھا۔ بار بار ان اصلاحات پر نظر ثانی کے مطالبات کئے جا رہے تھے۔ جنھیں ہر مرتبہ حکومت برطانیہ مسترد کرتی رہی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۷ء کے ختم کے قریب اس نے ایک آئینی کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا کہ جو ان اصلاحات کی عمل پذیری کے متعلق رپورٹ کرے۔ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شریک نہ کیا گیا اور قدرتی طور پر اس سے بیزاری پیدا ہوئی جس میں کانگریسی، مسلم لیگ، اعتدال پسند وغیرہ سب شریک تھے۔ کانگریس نے اور اعتدال پسندوں نے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا مسلم لیگ کے اندر بائیکاٹ کے مسئلہ پر اور جداگانہ انتخابات چھوڑنے کے مسئلے پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ مدراس کی کانگریس کے ایک ریزولیوشن کی تعمیل میں ایک کمیٹی نے دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لیے اصلاحات کی ایک تجویز مرتب کی۔ اور اس کمیٹی کی رپورٹ جس کا نام نہرو کمیٹی کی رپورٹ تھا کلکتہ میں آل انڈیا کنونشن کے سامنے پیش کی گئی جس میں تمام جماعتیں شریک تھیں۔ ان تجاویز کے متعلق بعض ترمیمیں لیگ کی جانب سے پیش ہوئیں جن میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمان نمائندوں کی تعداد کل تعداد کے ایک تہائی سے کم نہ ہونی چاہیئے، اور یہ کہ اگر بالغوں کو حق رائے دہی نہ دیا جائے تو اس صورت میں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں مجالس مقننہ میں ان کی آبادی کے تناسب سے ہونی چاہئیں، اور اختیارات

مابقی تمام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ ان کے منظور نہ ہونے پر لیگ علیحدہ ہوگئی۔
اب مسلم آل پارٹیز کانفرنس وجود میں آئی اور کچھ مدت گذرنے پر لیگ کے دونوں بازو اس کے اندر
مدغم ہوگئے اور مسٹر جناح کے چودہ نکات مسلمانوں کا مطالبہ بن گئے۔
مسلم مطالبات میں دو خاص نکات یہ تھے کہ ہندوستان کا دستور اساسی وفاقی طرز کا بنایا جائے
اور مجالس مقننہ میں اقلیتوں کی مناسب اور متوثر نمایندگی ہو بغیر اس کے کہ صوبے میں جس فرقے
کو اکثریت حاصل ہے اس کی اکثریت گھٹ کر اقلیت ہو جائے یا برابر ہو جائے۔ پہلی گول میز
کانفرنس نے وفاق کو منظور کرلیا۔ گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کی کیٹی چونکہ اتفاق رائے حاصل نہ
کر سکی تھی اس لیے مسٹر میکڈانلڈ نے کمیونل اوارڈ بخش دیا جس میں کہ انھوں نے مسٹر جناح کے چودہ
نکات میں سے بیشتر منظور کر لیے، اور مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نمایندگی کا مسئلہ آیندہ کبھی فیصل
ہونے کے لیے باقی رکھا گیا اور سندھ کو ایک الگ صوبہ بنانا اس شرط کے ساتھ مشروط رہا کہ وہ مالی
لحاظ سے اپنا خرچ پورا کرنے کے قابل ہو جائے ۔ اس اوارڈ میں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بے انصافی
کی گئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کے لیے وہ پاسنگ کی نشستیں صوبے کی مجلس مقننہ میں قائم رکھیں
جو انھیں اپنی اقلیت کے صوبوں میں حاصل تھیں۔ ہندوؤں کو اس نے بنگال میں کہ جہاں ان کی
اقلیت ہے پاسنگ کی نشستیں دینے کی بجائے کل نشستوں کی صرف ۳۲ فی صدی دیکر ٹال دیا۔
حالانکہ ان کی آبادی صوبے کے اندر ۴۴٫۸ فی صدی ہے، اور یہ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ یوروپینوں
کو اتنا بڑا پاسنگ یعنی کل نشستوں کا دس فی صدی دیا جا سکے حالانکہ ان کی آبادی کا تناسب صرف
۱/۲ فی صدی ہے۔ یوروپینوں کو دینے کے لیے اس نے مسلمانوں کی نشستیں بھی چھینی ہیں لیکن
ہندوؤں کی نشستوں میں مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ تخفیف عمل میں آئی ہے۔ پنجاب میں بھی بجائے
اس کے کہ ہندوؤں کو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کوئی پاسنگ ملتا۔ الٹی انہی کے حصہ سے کاٹ
کر سکھوں کو نشستیں دی گئیں۔ سکھوں کو پاسنگ کے طور پر کوئی نشست نہ ملی جیسی کہ دوسرے صوبوں
میں مسلمانوں کو ملی ہوئی تھیں۔ اوارڈ کی مخالفت ہندوؤں اور سکھوں کی جانب سے قدرتی اور لازمی چیز تھی

لیکن اس مخالفت کے باوجود وہ ۱۹۳۵ء کے قانون میں شامل کر لیا گیا۔ الٰہ آباد کی یونٹی کانفرنس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس اوارڈ کا نعم البدل تجویز کرے لیکن برطانوی حکومت نے اس کوشش میں رخنہ ڈال دیا، اور جو کچھ سمجھوتا ہو چکا تھا وہ کالعدم ہو گیا۔

۱۹۳۵ء کا قانون پاس ہونے کے بعد مسلم لیگ نے ایک قلابازی کھائی اور اس وفاقی تجویز کی سخت مخالف بن گئی کہ جس کا اس نے مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے ساتھ مل کر اس قدر زور کے ساتھ خود مطالبہ کیا تھا۔ اور جس مطالبے کو تسلیم کر کے حکومت نے ۱۹۳۵ء کے قانون میں شامل کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون کے نفاذ کے بعد جو انتخابات عمل میں آئے ان میں لیگ چار صوبوں کے اندر تو ایک نشست پر بھی قبضہ نہ کر سکی، اور ان صوبوں میں بھی جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کا قبضہ بیشتر مسلم نشستوں پر نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ وہ کسی صوبے کے اندر بھی دوسری جماعتوں سے ملے ہوئے اپنی وزارت نہ بنا سکی۔ اور کانگریس اس کے ساتھ دوسرے میں اس لیے مشترک وزارت نہ بنا سکی کہ ان میں سے بعض میں تو اس کا ایک بھی نمائندہ نہ پہنچا تھا، اور سوائے ایک صوبے کے کہیں ایل بھی نہ تھا کہ اسے صرف مسلم نشستوں ہی کی اکثریت حاصل ہو۔ یہ چیز تھی جس نے کانگریس کے خلاف لیگ کے دل میں غصہ بھر دیا، اور وہ اس کی سخت دشمن ہو گئی۔ ابھی کانگریسی وزارتوں نے قلمدان ہی سنبھالا تھا کہ لیگ نے مسلمانوں پر کانگریسی مظالم کی ایک فہرست پیش کر دی۔ یہ چیز قابلِ لحاظ ہے کہ کسی ایک صوبے کے گورنر نے بھی جس پر کہ اقلیتوں کے تحفظ کی ذمہ داری رکھی گئی تھی کبھی ایسے ایک ظلم کی طرف بھی اشارہ نہ کیا کہ جو کانگریس کی طرف سے مسلمانوں پر کیا گیا ہو حالانکہ گورنروں کو ایسا کرنے کی خود کانگریسی وزیروں نے دعوت دی تھی بلکہ اس کی بجائے انھوں نے کانگریسی انتظامات کی حقیقتاً تعریف کی اس زمانے میں بھی کہ جب کانگریسی وزیر عہدوں پر تھے اور اس وقت بھی کہ جب وہ استعفے دے چکے تھے۔ کانگریس نے جب یہ کوشش کی کہ ہندوستان کے چیف جسٹس سے ان الزامات کی تحقیقات کرا لی جائے تو اسے مسٹر جناح نے منظور نہ کیا۔ لیگ نے اپنا مطالبہ پیش کر کے کہ کانگریس پہلے اس بات کو تسلیم کرے کہ صرف لیگ ہی کو مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا حق حاصل ہے

جس سے نہ صرف ان مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی تھی کہ جو کانگریس میں شامل تھے بلکہ ان کی بھی کہ جو لیگ اور کانگریس کے علاوہ دوسری جماعتوں میں تھے، اور یہ بھی تسلیم کرے کہ وہ صرف ہندوؤں کی نمایندہ ہے کانگریس کی اس کوشش کو بھی اُدھر بیچ میں ہی ختم کر دیا کہ اگر ممکن ہو تو لیگ اور کانگریس میں جو اختلافی مسائل ہیں ان پر تبادلۂ خیال کر کے انھیں طے کر لیا جائے دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی کانگریسی وزارتوں نے استعفے دیدیا، اور مسلم لیگ نے اس دن "یوم نجات" منایا تھا کہ جس روز کانگریس نے وزارتیں چھوڑیں۔ حکومت برطانیہ نے کانگریس کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ اپنے جنگ کے مقاصد کا اعلان کر دے جہاں تک کہ ہندوستان پر اثر انداز ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ بعد اختتام جنگ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کا وعدہ کرے اور جنگ کے دوران میں قومی حکومت قائم کر دے۔ حکومت نے ساتھ ہی ساتھ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون کے اس حصّے کو بھی التوا میں ڈال دیا جس کا تعلق وفاق ہند سے تھا کیونکہ لیگ نے اس کا مطالبہ کیا تھا اور یہ اعلان کیا کہ ایسی کوئی آئینی تجاویز زیر عمل نہیں آسکتیں جن کو ہندوستان کی قومی زندگی کے اہم عناصر کی پسندیدگی اور قبولیت نہ حاصل ہو جیسے کہ دیسی فرماں روا اور مسلمان فرقہ، اور اچھوت ذاتیں وغیرہ ہیں۔ لیگ نے اپنے اس مطالبے کی منظوری پر بھی قناعت نہ کی اور اپنے مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس کر دیا اور پھر مدراس کے سالانہ اجلاس میں اسے اپنے معتقدات میں شامل کر لیا۔

اس سے پہلے پہلے مسلم لیگ بھی دوسری تمام مسلمان انجمنوں کی طرح مسلمانوں کو ملک کا ایک اقلیت کا فرقہ خیال کرتی رہتی کہ جس کے حقوق و مفاد کے تحفظ کی ضرورت تھی۔ اس کے تحفظ کی خاطر بہت سی مختلف تجاویز کہ جو جداگانہ انتخابات سے شروع ہوئیں، اور پھر نمایندگی میں پاسنگ کا ان پر اضافہ ہوا، اور بالآخر چودہ نکات پر ختم ہوئیں، کی جا چکی تھیں، اور برطانوی حکومت انھیں مختلف اوقات میں منظور کرتی رہی تھی۔ ان تجاویز میں سے ایک بہت ہی اہم تجویز یہ بھی تھی کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کی حکومت قائم کی جائے اور اسے بھی برطانوی حکومت نے

تسلیم کرلیا تھا۔ ان تمام تحفظات کی تدبیروں سے بھی لیگ مطمئن نہ ہوئی اور اب اس نے خود مختار مسلم ریاستیں شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں بنانے کا فیصلہ کرلیا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس گفت و شنید کے دوران میں کہ جو لیگ اور حکومت برطانیہ کے مابین جنگِ عظیم کے زمانے میں ہوتی رہی۔ لیگ نے یہ مطالبات پیش کئے

(۱) پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے اور اس درمیانی زمانے میں نہ تو اس قسم کی کوئی بات کہی جائے اور نہ کوئی کام ایسا کیا جائے جس سے آئینی مسئلے کے آخری مرتبہ طے کئے جانے کے موقع پر پاکستان کے خلاف کوئی اثر پڑے۔ (۲) وقفے کے زمانے میں وائسرائے کی کونسل میں، جو توسیع عمل میں آئے اس میں اگر کانگریس کے نمایندے شریک کئے جائیں تو ہندو اور مسلمان ممبروں کی تعداد برابر برابر ہو لیکن اگر کانگریس شرکت نہ کرے تو مسلمان نمایندوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو (۳) مسلمان نمایندے سب کے سب مسلم لیگ کے نامزد کئے ہوئے ہوں اور انکے علاوہ اور کوئی نہو۔ مسلم لیگ نے کچھ ایسی حیثیت اختیار کرنی چاہی تھی کہ گویا وہ دوسری اقلیتوں کی طرف سے گفتگو کرنے والی اور ان کی حفاظت کرنے والی ہے تاکہ ہندو اور کانگریس ان پر ظلم نہ کرسکیں۔ برطانوی حکومت نے پہلا مطالبہ تو اس صورت میں قریب قریب تسلیم کرلیا کہ صوبوں کو یہ حق دیدیا کہ اگر وہ چاہیں تو اتحادِ ہند میں نہ شریک ہوں۔ دوسرا مطالبہ اس نے الفاظ میں تو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن عملاً اسے بھی ایگزیکیوٹو کونسل کے اندر ہندو مسلمانوں کی تعداد برابر کرکے مان ہی لیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا نے بھی اس مساویانہ حیثیت کو تسلیم کرکے اپنے نمایندوں کو ایگزیکیوٹو کونسل میں جانے کی اجازت دیدی۔ برطانوی حکومت نے تیسرا مطالبہ منظور نہ کیا اور یہ حق اپنے لیے محفوظ رکھا کہ وہ جسے چاہے کونسل کے لیے منتخب کرے۔ کانگریس اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کامل کا یقین دلادیا جائے اور سب اختیارات اسی زمانے میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کردئے جائیں، بجز ایسے کاموں کے کہ جن کا حقیقتاً جنگ کو جاری رکھنے سے تعلق ہو۔ اس مطالبہ کو جب حکومت برطانیہ نے تسلیم نہ کیا تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنا ۸ اگست ۱۹۴۲ء والا ریزولیوشن بمبئی میں پاس کیا